

VERS



المعروف بہ

## تفسیر کلام غالب

یعنی مرزا اسد اللہ خاں غالب کے اردو دیوان کی تفسیر  
مصنفہ مرزا عزیز بیگ لکھنؤ مرزا سہارن پوری شاگر و حضرت زان بہار پوری اثر تلامذہ مرزا غا

جن سہی

مرزا ظفر بیگ صاحب بہار پوری

نظارۃ امی قریب دہلی طبع ہوا



(محمد احمید الدین پرنٹر)

۱۹۳۵ء

فی جلد دوم

ایک ہزار



پوچھتے ہیں وہ کہ ”غالب کون ہے“ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلا دیں کیا ہے



فکیم الدولہ دبیر الماک مرزا اسد اللہ خان غالب دہلوی

M.A.LIBRARY, A.M.U.



U16627



URDU SECTION

CHECKED-2002



مقدمہ

۸۹۱۵۲۳۱  
۱۶۶۲۷

GHALIB COLLECTION

ہمارے مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی بدایونی ہیں۔

میرے دوست مرزا محمد ظفر بیگ صاحب جن کے حسن سعی سے روح کلام غالب طبع ہو کر آج شایقین کے پیش نظر آئی مجھ سے مصر ہوئے کہ میں اس کا مقدمہ لکھوں۔ غالباً ان کا یہ اصرار اس بنا پر تھا کہ مجھے کلام غالب سے دلی لگاؤ رہا اور اس کے فائدے ہونے کا فخر حاصل ہو۔ میری گونا گوں مصروفیتیں کچھ عرصہ تک مرزا صاحب کی تعمیل ارشاد میں مانع ہیں جب تقاضا صحت سے بڑھا تو کچھ وقت اس کے لیے بھی نکالا۔ میں نے اس مقدمہ میں اختصار کو مد نظر رکھا ہے تاکہ ناظرین آسانی سے اس کے مطالعہ کے لیے وقت دے سکیں ورنہ کلام غالب کا موضوع اس قدر دلچسپ اور وسیع ہو کہ اس پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے

لے نواب مسعود جنگ مراد مسعود صاحب بی۔ اسے آکسن کی تحریک سے سب سے پہلے مشہور میں ہیں نے ا۔ دو دیوان غالب متوا وفارات اعلیٰ کے ساتھ نظامی پریس ہمایوں سے شائع کیا۔ اس کے بعد مشہور میں سلسلہ آصفیہ کی پہلی کڑی کے طور پر شرح ایڈیشن شائع ہوا۔ میری یہ شرح تعلیم یافتہ طبقہ میں اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے پانچ ایڈیشن اس وقت تک نکل چکے ہیں۔ (نظامی)

CHECKED-2002

غالب غزل کا بادشاہ تھا اس نے اس صنف سخن کی ماہیت کو خوب سمجھا ہو۔ غزل کی تعریف مختصراً یہ ہو کہ اس میں جتنے مضامین ہوں وہ داخلی ہوں اور ان کا درجہ اس قدر بلند ہو کہ ان سے انسان کی فطرت اور اس کی عظمت ہویدا ہو سکے اور اس کی وسعت اور اک کا پتہ چل سکے حقیقت ہو کہ جلد اصناف سخن میں غزل گوئی جتنی آسان ہر اتنی ہی دشوار ہو اگر غزل غزل ہو تو اس کو بوتان نظم کا ایسا قلعہ کہنا چاہیے جس کی روشیں غیر مسلسل اور نامر بوط ہونے کے باوجود بے حد دل کش اور روح افزا ہیں جس طرح آسمان پر چپکے ہوئے تاروں کی بے ترتیبی ان کی نور آفرینیوں کو جلا دے دیتی ہو اسی طرح ایک بہترین غزل کے منتشر اشعار اس کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں اور بالینہ نامر بوطی و بے نظم کی جگہ پیدا لے لے لے کا مصداق بن جاتے ہیں، ظاہر ہو کہ ہر شعر نئی تخیل کا حامل ہوتا ہو اور ہر تخیل میں نئی نئی نکتہ آفرینیاں ہوتی ہیں، کہیں فلسفہ اخلاق و تصوف کے گونا گوں رموز عالم حیرت و استعجاب طاری کر دیتے ہیں تو کہیں جذبات حسن و محبت کی بوقلمونی مسحور و بے خود بنا دیتی ہو غالب کے دیوان کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے ہکا ایک شعر اس معیار پر پورا اترے گا۔ یہ ہی وجہ ہو کہ غالب کا کلام جب پڑھیے نیا لطف آتا ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کے کلام میں اکثر اشعار شرح طلب ہیں اسی لئے اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں جن میں طرح طرح کی موثر گفیاں کی گئی ہیں۔ یہ بحث ہمارے موضوع سخن سے خارج ہو کہ یہ مثنوی و حواشی اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ثابت ہوئے

لیکن یہ امر مسلمہ ہو کہ غالب کے سوا زبان اُردو کے کسی اور شاعر کے کلام کو یہ شہرت اور اہمیت اب تک نصیب نہیں ہوئی، اور نہ صرف اس لحاظ سے بلکہ دیگر خصوصیات شعری کی بنا پر آج ہمیں یہ فخر حاصل ہو کہ ہم دنیا کی دیگر مشہور زبانوں کے نامور اور عالمگیر شہرت رکھنے والے شعرا کے مقابل غالب کو پیش کر سکتے ہیں چنانچہ گزشتہ بہت سالہ زمانہ میں اس کے کلام کی خوبیوں کو میں بلند آہنگی کے ساتھ سراہا گیا ہو اور اس کی راحت طرازی کی گئی ہو اس کے ثبوت کے لیے ان ضخیم شرحوں کے علاوہ ملک کے نامور مصوّر چٹائی کا دیدہ زیب ”مرقع“ اور دیگر قسم قسم کے خوبصورت اور نظر فریب ایڈیشن موجود ہیں۔

کلام غالب کی قدرومنزلت کی یہ عالی شان عمارت جس کا سنگ بنیاد مولانا حالی مرحوم نے اُنیسویں صدی کے آخر میں ”یادگار غالب“ لکھ کر رکھا تھا آج ”روح کلام غالب“ کی اشاعت سے پایہ تکمیل کو پہنچ رہی ہو کسی شاعر کے پیئے یہ بات کچھ کم قابل فخر نہیں کہ دیگر شعرا اس کی دو چار چیدہ غزلوں کے اشعار پر مصرعہ لگائیں اور ان کی تفسیر کر کے اپنے کلام میں شامل کر لیں لیکن اردو کیا فارسی میں بھی کوئی مشہور سامشہور شاعر غالباً ایسا نہیں ہوا جس کے پورے دیوان کی تفسیر کی گئی ہو۔ کلام غالب کی قدر افزائی میں یہ ہی ایک کمی تھی جس کو ”روح کلام غالب“ (جو غالب کی تمام غزلوں کی تفسیر ہو) بدرجہ اتم پورا کرے گی اور اس لحاظ سے غالب کے توصیفی لٹریچر میں اس کو ایک قابل قدر اور شاندار ادبی اضافہ شمار کرنا چاہیے۔

اُردو ادب میں تفسین کا رواج دراصل فارسی کا اتباع ہوا۔ دوویں فارسی غزلوں کی بھی تفسین کی جاتی ہے اگر اکثر شعر خود اپنی غزل کی بھی تفسین کرتے ہیں تفسین دو قسم کی ہوتی ہے مثلث اور مخمس مثلث میں اول مصرعہ تفسین کا ہوتا ہے اور دو مصرعہ اول غزل کے جس کی تفسین کی جائے۔ مخمس پانچ مصرعوں سے مراد ہے جس میں تین مصرعہ تفسین کے ہوتے ہیں اور دو اول غزل کے اب زیادہ تر مخمس کا رواج ہے۔ مرزا عزیز بیگ مرحوم مصنف (روح کلام غالب) نے بھی مخمس ہی کو پسند کیا ہے یعنی غالب کے قصائد وغیرہ چھوڑ کر ہر غزل کے اشعار پر تین مصرعہ اپنے چسپاں کیے ہیں۔

تفسین کی صرف یہ ہی خوبی نہیں کہ اس کے مصرعے اصل مصرعوں سے دست گریاں ہو جائیں بلکہ ان سے اصل شعر کے معانی اور مطالب کو خواہ وہ کتنے ہی دقیق اور لایحل ہوں ہیں لطافت کے ساتھ نمایاں کر دیا جائے کہ پوری تفسین ایک ہی دل و دماغ کی شاعرانہ کاوشوں کا نتیجہ معلوم ہو۔ روح کلام غالب میں یہ تمام محاسن پوری طور پر نظر آتے ہیں لیکن چونکہ اول سے آخر تک ہر غزل کی تفسین کی گئی ہے اس لیے اگر کہیں کہیں یکساں دور قلم نسبتاً نہ پایا جائے تو انشاؤ کا مجموعہ کی بنا پر نظر انداز کرنے کے قابل ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ مصنف نے پورے دیوان کی تفسین کرنے میں اپنی پوری قوت شاعری صرف کر کے کلام غالب کی شراب کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ اس کی ادنیٰ خصوصیت یہ ہے کہ مشکل ترین اشعار کے معانی

اور مطالب اس درجہ واضح ہو جاتے ہیں کہ کسی شے کو دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اس لحاظ سے روح کلام غالب کو دیوان غالب کی تمام مشروحوں پر فوقیت حاصل ہو اور اس کا اندازہ صرف اتنی بات سے ہو سکتا ہو کہ غالب کے جن مشکل اشعار کی شرح میں دیگر شاعرین نے نثریں صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے ہیں ان کو مصنف روح کلام غالب نے نظم کے صرف تین مصرعوں میں اس فصاحت و بلاغت کے ساتھ لکھ دیا ہو کہ ہم اس کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہو ع

### آفتاب آمد دلیل آفتاب

غالب اس کی توجیہ یہ کہتی ہو کہ غالب اور مرزا مرحوم دونوں فطری شاعر تھے۔ مرزا مرحوم خود بھی ایک درد مند دل رکھتے تھے اور معلوم ہوتا ہو کہ انھوں نے غالب کی سیرت اور ماحول کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مختصر یہ ہو کہ جو درد غالب کے کلام میں ہو اسی کی کسک مرزا کی طبیعت میں بھی موجود تھی۔ خواجہ حافظ نے خوب فرمایا ہو۔

بنال لبیل اگر با منت سیر یار است کہ ماد و عاشق زاریم و کار مار است  
جب ڈور و رسیدہ چوٹ کھائے ہوئے دل ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنی داستان غم سناتا ہو تو سُننے والوں پر ایک کیفیت کا عالم طاری ہوتا ہو۔ یہی حالت اس تضمین کے مطالعہ سے ناظرین کے دلوں پر پیدا ہوتی ہو۔ فرماتے ہیں:-

ذرا اس بے زبانِ دل کی کھنسن کچھ اپنی قدروانی کا گلہ سُسن  
پیسل بے بہا کہتا ہو کیا سُسن سُسن ای غارت گر جنسِ فاسن  
شکستِ قیمتِ دل کی صد کیا

اس اپنی آرزو پر مر مٹا ہوں کہ نصبِ لعینِ چشمِ سرِ ساہوں  
امہ تن شوقِ نظارہ ہوا ہوں نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں  
تغافلہائے تمکین آزا کیا

ترا خیال و تصورِ جوں کو ہو مجھو اسی سے نامِ نویسی کا شغل ہو مرغوب  
مجھے اُمیدِ کرم اور تجھ سے ہو کیا تو یہ جانتا ہوں کہ تو اور پانچ مکتوب  
گر ستم زدہ ہوں تو غمِ فرسا کا

کیا خوب شرح کی ہو

جنوں مانع ہو اُستاد کا احساں اُٹھانے سے فراغت پا چکا روزِ ازل پڑھنے پڑھانے سے  
رہا انکارِ عقلِ کل کو غیرِ لا بتانے سے فنا تعلیمِ درسِ پنجویں ہوں اُس زمانے سے  
کہ مجنوں لامِ الف لکھتا تھا دیوارِ دبستان پر

ایک مقطع کی تفسیر ملاحظہ ہو جس میں غالب نے بوڑھاپے کا رونا رویا ہو  
کہیئے مرزا کا حال کیا غالب بے طرح ضعف ہو گیا غالب

ہو یہ پیری بھی کیا بلا غالب مضمحل ہو گئے توئی غالب

وہ عناصر میں اعتدال کہاں

غالب کے ایک شعر کی جس میں توحید کا فلسفہ کوٹ کوٹ کر پھرا ہو تضمین کے تین مصرعوں میں یہی

شرح کی گئی ہو جس سے شاعر کا مافی الضمیر صاف سمجھ میں آ جاتا ہو لکھتے ہیں

ہیں موجد، خدا شرک ہو دل سے مفقود ہم معتبر ہیں نہ کہے کے نہ کہہ مجھ

رو بقبلہ میں تو صرف ایک جہت ہو مقصود ہو پے سرحد اور اک سے اپنا مسجود

قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

غالب نے ایک شعر میں معشوق کے وصال کا ذکر کر کے عاشق کی خوش نصیبی انوکھے طرز سے

ثابت کی ہو جس میں زلفوں کی پریشانی کو شب وصال میں لطف کا سبب ظاہر کیا ہو۔

اور اسی طرح رات کی اور زلفوں کی سیاہی کی مناسبت مزہ دے گئی ہو تضمین بھکارنے میں

چار چاند لگا دیئے ہیں کہتے ہیں۔

بزم میں جو ہمیشہ تیرا اور ایتیں اس کی ہیں صبح نظارہ میں کرویتا ہو ایتیں اس کی ہیں

اس سے بھی وہ خوش نصیب ہے ایتیں اس کی ہیں نیند اس کی ہو دماغ اس کا ہو ایتیں اس کی ہیں

تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشان ہو گئیں

ایک شرح طالب شعر کی منظوم شرح ذیل کی تضمین میں ملاحظہ ہو۔

ہنسی یاروں نے کیا کی ایک نصیحت مجھ کو فرمائی  
 نہ اب ہوشِ حُشّت ہو نہ فطرتِ ناشکیبائی  
 سکوں سا ہو گیا دل کو گیا سامانِ رسوائی  
 نکو ہش مانعِ بے ربطی شورِ جنوں آئی  
 ہوا ہو خندہ اجاب بخیہ حبیب و دامن ہیں

جب غالب دہلی سے لکھنؤ کے سفر کے لیے اس امید پر نکلے کہ نواب اودھ کی بارگاہ سے  
 کچھ امداد لیکر نجف اشرف اور حرمِ محترم کی زیارت سے بہرہ اندوز ہوں گے تو راستہ میں ایک  
 غزل لکھ کر ان جذبات کا اظہار کیا اس غزل کے دو شعروں کی تفسیر قابلِ ملاحظہ ہو کس خوبی سے  
 واقعات کی تصویر کھینچی ہو

عقل حیران ہو کس وجہ سے چھوڑی دہلی  
 کچھ تو ہو جس لیے طو کی ہو مسافت اتنی  
 یک بیک چھوڑی کیوں لفتِ راحت گھر کی  
 لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلت یعنی

ہوں بیرونِ تاشا سو وہ کم ہو ہم کو

جب چلے گھر سے تو تخیل میں ہاں دہلی  
 بیٹھ رہنا ہیں اور ترک سفر ہو اک قہر  
 قصہ ہو دور کا مانعِ جو نہ ہو گردشِ دہر  
 مقطع سلسلہ شوق نہیں ہو یہ شہر

عزمِ سیرِ نجف و طوافِ حرم ہو ہم کو

غالب نے اکثر بقول پر اپنے دقیق مطالب کی طرف اشارہ کر کے یہ ظاہر کیا ہو کہ وہ کچھ کہتے  
 ہیں عوام اس کو نہیں سمجھتے اور یہ ان کی فہم کا قصور ہو۔ اس مطلب کے ایک شعر کی تفسیر ملاحظہ ہو



کیا خوب کہا ہو

میری بخموری پیمبت قیل و قال ہو      مطلب کو میرے پائے کوئی کیا مجال ہو  
کہتا ہوں سب کچھ اور زبان میری لالی ہو      گر خامشی سے فائدہ اٹھائے حال ہو  
خوشش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہو

غالب کے دیوان میں جہاں مشکل اشعار ہیں وہاں ایسے شعر بھی ہیں جو ہل متع کا حکم  
رکھتے ہیں اسی غزل کے ایک شعر کی تفسیر نمونہ کے طور پر دلا خطہ ہو جس میں تفسیر کی  
زبان بھی مرزا غالب کی زبان سے مل گئی ہو۔

نالہ و آہ میں دھرا کیا ہو      حاصلِ مگر یہ و بُھاکپ ہو  
اس تڑپنے سے مُدھا کیا ہو      دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہو

آخر اس ورد کی واکیا ہو

سطور بالا میں تقریباً غالب کے ہر قسم کے اشعار کی تفسیر کے نمونے پیش کر دیئے ہیں تاکہ  
ناظرین ”روح کلام غالب“ کی خوبیوں کا صحیح طور پر اندازہ کر سکیں اور ان کو معلوم ہو سکے کہ  
مرزا عزیز بیگ مرحوم نے غزل کے تنگ میدان کو خمس بشار و سعادت و شہساز میں کہاں تک  
کا میابی حاصل کی ہو اور غالب کی اس آرزو کو کہ ان کے بیان کی وسعت کے لئے تنگنائے  
غزل سے زیادہ وسیع میدان درکار ہو کس حد تک پورا کیا ہو غالب کے اسی مضمون کے شعر

کی تضمین میں نہایت موزوں اسلوب اختیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

سخن میں چاہیے کوئی جدید طرزِ عمل کہ طبع تیز کا کچھ حوصلہ تو جامے نکل  
نہ کیوں ہو جو تغزل ہیں ہر کے جی نکل بقدرِ شوق نہیں طرفِ تنگنائے غزل

کچھ اور چاہیے وسعت سے بیاں کیلئے

مرزا مرحوم کی تضمین کے مطلق اس قدر لکھنے کے بعد ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ دوسرے شاعروں نے جو غالب کی بعض غزلوں کے خمسے کیے ہیں ان کے مقابلہ میں مرزا مرحوم کی تضمین کا کیا درجہ ہے۔ مثال کے طور پر میر ہمدانی مجروح دہلوی کے خمسون کو جو غالب کے ارشادِ علامہ میں سے تھے مرزا مرحوم کے خمسون کے بالمقابل درج کرتے ہیں۔ مبصر اور ناقد ان کو پتہ لگا کر خود رائے قائم کریں۔

### مرزا

یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا  
کم مرض ہی مگر ذرا نہ ہوا

مجھ پر احساں طبیب کا نہ ہوا

درومنت کش دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

### مجروح

کامِ نخواست سے کچھ روا نہ ہوا

درِ حاجت کسی پہ روا نہ ہوا

کیا حقیقت کہوں کہ کیا نہ ہوا

درومنت کش دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

## مجرع

وے خدا رحم ان حبیبوں کو  
 کہ جلا میں نہ بد نصیبوں کو  
 رنج دیتے ہو ہم غریبوں کو  
 جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو  
 اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا  
 کیوں عبث جا کے اپنا سر نکالیں  
 نافع احسان کیوں کسی کا اٹھائیں  
 اُس سے جب آرزوئے دل ہی نہیں  
 ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں  
 وہ ہی جب خیر آزمانہ ہوا  
 رکھتا لذت جو ہر دہان حبیب  
 شب مصری کو وہ کہاں ہی نصیب  
 کیا کہوں بات ہو عجیب غریب  
 کتنے شیریں ہیں تیرے لبے رقیب

## مرزا

ہو گئے رسوا تمہیں کہا مانو  
 بات بڑھ جائے گی بہت یوں تو  
 چل کے سن لو الگ جو سُننے ہو  
 جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو  
 اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا  
 اور تجھ سا حسین کہاں سے لائیں  
 حسرتِ دل کی داد کس سے پائیں  
 کس کے ہاتھوں سے زخمِ دل پرکھائیں  
 ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں  
 تو ہی جب خیر آزمانہ ہوا  
 سخن تلخ کب ہر ان کے قریب  
 ان سے باتیں سُننے کیس کے نصیب  
 ہر عداوت ہی کچھ سخن میں عجیب  
 کتنے شیریں ہیں تیرے لبے قریب

## مُجروح

گالیاں کھا کے بے مزانہ ہوا  
 فکر کی قسمت آزمائے کی  
 یعنی جس شوخ کو بلائے کی  
 یہ سنو بات دل جلانے کی  
 ہو خیر گرم اُن کے آنے کی  
 آج ہی گھر میں بوزیا نہ ہوا  
 جب سے عقل و تہمت آئی تھی  
 تیرے ہی وہ پہچانی تھی  
 وہ دم عاجزی سنائی تھی  
 کیا وہ نمرود کی خدائی تھی  
 بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا  
 اُس کی بخشش نے کی دوانہ کمی  
 کچھ تلافی پہ ہم سے پہنچ سکی  
 کیا بڑی بات ہم نے کی اسی

## مرزا

گالیاں کھا کے بے مزانہ ہوا  
 جب ہمیں دُھن تھی اُن کے لانے کی  
 استطاعت تھی گھر سجانے کی  
 اب جو بدلی ہو انہ مانے کی  
 ہو خیر گرم اُن کے آنے کی  
 آج ہی گھر میں بوزیا نہ ہوا  
 جان طاعت ہی میں کھپائی تھی  
 کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی  
 سر تھا سجدہ تھا جہ سائی تھی  
 کیا وہ نمرود کی خدائی تھی  
 بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا  
 قابلِ فخر کیا ہو بات اپنی  
 عین احساں ہو اس کی خوشنویسی  
 ہم نے اس پر نثار کیا شو کی

## مجرع

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اُن کے جب بحرِ کار بہتے ہیں

ہم تو مجروحِ غرق رہتے ہیں

آپ کیوں طعنِ طعنے بہتے ہیں

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالبِ غزل سمرانہ ہوا

## ایضاً

لا تقنطو نوید ہو ام الکتاب میں

زاہد گناہِ خلق ہیں ہاں کس حساب میں

ہو عرض یہ جنابِ تقدسِ آب میں

کل کے لیے کہ آج نہ خستِ شرب میں

یہ سو رن ہو ساقی کوثر کے باب میں

## مرزا

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مثلِ مرزاِ مصرودہ رہتے ہیں

جی میں گھٹ گھٹ کے پھوٹا بہتے ہیں

سب غمِ انتظار رہتے ہیں

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالبِ غزل سمرانہ ہوا

## ایضاً

جامِ سب کو رکھ نہ بچا کر حساب میں

شال نہ کر ہجو کی کوشکے حساب میں

وہاں کچھ کمی نہیں کہ ہو تو منتظر میں

کل کے لیے کہ آج نہ خستِ شرب میں

یہ سو رن ہو ساقی کوثر کے باب میں

## مجرع

گو آرزو سے دید میں ہیں بے قرار ہوں  
 ہرگز وہ یاں نہ آئیں گے میں کو طلب کے د  
 پر کچھ تو شغل چاہیے بیکار کیوں ہوں  
 قاصد کے آنے لے خط اکا اور لکھ لکھوں  
 میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں  
 شاوی و غم کو عشق میں اکا ربطات ہو  
 اس میں کبھی حیات ہو گا ہے مات ہو  
 ہو طرہ حال اور نئی واردات ہو  
 میں اور خط وصل خدا ساز بات ہو  
 جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں  
 حکم خدا میں گولب چون و چرا ہو بند  
 مالک ہو وہ حقیر کرے خواہ سر بلند  
 پرول تو اس خیال سے رہتا ہو فکیر نہ  
 ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی ہند

## مرزا

لکھ تو دیا انھیں کہ مرا حال ہیوں  
 ہوں سے آرزو سے تسلی نہ را جنوں  
 آگاہ اُن کی عادت و خصلت سے خوب  
 قاصد کے آنے لے خط اکا اور لکھ رکھوں  
 میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں  
 وہ آج میرے گھر جو چلے آئے دست ہو  
 شکر خدا کہ ہو گئے قفقے تمام طو  
 جاتے ہوئے وصال کا وعدہ بھی گئے  
 میں اور خط وصل خدا ساز بات ہو  
 جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں  
 یا تو ملائکہ سے بھی تھا مرتبہ بلند  
 ہم سا نہیں ہو یا کوئی اخبار مستمند  
 پہونچا رہا ہو ہر تنفس میں گزند  
 ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی ہند

لے ارتباط کی طاقت سے بدل کر اس کو محلات و واردات اور بات کا ہم قافیہ کرنا ضروری معلمی ہو معلوم نہیں یہ غلطی کہاں سے شروع ہوئی؟

## مجرع

گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں  
 ہمدرد قہر نے بت خانہ خراب کے  
 اوسان کھو دیئے دل بے صبر و تاب کے  
 اتنا رہم سمجھ گئے ان کے عتاب کے  
 ہر نیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے  
 ہر اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں  
 اہل نظر سمجھتے ہیں عالم کا کیا وجود  
 ہر اُس کی ذات پاک سے ہر چیز کی بُد  
 ہر ایک کو نہیں خبر نیستی و بود  
 ہو غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہو  
 ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں  
 میں لاکھ جاں سے اپنی فدا اُس پہ ہو گ  
 میری اوتیوں سے خوشی ہو وہ فتنہ گر  
 ہر یار میرا دشمن آرام کس قدر

## مرزا

گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں  
 بے پردہ کچھ اثر ہیں نمایاں عتاب کے  
 لیکن ہیں چپ خیال سے شرم حجاب کے  
 اتنا ربات بات میں ہیں پیچ و تاب کے  
 ہر تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے  
 ہر اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں  
 اشیا کی ہر تصور اشیا سے سب نمود  
 دیکھا جو غور سے تو خیالی ہیں سب جود  
 ہستی کے واہے کی بدولت ہر ہمت بُد  
 ہو غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہو  
 ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں  
 کیا کہیے ہوتی تھی شبِ غم کس طرح بسر  
 اختر شکاریوں ہی میں ہو جاتی تھی سحر  
 تو ستم یہ اور نیا چشم شوق پر

## مُجَرَّح

"تا پھر نہ انتظار میں نیند اُسے عمر بھر  
 آنے کا عہد کر گئے اُسے جو خواب میں  
 رکھتے ہیں گو نہاں وہ جاں نثارہ سوز  
 بھامان زیب ہوتا فراہم گدہ روز  
 نکل سکھ سے تا درست ہے روئے لفروز  
 آرایشِ جال سے فایغ نہیں ہنوز  
 پیش نظر ہی آئینہ دایم نقاب میں  
 تاہونہ اس کو میرے اٹھانے میں تہم  
 محفل میں اس کی ہم نے رکھی سے کام  
 یاں تو صفتِ نعال میں کھاسد مقام  
 مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا دو بھام  
 ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں  
 کہ شوخیاں جتا کے ملا ناٹکا کا  
 کہ شرمناک ہو کے پھر ناٹکا کا

## مرزا

"تا پھر نہ انتظار میں نیند اُسے عمر بھر  
 آنے کا عہد کر گئے اُسے جو خواب میں  
 گو خود نما نہیں ہو وہ پروکاشیں ہنوز  
 نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز  
 جو محو ناز خود بھی وہ نا آفریں ہنوز  
 آرایشِ جال سے فایغ نہیں ہنوز  
 پیش نظر ہی آئینہ دایم نقاب میں  
 رہتے تھے ہم بہالہ جہاں اُن سے خاص عام  
 اٹھتا تھا ایسی بزم سے میں ورتشہ کام  
 پیشینے میں آج مجھ کو نہ ہو کس طرح کلام  
 مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دو بھام  
 ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں  
 آتا ہی یوں تو اُن کو لڑنا ٹکا کا  
 نظریں بچا کے سب کی ملا ناٹکا کا



## مجرع

انما زولہری سے جھکانا ننگا ہ کا  
 لاکھوں لگاؤ ایک پُجرا ننگا ہ کا  
 لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں  
 جب تک کہ پھیر خاں مقدہ ہی کا نہ جائے  
 بنتا نہیں ہی کام کوئی لاکھ گر بنا سے  
 اس بات کا یقین کنی کس طرح سے لائے  
 وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے  
 جس سحر سے سفینہ رواں ہوا لہر میں  
 مقدور تک سی ہر ناں دست پاہلا سے  
 پر کیا کریں وہی جب تک کی زیر نہ آئے  
 یہ حال ہو تو خاک محبت کا لطف آئے  
 وہ نالہ دل میں خس کجا رہ جگہ نہ پائے  
 جس نالہ سے تنگاف پڑے آفتاب میں  
 ملک عدم کے دیکھیے عازم پہ کیا بنے

## مرزا

آفت ہی آف مگر نہ اٹھانا ننگا ہ کا  
 لاکھوں لگاؤ ایک پُجرا ننگا ہ کا  
 لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں  
 جادو وہ چیز ہو کہ جو اس کمال میں لائے  
 مشکل مشکل امر کو آسان کر دکھائے  
 لیکن مجھے ہی تو ہوسوس ہا مائے  
 وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے  
 جس سحر سے سفینہ رواں ہوا لہر میں  
 وہ نالہ جو کہ عرش معسے کو بھی ملائے  
 وہ نالہ جو زہین کو بھی لڑے میں لائے  
 وہ نالہ اور کان تک شوح کے بجائے  
 وہ نالہ دل میں خس کجا رہ جگہ نہ پائے  
 جس نالہ سے تنگاف پڑے آفتاب میں  
 کہتے ہیں صاف صاف یہ انداز چال کے

## مجرع

اس روٹی بہت پین شیب نماز کے  
 پر جس میں بس ہی اپنا نہ ہو میں کیا کرے  
 رو میں جو خوش عمر کہاں بچھے تھے  
 فرما تھے باگ پر ہو نہ ہاے رکاب میں  
 مجروح کو اس امر سے ہو غیب آگئی  
 اب وہ نہیں جو باوہ پستی جو پہلے تھی  
 بالکل ہی ترک ہو ہو ممکن نہیں ابھی  
 غالب چٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی  
 پیتا ہوں وزیر بروشب ماہتاب میں

## مرزا

لینا نہیں عدم سے اذہم کہیں آتے  
 بے اختیار ہوں کہیں مجھ کو گرا نہ دے  
 رو میں ہو خوش عمر کہاں دیکھئے تھے  
 فرما تھے باگ پر ہو نہ پا ہو رکاب میں  
 تھے یار ہم پیالہ ہمارے سبھی کبھی  
 دیکھنا نہ ہم نے ہوش میں آ کر کبھی کبھی  
 وہ دن کہاں کہ شغل سے فرصت تھی کبھی  
 غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی  
 پیتا ہوں وزیر بروشب ماہتاب میں

نوٹ: جس مصنف کے کلام کا مطالعہ کیا جائے اس کے حالات زندگی کا جاننا بھی خالی از دہی نہیں ہوتا۔ مرزا محمد ظفر بیگ نے جو مصنف مرحوم کے عزم و ہوا ہیں مرزا کے ذاتی اور خانہ دانی صحیح حالات اور ان کا فوٹو ہم پہنچا یا ہو۔ فوٹو ناظرین نے مشروع میں ملاحظہ فرمایا ہو حالات بطور ضمیمہ آئندہ صفحات میں پڑھیں

خاکسرا نظامی بدایونی

۳۳ ربیع ۱۳۵۰

# حالات مُصَنَّف

(از مرزا ظفر بیگ صاحب بہارن پوری)

**خاندانی حالات** آپ کے جد امجد مرزا بختیار مرحوم چغتائی مقام تیمور علاؤ اللہ رُوسنی ترکستان کے قدیم باشندے تھے چھٹی پشت میں آپ کا سلسلہ نسب مرزا فرید

چغتائی سے جو حضرت امیر تیمور صاحب قرآن گورگانی کے نامور چلیں تھے ملتا ہے مرزا بختیار مرحوم اٹھارہویں صدی کے آخر میں اپنے چند خاندانی جھگڑوں سے پریشان ہو کر دہلی تشریف لائے

اس زمانہ میں دہلی میں شاہ عالم بادشاہ کی حکومت قائم تھی ملک میں ہر طرف قریب قریب امن و امان کا دور تھا اور حکومت بھی ہر طرح پران کے زیر اثر تھی مرزا بختیار مرحوم شاہ عالم

کے حضور میں پیش ہوئے شاہ عالم نے مرزا مرحوم کے خاندانی حالات کی بنا پر بہت قدر دانی فرمائی اور ان کو اپنی خدمت میں معتمد خاص کے عہدہ پر سرفراز فرمایا لیکن مرزا چونکہ فن سپاہ گری

میں کمال و سزاگاہ رکھتے تھے اس وجہ سے کچھ دنوں کے بعد مرزا مرحوم کا فوجی حکم میں کسی معزز عہدہ پر تقرر کر دیا گیا مرزا مرحوم نے اپنی حسن لیاقت سے تھوڑے ہی عرصہ میں سیلابی

کا درجہ حاصل کر لیا۔ مرزا مرحوم کی اس ترقی کے باعث ایک مرتبہ فوجی افسر کو رشک پہنچا ہو گیا اور دونوں کے باہم جھگڑا ہو گئی۔

اتفاقاً ایک رزمرا مرحوم اور مرثیہ سردار میں کچھ لفظی تکرار ہو گئی جس کی وجہ سے مرزا مرحوم کو اس قدر طیش آیا کہ فوراً تلوار نکال کر مرثیہ سردار کا کام تمام کر دیا مرثیہ سردار کے قتل ہونے سے تمام مرثیہ فوج میں ہیجان پیدا ہو گیا اور وہ سب کے سب مرزا مرحوم کے قتل کے درپہ ہو گئے شدہ شدہ یہ معاملہ شاہ عالم بادشاہ کے روبرو پیش ہوا مرثیہ فوج کے سردار نے مرزا کی شکایت کے دفتر کھول دیئے شاہ عالم بادشاہ نے مرثیوں کے غصہ کو فرو گتے کی غرض سے دفع الوقتی کے لئے مرزا مرحوم کو نظر بند کرنے کا حکم دیا اور اصل معاملہ کا فیصلہ کسی دوسرے وقت پر ملتوی فرمایا خیال کیا جاتا ہو کہ بادشاہ سلامت کی نیت یہ تھی کہ مرزا مرحوم کو کسی حیلہ سے اُن کے وطن پہنچا دیا جائے مرزا مرحوم ایام نظر بندی میں تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتے تھے اسی حالت میں تین ماہ کے بعد ایک روز علی الصبح نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ دفعتاً کلیجہ میں درد پیدا ہوا اور دو تین گھنٹہ کے بعد مرزا مرحوم نے شاہی قیدی سے نہیں بلکہ قیدیات ہی نجات پائی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ ساجدون مرزا مرحوم کی وفات پر ان کا تمام اثاثہ البیت ضبط کر لیا گیا مرزا مرحوم کی اہلیہ محترمہ اپنے دو صغیر بن بچوں کریم مرزا و رحیم مرزا کو لیکر سہارنپور تشریف لے آئیں چونکہ مرزا مرحوم کی اہلیہ نہایت تعلیم یافتہ خاتون تھیں اس لئے اہالیان سہارنپور نے اُن کی نہایت ست کی اور انھوں نے ایک زمانہ مدرسہ تاجیم کیا جس میں علاوہ قرآن پاک کی تعلیم کے دیگر خلاقی

کتاب ہائے فارسی کی بھی عمدہ تعلیم دی جاتی تھی یہ مدرسہ بہت عرصہ تک سہارنپور میں جاری رہا کچھ عرصہ کے بعد کریم مرزا اور رحیم مرزا بھی اپنی ملکتی تعلیم سے فارغ ہو کر جوان ہوئے کریم مرزا محکمہ پولیس میں اور رحیم مرزا تحصیل سہارنپور میں نائب ناظر مقرر ہوئے۔ رحیم مرزا بیس سال کی عمر میں پانچ سال ملازمت کرنے کے بعد دفعتاً بحار ضلع ہمدانہ ۱۳۵۷ء میں لاوا۔ فوت ہوئے کریم مرزا نے محکمہ پولیس میں خاطر خواہ ترقی کی اور بہت عرصہ تک ضلع سہارنپور فوجپور اور بلند شہر میں معزز عہدوں پر کام کیا ۱۳۵۷ء میں بلند شہر سے چھ ماہ کی رخصت لیکر تشریف لائے اور اسی زمانہ میں آپ کا انتقال سہارنپور میں ہو گیا آپ نے اپنی وفات کے بعد تین لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی تھی سب سے بڑے صاحبزادے مرزا محمد شفیع بیگ تھے جو عرصہ دراز تک ضلع سہارن پور کے مختلف تھاغوں میں کووال رہے ایام ملازمت میں تین جج کیے اور ۱۳۵۷ء میں تھاغہ داری کے عہدہ سے پنشن پائی چھ سال تک پنشن پانچ ۱۳۵۷ء میں انتقال فرمایا مرزا حکیم بیگ صاحب منجھلی صاحبزادے تھے آپ نے ۱۳۵۷ء میں امتحان منابرکاری پاس کیا آپ کا کام نہایت اعلیٰ بیانہ پر رہا اور بہت بڑے کامیاب مختار کار شاہد ہوئے حکام ضلع آپ کی خاص طور پر عزت کرتے تھے آپ کا انتقال ۱۳۹۱ء میں ہوا آپ نے اپنی وفات کے بعد کافی جائداد زرعی و سکنی چھوڑی جو اب تک آپ کے بیٹوں کے پاس موجود ہے۔ مرزا وزیر بیگ صاحب سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے آپ ۱۳۵۷ء میں محکمہ پولیس میں

ملازم ہوئے اور بہت تھوڑے عرصہ میں ترقی پا کر تھانہ واری کے عہدہ پر پہنچے بہت عرصہ تک ضلع سہارنپور میں مختلف مقامات پر تھانہ دار رہے آپ نہایت قوی اور جہیم تھے اب تک ضلع سہارن پور میں آپ کی طاقت کے کرشمے بیان کیے جاتے ہیں آپ نے سلسلہ عزم میں انتقال فرمایا۔

مرزا عزیز بیگ صاحب مرحوم المتخلص بہ مرزا سہانپوری مرزا وزیر بیگ کی تاریخ پیدائش صاحب مرحوم کے خلف الرشید تھے آپ ۱۲۶۵ھ میں بمقام سہارنپور پیدا ہوئے۔

تعلیم تلذ قرآن پاک وغیرہ کی تعلیم ختم ہونے پر آپ منشی مولوی حبیب الدین صاحب مرحوم المتخلص بہ سوزاں کے زمرہ تلامذہ میں داخل ہوئے منشی صاحب فن شاعری میں حضرت مرزا غالب مرحوم و معذور کے خاص شاگرد تھے ایک مدت دراز تک غالب مرحوم کی خدمت میں دہلی رہے اور غالب مرحوم کے انتقال پر سہارنپور تشریف لائے جیسا کہ سوزاں صاحب مرحوم نے ایک غزل کے مقطع میں فرمایا ہے۔

غالب کا کام تھا سو وہ سوزاں گزر گئے دہلی میں اب بناب کا کیا کام رہ گیا

مرزا عزیز بیگ صاحب کو ادا ل عمری سے ہی شعر و سخن میں خاصی بچھی تھی اُس پر قابل استاد کی توجہ ذہن کی رسائی تھوڑے ہی عرصہ میں فارسی اور اردو کی غزلیں تصنیف فرمانے لگے

منشی صاحب مرحوم اپنے ہونہار شاگرد کی تیزی طبع دیکھ کر ان کی تعلیم میں سجدہ کوشش فرماتے تھے۔ چند ہی سال میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ آپ کو فارسی زبان میں کامل دستگاہ تھی عربی میں بھی خاصی لیاقت پیدا کر لی تھی۔

**شاعری** | مرزا مرحوم ایک اعلیٰ ادیب اور شاعر تھے آپ ایک ایسے مخصوص رنگ کے مالک تھے جو اکثر ان کے ہمعصر شعرا کی ابتدائی روش سے قطعاً جداگانہ حیثیت رکھتا ہے آپ کی شاعری آپ کی اُستادانہ حیثیت کی بین دلیل ہو ضلع سہارنپور اور دیگر اضلاع میں آپ کے بہت شاگرد موجود ہیں آپ کا طریق اصلاح قابل تحسین تھا اپنے ہر شاگرد کے کلام میں ان کے مذاق اور علم کے موافق ایسی اصلاح فرماتے تھے کہ جس کا جواب شکل ہی شاعر میں چند اجاب کے اصرار سے حضرت مرزا غالب مرحوم و مغفور کے دیوان کی تفہیم لکھی شروع کی۔ ماہ اپریل ۱۹۱۲ء عیسوی میں اس اہم کام کو بحسن و بجاہ اتمام کو پہونچا نا اسی عرصہ میں آپ کو در وقت لیلج کا دورہ پڑنے لگا اور اسی مرض میں چھ ماہ بعد ماہ اکتوبر ۱۹۱۲ء کے اخیر مہینہ میں ۵۵ سال چھ ماہ کی عمر میں رحلت فرمائی تیارخ وصال۔ روح مرزا نسبت بہت بچی انسا و نا علیہ راجون۔ آپ نے اپنی وفات پر دو لڑکیاں چھوڑیں۔

**وزیریہ معاش و** | آپ نے ۱۸۷۸ء میں امتحان مختار کا ری پاس کیا مگر شروع سخن کا اس درجہ طرز معاشرت شوق تھا کہ کچھ ہی کے کاروبار کو محض ضرورتاً انجام دیا کرتے تھے اور ہفتہ میں

صرف ایک دو مرتبہ کچھ ہی تشریف لے جاتے اور جو کچھ وہاں سے یافت ہوتی اُس کو اپنے طرفیں لاتے۔ جب تک وہ روپیہ صرف نہ ہو جاتا اُس وقت تک کچھ ہی تشریف لے جاتے آپ کی قانونی قابلیت بھی قابل تعریف تھی اکثر طلباء آپ سے قانون بھی پڑھتے تھے۔

**شادی** مرزا کی شادی سنہ ۱۸۹۲ء میں آپ کے عم اکبر مرزا کی بیگم صاحبہ مرحومہ کی دختر نیک اختر سے ہوئی آپ کی اہلیہ محترمہ بھی علاوہ قرآنی تعلیم کے اردو اور فارسی میں کافی سیاق رکھتی تھیں امور خانہ داری اور حسن انتظام میں لائق تعریف تھیں اس وجہ سے شہر کے محرزہ رساء وغیرہ کی لڑکیاں بغرض حصول علم اُن کے پاس آتیں آپ کا انتقال سنہ ۱۹۰۹ء میں ہوا مرزا مرحوم اس حادثہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جلسہ شعرو سخن اور دیگر دینیوی مشاغل کو ترک کر دیا ہر چند اعزاء و اقربائے مرزا مرحوم کی توجہ عقد ثانی کی طرف دلائی مگر مرزا مرحوم نے ایک نہ سنی اور آخر دم تک اپنی اہلیہ مرحومہ کی یاد لیے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے اُس زمانہ میں ایک نہایت پُرور و غزل لکھی تھی جس کے مطلع سے ولی حزن و ملال کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

یاد ہیں وہ دن کہ ہم تھے اور نالے کے مزے یاد آتے ہیں قفس میں آشیانے کے مزے  
**مذہب** مرزا مرحوم بہ اعتبار مذہب نہایت وسیع الخیال تھے اعتقاداً مذہب حنفی کے



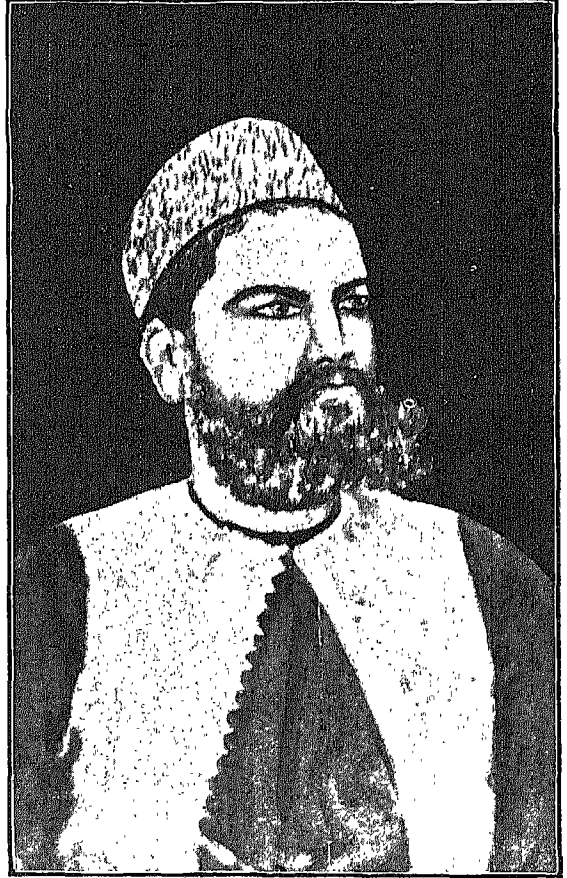
پیر و اور صوم و صلوة کے پابند تھے اگرچہ آپ کے پاس بسا اوقات مختلف مذاہب کے اشخاص کا مجمع رہتا تھا مگر آج تک کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا کہ کسی صاحب کے مذہبی معاملات پر بحث یا گفتگو مرزا مرحوم نے کی ہو یا دوسرے مذاہب پر کبھی نقیضانہ زبان طعن کھولی ہو ابتداً مرزا کو اپنے اور شوقین طبع دوستوں کے اصرار پر محض قص و سرود میں شریک ہونے سے احتراز نہ تھا مگر یہ سلسلہ سن ۱۹ء میں بالکل ترک کر دیا تھا اور سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت مولانا الحاج مولوی جلیل احمد صاحب مہاجر کی مدرسہ اول مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور سے بیعت کی چنانچہ اس واقعہ کو مرزا مرحوم نے اپنی ایک نعتیہ غزل کے مطلع میں اس طرح پر واضح کیا

شعر

بہت کچھ صحبتِ ندائیں کھویا وقتِ عہدِ مرا  
بس اب تو کچھ دلوں خدمت کرد اللہ والوں کی

**اخلاق** آپ کا اخلاق نہایت وسیع تھا ہر خاص و عام سے نہایت خندہ پیشانی اور تواضع سے پیش آتے تھے۔ آپ کی نشستگاہ میں احباب اور تلامذہ کا جلسہ رہتا تھا مگر ان کے جلسے میں کبھی کسی کی یہ مجال نہ ہوتی تھی کہ کسی کی غیبت یا بدگویی کرے۔ آپ نہایت کم سخن اور متین تھے بلا ضرورت کسی سے زیادہ گفتگو نہیں کرتے تھے۔





میرزا عزیز بیگ میرزا وفات سنہ ۱۹۲۰ء



# فہرست غزلیات تضمین شدہ

ممبر صفحہ	نمبر غزل	تعداد اشعار	مصرع اولیٰ ہر غزل	کیفیت
۱	۱	۸	نقش فریادی ہو کس کی شوخی تحریر کا	الف (۲۹)
۲	۲	۵	دل مرا سوزِ تہاں سے بے جا باہل گیا	
۳	۳	۶	عشق ہر رنگ رقیبِ سرو سا ماں نکلا	
۴	۴	۷	دھکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا	
۵	۵	۷	دہر میں نقشِ وفا و جبرِ شعلی نہ ہوا	
۶	۶	۱۲	ستائشِ گم ہوندا ہاں قدر جس باغِ رضواں کا	
۹	۷	۷	محرم نہیں ہو تو ہی نوا ہائے راز کا	
۱۱	۸	۹	برہم شاہشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا	
۱۲	۹	۱۵	شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرہ ابراب تھا	
۱۵	۱۰	۹	بس کہ دُشوار ہو ہر کام کا آساں ہونا	
۱۶	۱۱	۷	دوست غمخواری میں میری سہی فرمائیں گے کیا	
۱۹	۱۲	۱۱	یہ نہ بھتی ہمارے قسمت کہ وصالِ یار ہوتا	
۲۱	۱۳	۱۳	ہوس کو ہو نشا ط کا رہ کیا کیا	
۲۳	۱۴	۹	درِ خورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سانہ ہوا	
۲۶	۱۵	۸	پسے نذرِ کرم تحفہ ہو شرمِ نارسائی کا	

نمبر صفحہ	نمبر غزل	تلاوہ شعرا	مصحح ادلے ہر غزل	کیفیت
۲۸	۱۶	۹	گر نہ اندوہ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا درد منت کش دوانہ ہوا	
۳۰	۱۷	۱۰	گلہ ہوشی کو دل میں بھی تنگی جاگیا	
۳۲	۱۸	۸	جب بہ تقریب سفر پارنے محلِ باندھا	
۳۳	۱۹	۳	نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا	
۳۵	۲۰	۳	وہ مری چین چین سے غم نہاں سمجھا	
۳۷	۲۱	۸	پھر مجھے دین تریا د آیا	
۳۹	۲۲	۱۱	ہوئی "تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا	
۴۱	۲۳	۱۲	تو دوست کسی کا بھی ستم نہ ہوا تھا	
۴۲	۲۴	۷	عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا	
۴۳	۲۵	۸	ذکر اس پر پوش کا اور پھر بیاں اپنا	
۴۴	۲۶	۷	جو رے باز آئے پر باز آئیں کیا	
۴۸	۲۷	۱۰	عشرتِ ظہر ہو دریا میں فنا ہو جانا	
۵۰	۲۸	۹	کنج میں بچھا رہوں یوں پر کھلا	
۵۲	۲۹	۱۲	پھر ہوا وقت کہ ہوا بال کشا موجِ شراب	ب (۱)
۵۵	۳۰	۱۱	آبرِ خط سے ہوا ہوسرد جو باز آروست	ت (۱)
۵۷	۳۱	۹	حسنِ ثمر سے کی کشاکش سے چھٹا میر سے بعد	و (۱)
۵۹	۳۲	۱۰	بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر درو دیوار	ر (۶)

نمبر صفحہ	نمبر غزل	تعداد اشعار	مصرعہ اولیٰ ہر غزل	کیفیت
۶۱	۳۳	۹	گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر	
۶۳	۳۵	۱۲	کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار و بچہ کر	
۶۶	۳۶	۸	لرزتا ہوں مراد دلِ زحمتِ مہر و رختاں پر	
۶۷	۳۷	۱۱	ہو نہیں کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشانِ ار	
۷۰	۳۸	۱۰	لازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور	
۷۲	۳۹	۵	حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز	ز (۳)
۷۳	۴۰	۳	کیونکہ اس بت سے رکھوں جان عزیز	
۷۴	۴۱	۱۰	نیکی نغمہ ہوں نہ پر وہ ساز	
۷۶	۴۲	۸	زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک	ک (۲)
۷۷	۴۳	۷	آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک	
۷۹	۴۴	۹	ہو کس قدر ہلکا فریبِ وفا کے گل	ل (۱)
۸۱	۴۵	۸	وہ فراق اور وہ وصال کہاں	ن (۲۲)
۸۳	۴۶	۱۱	ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں	
۸۵	۴۷	۹	کی و فہم نے تو غیر اس کو جانتے ہیں	
۸۷	۴۸	۱۱	آبرو کیا خاک اُس گل کی گلشن میں نہیں	
۸۹	۴۹	۵	ہم سے کھل جاؤ بوقتِ محبتی ایک دن	
۹۰	۵۰	۱۳	ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں	
۹۲	۵۱	۷	ماخِ دشتِ نوردی کوئی تدبیر نہیں	

نمبر صفحہ	نمبر غزل	تعداد اشعار	مصحح اولیٰ ہر غزل	کیفیت
۹۳	۵۲	۶	جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں	(۷)
۹۶	۵۳	۱۳	ملتی ہو غم سے یار سے نارالہباب میں	
۹۸	۵۴	۱۱	کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں	
۱۰۱	۵۵	۱۰	جیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیوں گبر کو ہیں	
۱۰۳	۵۶	۹	ذکر میرا یہ بدی بھی اسے منظر نہیں	
۱۰۵	۵۷	۹	نالہ جھوٹا طلب اس ستم ایجاد نہیں	
۱۰۶	۵۸	۷	نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتبار نہیں	
۱۰۸	۵۹	۸	تیرے تو سن کو عبا باندھتے ہیں	
۱۱۰	۶۰	۸	داہم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں ہیں	
۱۱۱	۶۱	۱۳	سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں	
۱۱۳	۶۲	۱۰	دیوانگی سے دوشس پہ نہ تار بھی نہیں	
۱۱۶	۶۳	۹	نہیں جو نہ خم کوئی بجھنے کے در فور سے تن میں	
۱۱۸	۶۴	۷	مر سے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں	
۱۲۰	۶۵	۹	دل ہی تو ہو نہ سنگ و خشت اسے بھر نہ آئے کیوں	
۱۲۱	۶۶	۱۰	غیر نا شکستہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں	
۱۲۳	۶۷	۹	وارثہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو	
۱۲۶	۶۸	۱۲	نفس میں ہیں گرا چھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو	
۱۲۸	۶۹	۸	دی ساوگی سے جان پڑوں کہ وہ کن کے پافو	

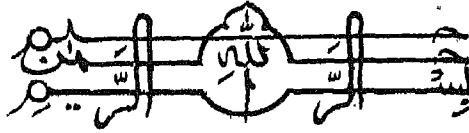


نمبر صفحہ	نمبر غزل	تعارف اشعار	مصراع اولے ہر غزل	کیفیت
۱۳۰	۷۰	۱۱	واں پہونچکر جو عشق آتا پیہم ہو ہم کو	ی (۶۳)
۱۳۲	۷۱	۷	تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو	
۱۳۳	۷۲	۹	کسی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو	
۱۳۵	۷۳	۱۳	کسی کو دے کے دل کوئی نواسخ فغاں کہیں ہو	
۱۳۸	۷۴	۱۱	میں کے زیر سایہ خرابات چاہتیے	
۱۴۰	۷۵	۷	بساط عجز میں تھا ایک لاکھ قطرہ خوں بھی	
۱۴۲	۷۶	۷	غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی	
۱۴۳	۷۷	۸	کیا تنگ ہم تم زدگاں کا جہان ہو	
۱۴۵	۷۸	۱۲	درو سے تھک کو ہو میرے بے قراری ہائے	
۱۴۷	۷۹	۶	سرکشی میں عالم ہستی سے یاس ہو	
۱۴۹	۸۰	۷	گر خامشی سے فائدہ اخلاصے حال ہو	
۱۵۰	۸۱	۹	عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی تھی	
۱۵۲	۸۲	۹	اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کے	
۱۵۴	۸۳	۷	رفقا پر عمر قطع رہ اضطراب ہو	
۱۵۵	۸۴	۱۰	دیکھنا قیمت کہ آپ اپنے پر شک جائے ہو	
۱۵۷	۸۵	۷	سادگی پر اس کی مہربانی کی حسرت دلی میں ہو	
۱۵۹	۸۶	۸	دل سے تری نگاہ جسکے تاک ترگی	
۱۶۱	۸۷	۷	تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے	

نمبر صفحہ	نمبر غزل	تعداد اشعار	مضوع اولے ہر غزل	کیفیت
۱۶۲	۸۸	۶	کوئی دن گر زندگانی اور ہو	
۱۶۳	۸۹	۱۰	کوئی اُمید پر نہیں آتی	
۱۶۵	۹۰	۱۱	دلِ نادر داں مجھے ہوا کیا ہو	
۱۶۸	۹۱	۹	کہتے تو ہو تم سب کہ بہتِ غالبہ موتا ہے	
۱۶۰	۹۲	۱۴	پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہو	
۱۶۳	۹۳	۱۰	بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم بچے	
۱۶۵	۹۳	۱۳	ظلمت کن میں میرے شبِ غم کا بوش ہو	
۱۶۶	۹۵	۷	نہ ہونی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی	
۱۶۹	۹۶	۷	عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے	
۱۸۰	۹۷	۱۳	شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہو	
۱۸۳	۹۸	۱۰	ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہو	
۱۸۵	۹۹	۷	اگر مری جان کو قرار نہیں ہو	
۱۸۷	۱۰۰	۳	ہجومِ غم سے یا ناک سرنگونی مجھ کو حاصل ہو	
۱۸۷	۱۰۱	۱۱	جس نرم سے تو ناز سے گفتار میں آوے	
۱۸۹	۱۰۲	۱۰	حسنِ مہِ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہو	
۱۹۲	۱۰۳	۸	غیر لیں محفل میں بوسے جام کے	
۱۹۳	۱۰۴	۷	پھر اس انداز سے بہا رانی	
۱۹۵	۱۰۵	۹	کب وہ سننا ہی کہانی میری	

نمبر صفحہ	نمبر غزل	تعداد اشعار	مصرع اولے ہر غزل	کیفیت
۱۹۷	۱۰۶	۵	جس زخم کی ہستی ہو تدبیرِ رفوی	
۱۹۸	۱۰۷	۹	چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے	
۲۰۰	۱۰۸	۱۰	ہر قدم دوری منزل ہی نمایاں مجھ سے	
۲۰۲	۱۰۹	۹	مکتہ چیں ہو غمِ دل اُس کو سناے نہ بیٹے	
۲۰۳	۱۱۰	۵	وہ آئے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے	
۲۰۵	۱۱۱	۶	پیش سے میری وقتِ کشمکش ہر تارِ بسترِ او	
۲۰۶	۱۱۲	۷	خطرِ او رشتہ اُلفتِ گِ گِردن نہ ہو جائے	
۲۰۷	۱۱۳	۷	فریاد کی کوئی ٹی نہیں ہو	
۲۰۸	۱۱۴	۳	ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے	
۲۰۹	۱۱۵	۹	دیا ہو دل اگر اس کو بشرِ او کیا کہیے	
۲۱۱	۱۱۶	۸	دیکھ کر در پر و گرم دامن افشانی مجھے	
۲۱۲	۱۱۷	۵	یا دہو شادی میں بھی ہنگامہ یارب مجھے	
۲۱۳	۱۱۸	۱۰	حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہو	
۲۱۵	۱۱۹	۸	کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گرا جائے ہو مجھ سے	
۲۱۷	۱۲۰	۱۳	بازیچہ اطفال ہو دنیا مرے آگے	
۲۲۰	۱۲۱	۱۱	کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے	
۲۲۲	۱۲۲	۷	روئے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے	
۲۲۳	۱۲۳	۱۰	ابنِ مریم ہوا کر سے کوئی	

نمبر صفحہ	نمبر غزل	تعداد اشعار	مضامین اولے ہر غزل	کیفیت
۲۲۶	۱۲۴	۷	بہت سی غم گیتی ستراب کمر کیا ہو	
۲۲۷	۱۲۵	۹	ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے	
۲۲۹	۱۲۶	۳	مستی بذوق غفلت ساقی ہلاک ہو	
۲۳۰	۱۲۷	۱۰	جس چاشیم شانہ کیش زلفیا پار ہو	
۲۳۲	۱۲۸	۷	آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے	
۲۳۳	۱۲۹	۱۲	جب تک دہان زخم نہ پلید کرے کوئی	
۲۳۶	۱۳۰	۱۲	شبہم بہ گل لالہ نہ خالی ز ادا ہو	
۲۳۸	۱۳۱	۹	منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی	
۲۴۰	۱۳۲	۹	غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہو	
۲۴۲	۱۳۳	۱۷	مدت ہوئی ہو یار کو مہاں کیئے ہوئے	
۲۴۵	۱۳۴	۱۳	نوید امن ہی بیدار دوست جاں کے لیے	
۲۴۸	۱۳۵	۹	میں ہوں مشتاق جفا مجھ پہ جفا اور سہی	
۲۵۰	۱۳۶	۷	آپ نے مستی نصر کہا ہو تو سہی	



## ردیف الف

کیا یہ منشا تھا ازل میں کاتبِ تقدیر کا ① ذرہ ذرہ ہو فنا اک روز اس تعمیر کا  
 رنگ جھلکایا ہو کیوں ہر چیز میں تغیر کا نقش فریادی ہو کس کی شوخی تحریر کا  
 کاغذی ہو پس پہن ہر پیکر تصویر کا  
 درد و غم کرتے ہیں جو کچھ روح فرسائی پہنچے حسرتیں کرتی ہیں جو ہنگامہ آرائی پہنچے  
 توڑتی ہو دل کو کیونکر ناشکیبائی پہنچے کاؤ کا سخت جانی ہائے تنہائی پہنچے  
 صبح کرنا شام کا لانا ہو جو سے شیر کا  
 آرزوئے قتل کو لب پر نہ لانا چاہیے ہاں مگر در پردہ تدبیر و تقاضا چاہیے  
 کھنچے خود آئے اثر قاتل پر اتنا چاہیے جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے  
 سینہ شمشیر سے بہا ہو دم شمشیر کا

کوئی کم مایہ اگر برسوں طبیعت کو لڑائے      غیر ممکن ہو کوئی نکتہ مرے نکتوں سے پائے  
 لاکھ سامع کان اپنے میری باتوں پر جائے      آہی دامن شنیدن جس قدر چاہے بچائے  
 مدعا عفا ہو اپنے عالمِ تعبیر کا  
 جوشِ وحشت جب مجھے تھمتے نہیں دیتا ذرا      پھر ہو مرزا سلسلہ بیکارِ قید و بند کا  
 ہیں مرے نزدیک یہ طوق و رسن تو چیز کیا      بسکہ ہوں غالبِ اسیری میں بھی آتشِ نیرِ پا  
 مومے آتش دیدہ ہو حلقہ مری زنجیر کا



④

کیا بتاؤں آتشِ اُلفت میں کیا کیا جل گیا      ساز و ساماں اپنی ہستی کا سراپا جل گیا  
 جسم بالکل چمک گیا ہو اور کلیجہ جل گیا      دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا  
 آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا  
 مجھ کو دعویٰ ہو بلا دیتی ترا دل ہر صدا      لیکن اب یہ بے اثر ہو میں کجا اور تو کجا  
 نالہ ہو سکتا ہو اپنی حد امکان تک رسا      میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافلِ بلا  
 میری آو آتشیں سے بالِ عفا جل گیا  
 خیر سمجھو آتشِ غم دل میں جب تک ہو نہاں      ورنہ پھر چھوٹے گی کیا دنیا میں یہ برقی تپاں  
 ذکر سے اس کے زبانِ شمع ہوتی ہو زباں      عرض کیجے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صراجل گیا

دیکھنے کو اب بھی ہو سرو چراغاں جسم زار      دل کی ہستی پر ہو لیکن داغ کا دار و مدار  
اب تو اک ظلمت کے سینہ ہو گوہرِ داغدار      دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار

اس چراغاں کا کروں کیا کار فرما جل گیا

ہو فراق ہنشیناں پر طبیعت مشتعل      کر دیا سوز و گدازِ دل نے ہر تر مضمحل  
کوئی دل بھی تو نظر آتا نہیں بے غش و غل      میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کے دل  
دیکھ کر طرزِ تپاک اہل دُنیا جل گیا

(۳)

پنجہ دیو جنوں دشمنِ داماں نکلا      اس سے بچ کر نہ کوئی تار گریباں نکلا  
تنگ بلوس تن عاشق حیراں نکلا      عشق ہر رنگ رقیب سرو سا ماں نکلا  
قیس تصویر کے پرے میں بھی عیاں نکلا

دل میں ٹھہری نہ سناں کوئی گھڑی بھی یارب      کس بلا کی اسے حال ہو روانی یارب  
حسرتِ بوسہ سو فار نہ نکلی یارب      زخم نے داؤدندی تنگی دل کی یارب

تیر بھی سینہ سہل سے پرافتناں نکلا

کون ہو جس کو ہو جمیبتِ خاطر حاصل      کوئی آشفہ کوئی منتشرِ روں میں داخل

گھر ہو یا ہو کوئی شوریں سروں کی منزل بوئے گل نالہ دل دو در چراغ محفل

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

خوب لوٹے ہیں مرے دل میں چٹھی نمٹے و کس کی تقدیر کہ یوں ہاتھ لگے دولت درد

کیوں نہ ہوتی تجھے ہر دم طلب کثرت درد دل حسرت زدہ تھا ماندہ لذت درد

کام یاروں کا بقدر لب ونداں نکلا

مدتوں دل کو رہی لذت آزار پسند تھارگ جاں کو دم خنجر خونخوار پسند

اب بقا اپنی نہیں ہی ہیں زہار پسند ہو تو آموزہ فنا ہمت دُشوار پسند

سخت مشکل ہو کہ یہ کام بھی آساں نکلا

قطرہ اشک جو آنکھوں سے بہا یا غالب رشک دریا اُسے مرگاں نے بنا یا غالب

تار مرزائے پھراٹکوں کا لگا یا غالب دل میں پھر گرہ پہنے اک شور اٹھا یا غالب

اے جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

کہتا ہو کون عشت میں فرما دے مرد تھا ہاں تھا جو کچھ تو قیس بیا یاں نور و تھا

وہ کیا جو اک ضعیفہ کے حلقے میں مرد تھا دھکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا

عشق نبرد پیشہ طبل گار مرد تھا



کچھ وقفہ حیات جو مجھ کو عطا ہوا تھا اس میں بھی فنا کا تصور بند رہا ہوا  
 گویا وطن میں تھا درِ غربت کھلا ہوا تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا  
 اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تحصیلِ درس ہر وفا کر چکا تھا میں الفت کے امتحان سے فارغ ہوا تھا میں  
 بے مہری زمانہ سے نا آشنا تھا میں تالیفِ سخن ہائے وفا کر رہا تھا میں  
 مجموعہ خیال بھی نہ دیکھا تھا

سینہ کہ ایک ٹخنہ مشق جنوں ہو اب جو داغ ہو کہ زخم ہو وہ لالہ گوں ہو اب  
 حالت ہر ایک عینو کی زار و زیوں ہو اب دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے نوحں ہو اب  
 اس رہ گزر میں جلو و گل آگے گرد دیتا تھا

یاروں نے دل لگانے کو سمجھا ہو دل لگی حالانکہ آفتیں ہیں ہمیشہ نئی نئی  
 ممکن نہیں نجاتِ طے غم سے جیتے جی جانی ہو کوئی کشمکش اندر وہ عشق کی  
 دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

حاصلِ غرض ہوئی نہ مرے قہر و ہند سے تھا نہ عاکہ گھر میں یہ وحشی پڑا رہے  
 چھوڑی نہ اپنی خودِ آوارہ گرد نے احباب چارہ جوئی و حشمت نکر سکے  
 زنداں میں بھی خیالِ بیا بیاں نور دیتا تھا

مڑ زایہ ستم ظلم و ستم کیا یہاں کی ہے مٹی خراب بلبلس ہندوستان کی ہو  
 شاکی جو اس زمانہ نافروداں کی ہے یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہو  
 حق مغفرت کرے عجب آزاد مروت تھا



وعدہ پورا کبھی اُس شوخ کا کوئی نہ ہوا قصہ کوتاہ وفا عہد وفا بھی نہ ہوا  
 فیض کچھ ہستی موہوم سے اس کی ہوا دہریں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا  
 ہو یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

سب غلط ہو کہ زبرد وہی ہوگا اعلیٰ جس کا نظارہ کرے مارِ سیہ کو اندھا  
 کس طرح کہیے کہ پتھر میں اثر یہ ہوگا سبزہ خط سے ترا کا کل سرکش نہ دبا  
 یہ زمرہ بھی حریف دم افنی نہ ہوا

اس سے مایوس ہوا ہوں کہ جہاں چھوٹوں جیتے جی دامِ غم ہو شراب سے چھوٹوں  
 غیر ممکن ہو کہ میں سرج و بلا سے چھوٹوں میں نے چاہا تھا کہ اندوہ و فاس سے چھوٹوں  
 وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی رضی نہ ہوا

ہم جو اس بزم میں کتر ہیں تو کتر ہی ہیں کم ہیں زہا دے رندوں کے برابر ہی ہیں  
 آئینہ اپنا مکدر ہو مکدر ہی ہے دل گزر گاہ خیال می و ساغر ہی ہے

گر نفس جاوہر منزل تقویٰ نہ ہوا

ہو پتے تھے ترے لانے میں جو مصروف بھی مجھ کو ممنون بنانے کو تھے احباب سبھی  
کھل گئی ان کی غرض تو نے بھی ٹالا ہی تھی ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ بھی

گوشِ منت کش گلبانگِ تسلی نہ ہوا

کس سے دل کھول کے کچھ شکوہ کلفت کیجے کون ہو کس سے بیانِ غم و حسرت کیجے  
کس دعا کے لیے اُمیدِ اجابت کیجے کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے

ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

ذکر کرتا تھا مسیحا کا جو سب سے غالب تنگ مرزا تھا غم و رنج و تعبِ غالب  
منتظرِ مرگ کا تھا دیکھیے کب سے غالب مر گیا صدمہ کی جنبش لب سے غالب

نا توانی سے حریف و ہم عیسیٰ نہ ہوا



(۶)

نہ کچھ مرغوب آنکھوں کو نہ نظارہ گلستاں کا نہ سودا سہریں ہو حسن و جمالِ حور و غلمان کا

ہمارا دل ہو وارفتہ بہارِ بزمِ جاناں کا ستائش گہر ہو زامداسِ قدر جس باغِ رضواں کا

وہ اک گلہ سہ ہو ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

لیا کرتا ہو کامِ ابرو سے ظالم تیغِ بڑاں کا شمار آساں نہیں جو روحِ جوائے چشمِ فتاں کا

مگر اس پر بھی دل تسبیح خواں ہو نام جانان کا      بیاں کیا کیجیے بیداد کا و شہائے مرگاں کا

کہ ہر اک قطرہ خوں دانہ ہو تسبیح مر جاں کا

بہت کچھ سہی و کوشش کی کہ وکوں لکے نالوں کو      لبوں تک بھی نہ آنے دوں کبھی سینے سے نالوں کو

مدد دی صورتِ فیہ خرس دندان نے نالوں کو      نہ آئی سلوت قابل بھی مانع میرے نالوں کو

لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

خدا ناخوستہ داغ جگر اپنا جو جل اٹھے      زبان شمع پیدا ہوا بھی ہر اک بنِ موسے

ابھی دیکھے کہاں ہیں تم نے شعلے سوز باطن کے      دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت مانے نے

مرا ہر داغِ دل اک تخم ہو سرورِ چراغاں کا

نظر آنے لگے چاروں طرف لاکھوں حسین تجھے      درو دیوار تیرے عکس رخ سے جگمگا اٹھے

ہوئے آثار ظاہر یک بیک حدت میں کثرت کے      کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے

کرے جو پر تو خورشیدِ عالم شبنمستاں کا

بظاہر کتنی محکم خانہ تن کی بنا رکھی      مگر خود سعیِ صانع و جہ اسبابِ فنا رکھی

بنے گی صاعقہ اک دن یہی صانع کی دل گرمی      مری تعمیر میں مضمحل ہو اک صورتِ خرابی کی

ہیوئے برقِ خرمن کا ہو خونِ گرم دھماکاں کا

دم ہیجان و حسرتِ پاؤں میں ہوتا ہو اک چکر      مری آہوں سے بن بن کر گولے اٹھتے ہیں دن بھر

یہ نوبتِ سخن کی پہنچی کہ چٹاٹن ہو صحرا پر اگاہی گھر میں ہر سو بہرہ ویرانی تماشا کر

مدارِ کعبہ دینے پر گھاس کے ہی میرے دریاں کا

مرے جل بجھنے کی دنیا کو ناعن جستجو ہیں جگر کی آگ کا اظہار کم نظریوں کی خویں ہیں

نہ شکوے ہیں لبِ سوزِ دل کی گفتگو میں ہیں خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں

چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گوِ غریباں کا

تصویر میں جو وہ تصویرِ پُر انوار باقی ہو یہ اک شکلِ تسلی بخشِ جانِ زار باقی ہو

ہوئے ہم خاک اس کی گرمیِ بازار باقی ہو ہنوز اک پر تو نقشِ خیالِ بار باقی ہو

دلِ افسردہ گو یا چہرہ ہو یوسف کے کنڈاں کا

مری قسمت بُری ہو آپ ہوتے ہمشیں ورنہ یہ دوری دیدہ و دانستہ ہی رہتے قریب رہ

پسند اید اہی کرتے کیوں مجھے اندوہ لگیں ورنہ بعل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں رہ

سبب کیا خواب ہیں آکر تبسم ہائے پہناں کا

سبب تیری خوشی کا میں نے مرجائے کو بھیجھا ترا غم دیکھ کر ٹھکو قفلت ہو اپنے مرنے کا

میر میری تعزیت اور سب سے مل کر تزار ونا انہیں معلوم کس کس کا ہو پانی ہوا ہوگا

قیامت ہو سرشک لودہ ہونا تیرے مرگیاں کا

کھلا ہو سامنے منظرِ عدم آباد کا غالب سمجھتا ہوا سے مرزا سفر کا منتہا غالب

اسی میں منتشر ہوتے ہیں اور اق بقاء غالب      نظر میں ہی ہماری جاوہ راہ فنا غالب  
کہ یہ شیرازہ ہی عالم کے اجزا پریشاں کا



کیوں ہو رہا ہو شیفتہ بربط نواز کا      گر ویدہ کس لیے ہی عراق و حجاز کا  
ہر زبان پہ راگ اُسی بے نیاز کا      محرم نہیں ہی تو ہی نوا ہائے راز کا  
یاں ورنہ جو حجاب ہی پردہ ہو ساز کا

خداں جو میرے حال پہ وہ ماہ پارہ ہی      جاگے نصیب و جہ پر اپنا ستارہ ہی  
پژمردگی پہ میری خوشی کا اشارہ ہی      رنگِ کستہ صبح سب پر نظارہ ہی  
یہ وقت ہی شگفتنِ گلہائے ناز کا

منا بھی ہی جو مجھے تو آمادہ ستیز      دشمن کے ساتھ رام ہی مجھ سے ہم و گریز  
مجھے تنفر اور رقیبوں سے خیر دیز      تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز  
میں اور دکھ تری ترہ ہائے دراز کا

بیاب ہو گا صورت برق و شر نہ میں      آلے کہ ونگا درد سے شام و سحر نہیں  
خاموش ہوں جاؤں گا دردِ جگر نہ میں      صرفہ ہی ضبطِ آہ میں میرا و گرنہ میں  
ظہم ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

سبکے ہیں اس کی بزم میں ارماں نکل ہے      آبِ بقا کے چشمہ میں گو یا اُبل رہے  
 مستوں میں پڑی پڑی ہیں عجب دُور چل رہے      ہیں بسکے جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے  
 ہر گوشہ بساطِ ہی سر شیشہ باز رکھا

اس کو ہی رات دن طلبِ تیرِ سینہ دوز      مطلوبِ اس کو شام و سحر سو ترِ سینہ سوز  
 اس بواہوس کو چاہیئے اک زخمِ تازہ روز      کاوش کا دل کرے ہی تھا ضاکہ ہی ہنوز  
 ناخن پہ قرضِ اس گر و نیمباز رکھا  
 مرزا کے دل کی پوچھتے ہو بات کیا تہد      صدقے میں عشق کے یہ بھرا گھر لٹا تہد  
 برباد مفت گنجِ جوا ہر گیا اسد      تاراج کاوشِ غم ہجران ہوا اسد  
 سینہ کہ تھا دُفینہ گہرائے راز رکھا



ہی نویدِ اہل سخن کو خیر کا منظر کھلا      (۸) بابِ بزل و جود گو یا نکتہِ سخنوں پر کھلا  
 اس بہانے سے مگر داد و دہش کا در کھلا      بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا  
 رکھیو یا رب یہ درِ گنجینہ گو ہر کھلا  
 زینتِ بزمِ فلک کا حال جب مجھ پر کھلا      تب مسرت سے ذرا اپنا دلِ مضطر کھلا  
 شاہِ خاور چھپ گیا روئے مہرِ انور کھلا      شبِ ہونی پھر انجمِ خشنودہ کا منظر کھلا

اس تکلف سے کہ گویا بت کردہ کا دکھلا

چاہیے مدت اگر یاروں کے گنواؤں فریب  
اس کی ہر اک بات میں چاہوں تو دکھلاؤں فریب  
اعتبار ان کا مجھے کیونکر ہو جب پاؤں فریب  
گرچہ ہوں پوانہ پر کیوں دوست کا کھلاؤں فریب  
استیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

بزمِ حرم میں اُس سے اس برتاؤ کی کب تھی مہد  
نشہ میں آئندہ ملنے کی بھی دیتا ہو نوید  
اس خوشی میں ہر دل وارفتہ سرگرم نشید  
گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید  
پر یہ کیا کم ہو کہ مجھ سے وہ پری ہلکے کھلا

عمر بھر دل میں ہا شاہد پرستی کا خیال  
اب حقیقت کھل گئی اس کی کہ تھا اچھا خیال  
اس بہشتی رو کا آخر آج کام آیا خیال  
ہو خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال  
خلد کا اک درہو میری گور کے اند کھلا

واہ کیا ہر شو کا زینت وہ ہو حسن و نشیں  
حسن کے پر تو سے ہو جاتا ہو زیور بھی حسین  
نور سے اس لئے تاباں کے ہو ہر شو خوشہ چین  
منہ نہ کھلنے پر ہو وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں  
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

گھر کی غلمت ٹھیک بے فائدہ کیوں ہوں ملول  
جو بلا نازل ہو سر پر مجھ کو ہولِ قبول  
کیوں شبِ یزید کا شکوہ بے تکلف نے ذوقِ فنول  
کیوں اندھیری ہو شبِ غم ہو بلاؤں نزول



آج ادھر ہی کو رہنے کا دیدہ اختر کھلا

جب کیا قصد سفر تو تھا طبیعت میں خیال  
اپنے بچانوں کی الفت دیجیے دل سے خیال  
کر دیا ترک وطن ترکِ تعلق ہو محال  
کیا رہوں غربت میں خوش جلتا آؤں کلا چال

نامہ لاتا ہو وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

میں نے دل پر نقش کر لی حضرت مرزا کی پند  
چاپوسی اہل دنیا کی ہنیں مجھ کو پسند  
آستانِ غیر پر کیوں جاؤں ہو کر مستمند  
اس کی امت میں ہوں میں میرے پیچھے کیابند  
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

(۹)

اس کی آمد کے تصور میں جو میں بیتاب تھا  
بند کا آنکھوں میں آنا اک خیالِ خواب تھا  
اشکباری سے رواں اک سیلِ خونِ ناب تھا  
شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرہ ابراب تھا  
شعاعِ جوالہ ہر اک حلقہ رگِ داب تھا

کنجِ تنہائی میں یں تھا اور وہاں دربارِ عام  
وہ عرو کے ساتھ ہنستے تھے مجھے ٹونے سے کام  
میں بہاتا تھا یہاں آنسو وہاں تھا دورِ جام  
واں کرم کو عذرِ بارش تھا غماں گیرِ خرام  
گریہ سے یاں پنہاں بالش کفِ سیلاب تھا

میں یہاں سنبل کی صورتِ غم سے تھا آشفہ چال  
اور وہاں آراستہ ہوتے تھے زلفوں کے بال

تھی یہاں حیرت وہاں تھی آنکھ کی کچھ بھال وہاں خود آرائی کو تھا موتی پرے کا خیال  
 یاں ہجوم اشک سے تارنگہ نایاب تھا  
 وہ وہاں کرتے تھے ہاتھوں سے حنا کی شست شو بہہ رہا تھا دل یہاں سینے میں ہو ہو کر لہو  
 چاندنا گلشن میں تھا ظلمت یہاں تھی چارو جلوہ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو  
 یاں رواں شرکانِ چشم تر سے خونِ ناب تھا  
 سو گئے وہ سُمنے سُمنے قصہ خواں کی گفتگو اور یہاں برساکیا تا صبح آنکھوں سے لہو  
 فرشِ راحت پر وہ نئے اور ہم پریشاں کو بکو یاں سرِ شوریدہ بے خوابی سے تھا دیوار جو  
 وہاں وہ فرقِ نازِ محو بالِشِ سنجاب تھا  
 تھی یہاں اک بکیسی موس وہاں محفلِ جمی تھا یہاں دل صرف غمِ عشرتِ ہاں سا بھٹی  
 وہ وہاں تھے شمعِ محفلِ تھی یہاں اک کو لگی یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بے خودی  
 جلوہ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا  
 غش میں وہ محو تھے میں درد و غم میں مبتلا وہ وہاں خداں دفرحاں میں یہاں گرم بکا  
 وہ وہاں سرشارِ بادہ میں یہاں لبِ تشنہ تھا فرش سے تاعیش واں طوفاں تھا مبعِ رنگ  
 یاں زمیں سے آساں تک سوختن کا باب تھا  
 شوقِ حب سے زیادہ مجھ کو تڑپانے لگا سینہ سوزاں میں میرے آگ بھڑکانے لگا

چپکے چپکے میں کچھ اپنے جی کو سمجھانے لگا ناگہاں اس رنگ سے خونِ ناپہنچانے لگا

دل کہ ذوقِ کاوشِ ناعن سے لذتِ یاب تھا

شوق میں مضطرب مثالِ ماہی بے آب تھا مضطرب ایسا کہ گویا برق تھا سیما تھا

اس کی حالت سے پریشاں جلسہِ احباب تھا نالہ و لول میں شبِ اندازِ اثرِ نایاب تھا

تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیرِ گوشتِ یاب تھا

راتِ دنِ نالے ہو اس سے گوشِ زخمِ مثلِ زبیدی ہی اس کے سوا گویا نہ تھی کچھ اور کی

جوشِ گریہ کے سوا بھائی نہیں ہو کوئی شو مقدمِ سیلابِ دل کیا نشاطِ آہنگ ہو

خانہٗ عاشقِ مگر از صدائے آب تھا

اُس کے در کی خاک کو اُٹس کہوں یا کہوں اس زمیں کے فرش کو یا فرشِ محل کا کہوں

ہو بجاقا قلم سے نرمی میں اگر اعلیٰ کہوں نازشِ ایامِ خاکِ ستر نشینی کیا کہوں

پہلوئے اندیشہ و قفسِ بسترِ سنجاب تھا

تھا اُسی کے نور کا ہر چیز میں جلوہ عیاں ہو گیا کچھ بہ وہ غفلت ہی حاملِ دریاں

حیف ہو یوں ہی گئی صحرا نور دی راہِ یگان کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں

دُور دُور روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

یاد ہو صیاد اپنا وہ زمانہ بھی تجھے آبِ ودانہ کی ہمارے فکرِ بہتی حتیٰ تجھے

بیکسوں کے حال سے غفلت نہ تھی اتنی تھی آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تھی

کل تک تیرا ہی دل مہرِ وفا کا باب تھا

آخرِ دمِ یاد کیا ضد ہوئے کچھ تو بہت دیکھ کر مجھ کو جو تو نے دام اکٹھا کر لیا

شوق سے یوں تیرے پھڑپھڑے میں کی آیا بھی تھا یاد کرو وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا

انتظارِ صید میں اک دیدہ بچو اب تھا

ہونے والا تھا بپا طوفان اس کے اشک سے پچھتے کیا ہو کہ اک قطرہ سے دریا ہے

خیریت ہی ہو گئی حرّت کہ آنسو تھم گئے میں نے رو کا راتِ غالب کو وگرنہ دیکھتے

اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

⑩

ہم جو چاہیں کسی ذرے کا بیاباں ہونا ہی عیبِ چارہ و تدبیر میں حیراں ہونا

ممنوع کا کبھی ممکن نہیں امکان ہونا بس کہ دشوار ہی ہر کام کا آساں ہونا

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ابرِ مرگاں نے جو ٹھہرائی ہی ہر سانے کی نوبت آئے نہ کسی دن مرے بہ جانے کی

شکل ہونے لگی ہر گوشے میں ویرانے کی گریہ چاہے ہی خرابی مرے کا شانے کی

درودِ دیوار سے ٹپکے ہی بیاباں ہونا

بس جو دل پہ ہوا کچھ تو اسے رد کوں تو      میں اس آوارہ کا تا چندر ہوں گا دلو  
اپنے انجام کو سوچوں یہ مجھے ہوش بھی ہو      دوائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو  
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی جہاں ہونا

بختِ آئینہ ترے حسن سے کیا چمکا ہو      سامنے آنکھوں کے بے پردہ رخِ زیبا ہو  
خود نمائی کا جو شوق تو بیجا کیا ہو      جلوہ از بس کہ تقاضا رنگہ کر تا ہو  
جو ہر آئینہ بھی چاہے اور مرگاں ہونا

ماہل آنکھوں کو اور جو ذوقِ تجلے مت پوچھ      انبساطِ دل سرگرمِ تماشا مت پوچھ  
حسرتیں آج نکلنے کو ہیں کیا کیا مت پوچھ      عشرتِ قتل گہہ اہل تماشا مت پوچھ  
عیدِ نظارہ ہو شمشیر کا عریاں ہونا

یوں تو ہر دل میں ہو کس دل میں نہیں نشاط      ہاں جگہ دل میں ہمارے ہی نہ کی دوائے نشاط  
جیتے جی سر میں رہی جوشِ سودائے نشاط      لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط  
تو ہوا اور آپ بصد رنگ گستاں ہونا

عشق نے ذوقِ ہر اک چیز کو بجٹا ہوا جدا      سینہ مشتاقِ سناں سر کو تبر کا سودا  
جانِ بے تاب کو ہر شوقِ فدا ہونے کا      عشرتِ پارہٴ دل زخمِ تماشا کھانا  
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

جیتے جی میرے نہ کی مکر و دغا سے توبہ نہ ستم سے نہ کسی جرم و خطا سے توبہ  
 بھول کر بھی تو نہ کی خوفِ خدا سے توبہ کی مرے قتل کے بعد اس نے جہا سے توبہ  
 ہائے اُس زود پشیاں کا پشیاں ہونا

ہوئی ہو حضرت مرزا کو جو وحشت غالب پھر تو آ جاتی ہو بلبوس کی شامت غالب  
 جیبٹ امن کی تو ہوئی ہو بری گت غالب حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب  
 جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گرہیاں ہونا

⑪

مجھ سے غم آشام کا احباب غم کھائیں گے کیا خوگر کلفت کو وہ آرام پہنچائینگے کیا  
 جو شش و عشرت کے ہوتے زخم سلوائیں گے کیا دوست غمخواری میں میری سستی فرمائینگے کیا  
 زخم کے بھرنے تلکٹا غن نہ بڑھ آئینگے کیا

اس طرح مالوگے قصہ سن سنا کر کب تلک یہ جفا کاری روا رکھو گے ہم پر کب تلک  
 ہوگی آخر حاجت عرض مکر کب تلک بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک  
 ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائینگے کیا

دوست کیوں پند نصیحت پر تلے ہیں غمِ خواہ مجھ کو کچھ دیوانہ سمجھا ہو کسی نے داہ داہ  
 ہوں تجھ میں کہ آخر کیا ہوا مجھ سے گناہ حضرت ناصح جو آئیں دیدہ و دل فرشتہ داہ

کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ بھائی گئے کیا

قتل گمہ سے روز گونا کامیاب تاہوں میں      وقتِ عرضِ مدعا قاتل سے شرماتا ہوں میں  
دیکھیے تو راہ پر کیونکر اٹھیں لاتا ہوں میں      آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں  
عذر میرے قتل کرنے میں اب لائینگے کیا

چارہ سازوں نے مجوزِ بنجیروں سے باندھایوں سہی      ہی یہی ہیجانِ وحشت کا مداویوں سہی  
ہو نہیں سکتا جو کوئی اور چارہ یوں سہی      گر کیا نامح نے مجھ کو قید اچھا یوں سہی  
یہ جنوںِ عشق کے انداز چھٹ جائینگے کیا

ہنگڑی اور طوق گردن گیر سے بھائی گئے کیوں      خوگر ایذا ہیں ہم تعزیر سے بھائی گئے کیوں  
اس مناسب چارہ و تدبیر سے بھائی گئے کیوں      خانہِ ناز و زلف ہیں زنجیر سے بھائی گئے کیوں  
ہیں گرفتارِ وفانندان سے گھبراہٹیں گے کیا

یوں تو ہے یہ شہر اک منزلِ گمِ عشرتِ اسد      ہر طرف ہی عیش کے ساماں کی کثرتِ اسد  
پیش ہی باہنہ ہر ترا کو یہ وقتِ اسد      ہو اب اس مسمومہ میں قحطِ غمِ الفتِ اسد  
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں ہے کھائی گئے کیا

(۱۲)

ہیں اس کی بزم میں بھی اگر اذینِ بار ہوتا      دل غمزہ نہ غم سے کبھی رستگار ہوتا

شبِ روزِ وقفِ حرام یہ آمید واپس ہوتا یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال پار ہوتا  
 اگر اور جیتے رہتے یوں ہی انتظار ہوتا

ہمیں پیشتر عیاں تھا تڑا وعدہ پر نہ آنا بس اب اور جھوٹ کہہ کر ہی عبتِ یقیں دلانا  
 نہ کر اب یہ عذر پہچانے تراش کچھ بہانا ترے وعدے پر جیسے ہم تو یہ جان بھوٹ جانا  
 کہ خوشی سے مرنے جاتے اگر اعتبار ہوتا

پشکستِ عہدِ الفت ہو مقامِ حیرت افزا کہ نہیں یہ کام ہرگز کسی تجھ سے ناز نہیں کا  
 مگر اس قدر تو کھولامے دل نے یہ معما تری ناز کی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا  
 کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

ترے ناکِ ستم پر دل و جاں فدا ہیں اب تو کہ نکال دین اُنھوں نے مری حسرتیں تھیں جو جو  
 جو ملا ہی لطف کا وش وہ زباں سے کیا بیاں ہو کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نکلیں کو  
 یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ فقط میرا ہی دل تھا یہ میرا ہی تھا کلیجا ہزار صبر و تمکین بھی آفتوں کو جھٹلا  
 کسی کوہ میں کہاں ہو مری سوزِ غم کا یارا رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا  
 جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

یہ عجیب بات کی ہو کہ بنے ہیں دوستِ ناصح یہ انوکھی دل لگی کہ بنے ہیں دوستِ ناصح



کوئی چال یہ نہی ہو کہ بنے ہیں دستِ ناصح یہ کہاں کی دوستی ہو کہ بنے ہیں دستِ ناصح

کوئی چارہ ساز ہونا کوئی غم گسار ہونا

ہوا جھٹ چارہ گر کو کہ جو تم سے مشتعل ہو نہیں دل کا کوئی چارہ جو یہ غم سے مضحل ہو

نہیں سہل غم سے چھٹنا یہ شریکِ آبِ گل ہو غم اگر چہ جانگسل ہو پہ کہاں بچیں کہ دل ہو

غمِ عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

نہیں شب ہی مجھ کو بھاری کہ دن اسے بھی سہا ہو وہ بلائے جانگسل ہو تو یہ دیوِ جاں گزا ہو

کبھی جان لبوں پر آئی کبھی دم نخل گیا ہو کہوں کس سے میں کہ کیا ہو شبِ غم بُری بنا ہو

مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہیں تھا جو شوقِ جلوہ تو قصورِ فہم کا تھا ہو مقامِ شکر لیکن کہ خدا نے پردہ رکھا

رہی شرمِ اپنی پور نہ کسے تھا نظر کا یار اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہو وہ کیتا

جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں و چار ہوتا

یہ کسی پر اپنا مرنا ہوا کھیلِ دوستوں کا کہ لگا دیا ہو سب نے سرِ قبر ایک میل

گئے اپنی جان سے ہم انھیں ہو گیا تماشا ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں غرقِ دریا

نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں فرار ہوتا

ہوئی معرفت میں گویا جو تری زبان غالب تو سمجھ گیا ہو مرزا جو ہی تیری شان غالب

کوئی اب بھی تجھ سے کیونکر رہے بگمناں ہے  
یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب  
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۱۳)

بشر کرتا ہی بجا ادا کیا  
یہ کہہ سکتا ہی ترک مدعا کیا  
اسے تو دمن ہی ہو گا کیا ہو کیا  
ہوس کو ہی نشاطِ کار کیا کیا  
نہ ہو مرنا تو بھینے کا مزا کیا  
نہیں سمجھے ہو اب تک ماجرا کیا  
مالِ آخر ہی استفہام کا کیا  
تفاؤلِ پیشگی سے مدعا کیا  
کہاں تک ہی سراپا نا ز کیا کیا  
عدو پر لطف و دونا دیکھتا ہوں  
روابط بھی زیادہ دیکھتا ہوں  
مدارا میں اضافہ دیکھتا ہوں  
نواز شہائے بجا دیکھتا ہوں  
شکایت سے رنگیں کا گلہ کیا  
بہنو رہیں فتنہ پر دانا انا البحر  
جوابِ بحر کو ناز انا البحر  
عمیاں موجوں سے آواز انا البحر  
دلِ ہر قطرہ ہی ساز انا البحر  
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ذرا اس بے زبان دل کی صدفِ سن  
کچھ اپنی قدردانی کا گلہ سن  
پیسل بے بہا کہتا ہے کیا سن  
سن اے غارت گر جنسِ و فاسن  
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

ہوائے سنبل و سوسن نہیں ہے  
طبیعتِ بیلِ گلشن نہیں ہے  
بسائیں کیا یہاں دہن نہیں ہے  
دماغِ عطرِ پیرا ہن نہیں ہے  
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

کیا ہے کیوں جفاکاری کا دعوئے  
جتا یا کیوں شنگارِ ہی کا دعوئے  
تجھے کیوں ہے دل آزاری کا دعوئے  
کیا کس نے جگر داری کا دعوئے  
شکستِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

ابھی تک مگر کہاں ساقی نے دی ہے  
مگر حالتِ کمالِ نشہ کی ہے  
کسی کی چشمِ میگوں دیکھ لی ہے  
نفسِ موجِ مجبوطِ بخود سی ہے  
تو نفلِ ہائے ساقی کا گلہ کیا

عبثِ دشمن کو جلوے کی ہوں ہے  
کہ اس کو اک نگاہِ گرم بس ہے  
اسے کیا سوزِ پشہاں میس ہے  
فروغِ شعلہِ خس یک نفس ہے  
ہوس کو پاسِ ناموس و فاکیا

کبھی تو جو ہر تیغِ نظر دیکھ پھر اپنے جاں نثاروں کے جگر دیکھ  
 نہیں الزام تجھ پر بے خطر دیکھ محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ  
 شہیدانِ نگہ کا غول بہا کیا

اس اپنی آرزو پر مر مٹا ہوں کہ نصبِ لعینِ چشمِ سرمہ سا ہوں  
 ہر تن شوقِ نظارہ ہوا ہوں نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں  
 تنافہا کے تمکین آزا کیا

یہ ذکرِ جلوۂ فردا کیا کیوں ابھی سے کر دیا محشرِ بپا کیوں  
 تنافل اس قدر رکھا روا کیوں یہ قاتل وعدۂ صبر آزا کیوں  
 یہ کافرِ فتنہ طاقتِ بپا کیا

کہے کیا کوئی اس کی باتِ پبات کہ ہے افسوں و جادو سرِ بسات  
 نہیں ہے کوئی ہر زبانیِ اثبات بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات  
 عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

کون کہتا ہے کوئی عاشقِ شیدا نہ ہوا (۱۴) ہاں یہ دعویٰ ہے کہ ہمسا کوئی ہو گا نہ ہوا  
 اپنی یکتائی کا دعویٰ ہمیں بے جا نہ ہوا درخوہِ قہر و غضب جب کوئی ہمسا نہ ہوا

پھر غلط کیا ہے کہ ہمساکوئی پیدا نہ ہوا

ہم سے کہیں نہ یہ اُمید کبھی ابل کر م      بند ہی در تو کریں طوفِ سدا دیں بہم  
زخمِ دُخیز ہی ہاں فقر و غنا پر ہر دم      بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود ہیں کسم  
اُٹے پھرائے درِ کعبہ اگر وہ نہ ہوا

حسن کا تیرے زمانے میں ہی سکھایا      سامنے ماہِ میں کوئی گھڑی جم نہ سکا  
شرم سے ہر جہان تاب بھی ہو بقفا      سب کو مقبول ہی دعویٰ تری یکتائی کا  
رو برو کوئی بستِ آئینہ سیما نہ ہوا

کب تری آنکھ کے بیمار نے چاہا درماں      کب ہوا چارہ گروں سے یہ دوا کا خواہاں  
چشمِ بد دور اُسے ہی یہ مرضِ راحتِ جاں      کم نہیں نازش ہمنامی چشمِ خواہاں  
تیرا بیمار بُرا کیا ہی گر اچھا نہ ہوا

کیا فغاں ہے وہ فغاں جس سے کوئی دل نہ ہلا      کیا کہیں آہ پھر اُس آہ کو جو ہونہ رسا  
ہے وہ فریادِ عبث جس سے کوئی گھر نہ جلا      سینے کا داغ ہے وہ نالہ جو لبِ ناک نہ گیا  
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا

جھپٹتا ہوں جو شبِ روزِ غم و سنج و بلا      یہی مقصود تھا شاید کہ مری خلقت کا  
کوئی حرامِ زودہ کیا روزِ ازل اور نہ بقا      نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ہوا

کام میں میرے ہی وہ منت نہ کہ برپا ہوا  
 سن کے ذکر تپش قلب ہے صبر کی تاب  
 داستانِ شبِ غم اور نہ اٹھے آنکھوں سے خواب  
 ہر بن محسوس دم ذکر نہ ٹپکے خوں ناب  
 حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چہر چاہ نہ ہوا  
 جرمِ عی میں نہ ہو جلوہٴ مینا نہ و مل  
 ذرہ ذرہ میں نہ ہو سیرِ بیاباں و سبل  
 غنچہ گل میں نہ آجائے نظر گلشن و گل  
 قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ ہے اور جزو میں گل  
 کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہٴ مینا نہ ہوا  
 مدتوں خط و کتابت رہی مرتزا اُس سے  
 تب کہیں قتل کا اقرار کیا قاتل نے  
 آج کچھ قتل کے سامان بھی مقتل میں ہے  
 تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پُرزے  
 دیکھتے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہو

❦  
 (۱۵)

بجا ہی تم کرو جو کچھ گلہ اپنے فدائی کا  
 ادا اس سے نہ کچھ بھی ہو سکا حق آشنائی کا  
 نہ پہونچا بزم تک تو عذر ہی بیدست و پائی کا  
 پے نذرِ کرم تحفہ ہی شرمِ نار سائی کا  
 بخوں غلطیدہٴ صدرِ رنگِ عجبے پار سائی کا  
 ابھی تک تو رہا پردہٴ تمھاری خوش ادائی کا  
 نہ ہو جائے کہیں نیا میں شہرہٴ دلربائی کا

کسی دن رنگ لائے گا یہ لپکا خود نمائی کا نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا بے وفائی کا

بمہر صد نظر ثابت ہے دعوے پارسائی کا

ترے نور و ضیا سے فیض ہر و ماہ کو پہنچا مگر حسرت کشاکش میں ہی رہا تیرے عجیبی کا  
ترے در پر جو سائل آگیا خالی نہیں جانا زکوٰۃ حسن دے دی جلوہ بینش کہ مہر آسا

چرخ خانہ درویش ہو کا سہ گدائی کا

اہیں تو یہ تمنا تھی کہ سر ہوا و تیرا خنجر سر منقل کہا کس نے کہ ای قاتل عایت کر  
یقیناً تجھ سے ہوگی باز پرس اس کی سرعشر نہ مارا جان کر بے جرم غافل تیری گردن پر

رہا مانند خون بے گنہ حق آشنائی کا

بمحلہ حب سے شیوہ طلی لسانی ہی نہ قصہ درد کا لب پر نہ کچھ غم کی کہانی ہی  
خوشی میں بسر ہوتی ہے اچھی زندگانی ہی تمنائے زباں مجھ سپاس بے زبانی ہی

مٹا جس سے تقاضا شکوہ بے دست و پائی کا

مرے زخموں کی صورت جو ملتی صورت گل ہے اسی صورت کا صد قرہ کہ قد و قیمت گل ہے  
مرے ہی خوں شدہ دل کا تصدق حیرت گل ہے وہی اک بات ہے جو بیاں نفس نہاں بہت گل ہے

چمن کا جلوہ باعث ہے مری نگیں نوائی کا

دفا داروں سے بھی تو نے جوید عہدی کی ٹہنی نکایت بے دہن لگوں کے لب تک بھی می آئی

حسینوں سے زبانِ طعن آخر تو نے کھلوائی وہاں ہریت پناہ جو زنجیرِ سوائی  
 عدم تک بے وفا چرچا ہی تیری ہو فانی کا  
 نہوگا ختم نامہ یوں تو چاہے جس قدر لکھ دے  
 پڑھے گا کون تو دفتر کے دفتر بھی اگر لکھ دے  
 مناسب ہو کہ مرزا کی طرح مصرع ترکھ دے  
 ندے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے  
 کہ حسرت سنج ہوں عرض ستمائے جہانی کا

چپ ہے تو اس راحت کا گماں ہو جائے گا (۱۶) جو گلہ دل کو ہی دل ہی میں نہاں ہو جائے گا  
 جو بیاں سے معاہدہ رائیگاں ہو جائے گا گر نہ اندوہ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا  
 بے تکلف داغِ مہر دہاں ہو جائے گا  
 ہیبتِ غم سے ہی بیڈھبل کو کربِ اضطراب ہو شبِ مہ میں طبیعت کو بلا کا بیچ و تاب  
 جزر و مد میں کہیں پیدا نہ کرے ماہِ تاب زہرہ گرا ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہو آب  
 پر تو مہتابِ سیلِ خاماں ہو جائے گا  
 استراحت میں ہی کس انداز سے وہ سہمہ سورہا ہی مست صہبائے جوانی بے خبر  
 میں عجیبِ بیم ورجا میں ہیں یہ حالت دیکھ کر لے تولوں ہوتے ہیں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر  
 ایسی باتوں سے وہ کا فر بدگماں ہو جائے گا



ہم کو دعویٰ ابتدا میں تھا بہت کچھ عیش کا      عمر بھر الفت بنا بیٹھنے پہ اپنا قصہ رٹھکا  
آنکھ جب بس سے لڑی سب حوصلہ جاتا رہا      دل کو ہم صرف وفا سمجھتے تھے کیا معلوم تھا

یعنی یہ پہلے ہی نذر امتحان ہو جائے گا

تیری مرضی سے ہو وابستہ زمانے کی ضیا      اُس سے دُنیا پھر گئی تو جس سے ناخوشی گیا  
تو نے چاہا جس کو مقبول دو عالم کر دیا      سب کے دل میں ہی جگہ تیری جو تو راضی ہوا

مجھ پہ گویا اک زمانہ ہر ماں ہو جائے گا

ہی جو مجھ کو فرط غم میں لیں ہی خوں لڑنے کا ضبط      اور گھٹنے میں ہا یوں ہی جگر اور دل کو ربط  
ایک دن ہو جائینگے دونوں کے دونوں موجود      گر نگاہ گرم فرماتی رہی تسلیم ضبط

شعلہ خس میں جیسے خوں لگ میں نہاں ہو جائے گا

دیکھ کر نالاں مجھے مرغِ چمن میں نوہ گر      میری حالت پر کٹ افسوس ہیں برگِ شجر  
ہو جائیں چاک چاک اس غم سے چنچوں کے جگر      بلغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر

ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں نشاں ہو جائے گا

منتظر میں بھی ہوں فردائے قیامت آئے تو      اپنی اپنی داد اسی دن پائیں گے انصاف جو  
اک بڑی امید پر جھیلا ہی تیرے ظلم کو      دوائے گرہِ نیراترا انصاف بخشیں نہ ہو

اب تک تو یہ توقع تھی کہ وہاں ہو جائے گا

یاد رکھ سننے کے قابل پسند مرزا ہی آسند ہوش میں آکھیا ہوا دل کس کو دیتا ہی آسند  
 مبتلا اک طفل پر ہونا کچھ اچھا ہی آسند فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہی آسند  
 دوستی ناداں کی ہی جی کا زیاں ہو جائیگا

(۱۶)

یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا کم مرض ہی مگر ذرا نہ ہوا  
 مجھ پر احساں طیب کا نہ ہوا درد منت کش دوا نہ ہوا  
 میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

ہو گئے رُسوا تمھیں کہا مانو بات بڑھ جائے گی بہت پس تو  
 چل کے سن لو الگ جھوٹے ہو جمع کرتے ہو کیوں قیوں کو  
 اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

اور تجھ سائیں کہاں سے لائیں حسرتِ دل کی خاکس سے پائیں  
 کس کے ہاتھوں سے زخمِ دل بکھائیں ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں  
 تو ہی جب خنجر آزمانہ ہوا

سخن تلخ کب ہوا ان کے قریب ان سے باتیں سننے کیسے نصیب  
 ہوا حلاوت ہی کچھ سخن میں عجیب کتنے شیریں ہیں یہی لبِ نصیب

گالیاں کھائے بے مزا نہ ہوا  
 جب سینہ من بھی اُن کے لانے کی استطاعت تھی گھر جانے کی  
 اب جو بدلی ہو اُزمانے کی ہی خبر گرم اُن کے آنے کی  
 آج ہی گھر میں پوریا نہ ہوا  
 جان طاعت ہی میں کھائی تھی کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی  
 سر تھا سجدہ تھا جبہ سائی تھی کیا وہ نمرود کی خدا فی تھی  
 بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

قابلِ فخر کیا ہوا بات اپنی عین احساں ہو اس کی خوشنوی  
 ہم نے اس پر نثار کیا شو کی جان دی دی ہوئی ہی کی تھی  
 حق تو یہ ہو کہ حق ادا نہ ہوا  
 غم سے خالی نہ کوئی دم گزرا کیا ٹھکانا ہی کم نصیبی کا  
 کچھ نہ کچھ سلسلہ لگا ہی رہا زخم گردب گیا لہو نہ بھٹکا  
 کام گر رک گیا روا نہ ہوا

دعویٰ دوستی زبانی ہو دل میں تو دشمنی کی ٹھانی ہو  
 قہر ہو یا یہ مہربانی ہو رہزنی ہو کہ دستانی ہو

سب کے دل دلتاں وانہ ہوا

مثل حریرا مصروہ رہتے ہیں جی میں گھٹ گھٹے پھوٹ بہتے ہیں  
سب غم انتہا رہتے ہیں کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں

اج غالب غزل سرانہ ہوا

(۱۸)

یہی ہمیشہ نشیمن رہا تمنا کا رانا تو در داسی میں تمام دنیا کا  
مگر اب اسے درکار پہن صحرا کا گلہ ای شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا

گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

ترا خیال و تصور جو دل کو ہی محبوب اسی سے نامہ نویسی کا شغل ہی مرغوب  
مجھے امید کرم اور تجھ سے ہو کیا خوب یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب

مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا

نہ ہو گئے گل بوش روزگار اگر ہی یہی پسے گا زیر قدم سبزہ زار اگر ہی یہی  
لے گا دہر کا نقش دنگار اگر ہی یہی خانے پائے خزاں ہی بہار اگر ہی یہی

دوام کلفت خاطر ہی عیش دنیا کا

ہنسی کا خاک سلیقہ نہیں کسی گل کو کہیں پیسیر و متا شانہ رنج افزا ہو

چمن کا قصد ہو یا روتو تجھ کو ساتھ نہ لو غم فراق میں تجلیفِ سیرِ باغِ ندو  
 مجھے دماغ نہیں خندہ لائے بیجا کا  
 مثال آنسو حیرت زدہ سراپا ہوں اُمید وار تجلی روح افزا ہوں  
 رہن شوق ہوں سرنا بپا تمنا ہوں ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں  
 کرے ہی ہر بن مو کا مچشمِ بینا کا  
 اب اور کیا ہو کہ انداز اُس سنگمر کے دمِ فطارہ طلبگار جس کے ہیں ہم سے  
 اشارہ جان کا ہو گا تو یہ بھی دیدنی کے دل اس کو پہلے ہی ناز واداسے بے بیچھے  
 ہیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا  
 مرے سرشک کا انداز سخت مشکل ہو کہ قطرہ قطرہ میں پوشیدہ بحرِ کمال ہو  
 حساب کا کوئی دعوے کرے تو باطل ہو نہ کہہ کہ گریہ بہ اندازِ حسرتِ دل ہو  
 مری نگاہ میں ہو جمعِ خجِ دریا کا  
 ستم جو اس کے اٹھاتا ہوں لہوِ شاد ہو نہیں کسی سے طلبگارِ عدل واداسہ  
 نہ مجھے اس کو نہ مرزا سے ہو عناد اسد فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں کس کو یاد اسد  
 جہاں میں اس کی ہو انداز کا فرما کا

(۱۹)

اس نے جب خست پئے قطع منازل باندھا      چھپرے ناقہ مرے گھر کے مقابل باندھا  
میں نے بھی عہدِ سفر دہرے کامل باندھا      جب بتقریب ہر قریب نے محل باندھا  
پیشِ شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا  
قتل کر دینے میں عشوہ تھا بڑا وستِ راز      بانی قتل کر شتمہ تھا نگہ تھی غماز  
دیکھ کر آئندہ جب ہو گئے قال انداز      اہل بنشیں نے ہجرت کدہ شوخی ناز  
جو ہر آئندہ کو طوطی بسمل باندھا

منہ ہی جس کا نہ کبھی عرضِ تمنا میں کھلا      اس کو حراماں کے سوا اور یہاں کیا ملتا  
کام کچھ سہل نہیں تھا طلبِ مقصد کا      یاس و اُمید نے اک عہدہ میاں مانگا  
عجزِ ہمت نے طلسمِ دل سائل باندھا  
اس بیاباں میں ہی حیرانِ دل محزونِ غالب      حالِ ہرزہ انجوس میں دگرگوں غالب  
ہو گیا فکرِ مضامین میں جگرِ غوں غالب      نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضمونِ غالب  
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

(۲۰)

اگر میں صورتِ قہر نہ دریا سے جدا ہوتا      تو کیوں پریش قصہ بحثِ ہمتِ نیست کا ہوتا

مگر ہاں نفی سے اثبات پیدا ہوتا نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا  
ڈوبیا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

دل بیمار تو فکرِ وفا میں گھس گیا اپنا جگر باقی رہا تھا اس کو ورغش لے کھایا  
جھکا بارِ الم سے فرق یوں پہرے نہیں اٹھتا ہوا جب غم سے یوں بچیں تو غم کیا بھر کے کھٹنے کا  
نہ ہوتا اگر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

اُسی کی یاد میں آٹھوں پہر دل تملتا ہے تصور اس کا ہر زلالتِ دل کو دکھانا ہے  
خیال اس کا بھلا کچھ طرغٹیں سے جاتا ہے ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے  
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں آتا تو کیا ہوتا



کب کوئی باعثِ خونباری مرگاں سمجھا کب کوئی علتِ آہِ شرر افشاں سمجھا (۴۱)  
کوئی غمخوار نہ حالِ دلِ نالاں سمجھا وہ مری چینِ جبین سے غم نہہاں سمجھا  
رازِ مکتوب بہ بے بڑی عنوان سمجھا

لوٹ دینا سے مکدر ہی مرا سینہ ہنوز دل میں باقی ہے ابھی کلفتِ بیرینہ ہنوز  
خاک بھی شکلِ صفائی نظر آئی نہ ہنوز یکا لٹ پیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز  
چاک کرتا ہوں میں جس دن سے گریباں سمجھا

حزن و اندوہ میں نا چاری خاطر مت پوچھ      زیست باعث بیزاری خاطر مت پوچھ

حال دشواری و بیماری خاطر مت پوچھ      شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ

اس قدر تنگ ہو ا دل کہ میں ندائ سمجھا

کب میں طور ہی وہ جلوہ منا ہو سر بام      کب گو ارا ہو کہ وہ رخ ہو نظر گاہ عوام

چاہتا ہوں ہے مستور وہ شوخ خود کام      بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرم خدام

رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدہ حیراں سمجھا

چھیڑ کر غیر نے اُس کو جو غضب ناک کیا      آگ ہو کر صفت شعلہ آتش بھڑکا

باعث طیش تو اغیار کا سفلہ پن تھا      عجز سے میں نے یہ جانا کہ وہ بد خو ہوگا

نہن جس سے تپش شعلہ سوزاں سمجھا

قطع منزل کے لیے میں نے کمر تو باندھی      پر نقاہت نے اجارت پہے رفتار نہ دی

نوبت آئی نہ تھی دو ایک قدم چلنے کی      سفر عشق میں کی ضعف نے رحلت طلبی

ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

کوئی پہلو بھی تو نہ پہننے کا نہیں تھا دم مرگ      نشتر آخر رگ جاں نے وہی کھایا دم مرگ

پیش آیا وہی نقدیر کا لکھا دم مرگ      تھا گریزاں مژدہ بار سے دل تا دم مرگ

دفع پیکان قضا اس قدر آساں سمجھا



یوں تو تم بھی اُسے کہتے تھے جفا کار اُسے پھر بھی مرزائے کیا تھا تمہیں ہشیار اُسے  
کیوں تھے دیدہ و دانستہ گرفتار اُسے دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اُسے  
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلمان سمجھا

(۲۲)

پھر مجھے یار کا دریا د آیا اپنا پھوٹا ہوا سر یا د آیا  
پھر وہی خونِ جگر یا د آیا پھر مجھے دیدہ تر یا د آیا  
دل جگر تشنہ فریا د آیا

تھا ترا ہجر عذابِ جانسوز لفظِ نصرت تھا سانِ دل و دوز  
پھر نصیبوں نے دکھایا یہ دوز دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز

پھر ترا وقتِ سفر یا د آیا

جب ملا آنکھ پھر الی اپنی نظرِ لطف کسی دن نہ ہوئی  
کی نہ اک و زتنافل میں کمی سا د گیہاے تمنائیں

پھر وہ نیرنگِ نظر یا د آیا

کیوں نہ فریا د مجھے ہو مشکل آئے منہ میں ہی سینہ گھائل  
میں کہاں آہ و فغاں کا قابل عذر و اماندگی اے حسرتِ دل

آلہ کرتا تھا جگر یاد آیا

جستجو گرنہ تری کی جاتی پھیبیت ہی نہ جھیلی جاتی

ہاں کیوں مفت میں اپنی جاتی زندگی یوں بھی گزری جاتی

کیوں ترارہ گزری یاد آیا

مانتا ہوں وہ جگہ ہو اچھی ہیں ہاں عیش کسمان سبھی

کیا کروں گا جو طبیعت نہ لگی کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی

گھر ترا خلد میں گریا د آیا

اب کہاں ضحکے یا رائے نفاں آہ کی تابش نالوں کی توں

جی لرزتا ہو جھٹتی ہو زباں آہ وہ جرات فریاد کہاں

دل سے تنگ کے جگر یاد آیا

دل میں رہ کے جو آتا ہو خیال کیا بلا دیکھیے لاتا ہو خیال

پھر مجھے غم میں پھنسا تا ہو خیال پھر ترے کوچہ کو جاتا ہو خیال

دل گم گشتہ مگر یاد آیا

خاک ابھی ہیں نے کہاں چھانی ہو دل ٹھکرتا ہو پریشانی ہو

فرط ہیبت سے جگر پانی ہو کوئی ویرانی سی ویرانی ہو

دشت کو دیکھ کے گھریا د آیا

قدر مسکن کی ابھی جانی ہو یہی اس میں بھی پریشانی ہو  
یہ ہمیش وہ لاشانی ہو کوئی ویرانی سی ویرانی ہو

دشت کو دیکھ کے گھریا د آیا

قائل اس کا ہی ہر انسان شاید کہ بدی کی ہو محافات بھی بد  
جرم ہونے کو تھا ہر زائستہ میں نے مجنوں پہ لکھیں ہیں اسد  
سنگ اٹھا یا تھا کہ سر یا د آیا



(۲۳)

آپ کے ساتھ کوئی دشمن بے پیر بھی تھا  
دیر کرنے میں کوئی مائل تدبیر بھی تھا  
سست رفتار کوئی از رو تو بے پیر بھی تھا  
ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا  
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم نے جو کام کیا غیر مشیت نہ کیا  
دوں جو تنہا تمہیں الزام تو ہی میری خطا  
تھا مقدر جو مرے واسطے ہونا وہ ہوا  
تم سے بیجا ہی مجھے اپنی تیاہی کا گلا  
اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا

شاہد حال ہی ہر چہند مرا حال زبوں  
سخت حیران ہوں کہ کیونکر تجھے آگاہ کروں

کچھ خبر بھی ہو کہ میں عاشقِ دیرینہ ہوں تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں  
کبھی فراق میں تیرے کوئی پنچیر بھی تھا

مجھ سے کہتا ہو کہ تو کون ہو کیا بتلا دوں عاشقِ زار ہوں کیا اس کے سوا بتلا دوں  
نہ رہا ہوں جو تجھے یاد تو آبتلا دوں تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں  
کبھی فراق میں تیرے کوئی پنچیر بھی تھا

حد سے گزری ہوئی مٹی چاہہ گروں کی بیڈ بھول کر بھی تو نہ لب پر کبھی لایا فریاد  
دل پریشاں ہوں میں بھی تو رہا خورم و شاد قید میں بھی تھے وحشی کو رہی لفت کی یاد  
ہاں کچھ اک رنج گرا نبا رہی زنجیر بھی تھا

محلِ یار میں اللہ کے اس کا عہد حق تو یہ ہو کہ بڑے بول کا سر ہو نیچا  
خوش ہوں اس سے کہ اگر کچھ تو ہوا آہوں کا دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا  
نالہ کرتا تھا ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

وصلِ شیریں سے وہ گو ہو نہ سکا شیریں کام کر گیا کام تو ایسا کہ رہا نام نہ ام  
کہتے ہیں سنگتراشی کو جو آپ ادے کام پیشے میں عیب نہیں کہتے نہ فرما دو نام

ہم ہی آشفۃ سروں میں نہ جو انیر بھی تھا

سینہ زانو سے جو اس نے نہ دبا یا نہ سہی خنجر تیز گلے پر نہ چلا یا نہ سہی

ہاتھ تمشیر کا بڑھ کر نہ لگا یا نہ سہی ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی

آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

ہم پہ فائق جو سمجھتے تھے کبھی اپنا حق ان کو یہ تحفہ نویسی کا ملا کیسا حق

ان کی تحریر کو کیوں مانیے سرتا پا حق پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے کھچے پر ناحق

آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

رکھتے تھے دیدہ ویدار طلب شوق لقا پھر جو دیکھا تو سنھے دید کا یار ہی تھا

جلوہ دیکھا بھی مگر دل کا نہ ارماں نکلا بجلی اک کو نہ گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا

دی جو شبیہ سے مہر و رخشاں سے کبھی آگ غصے سے ہوا چہرے کی رنگت بدلی

اس کی تمثیل ہی گویا کوئی دنیا میں نہ تھی یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی

گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

انخاری سے توجہ چاہو وہ کہلو غالب تم پہ دیکھا نہیں مہر زانے کسی کو غالب

کوئی دعوے سے ذرا آگے کہے تو غالب ریتختے کے تھیں استاد نہیں ہو غالب

کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

(۲۳)

دنیا میں کبھی کیا کوئی دل بر نہ ہوا تھا      بکیش و جفا پیشہ و کافر نہ ہوا تھا  
سفاک مگر تیرے برابر نہ ہوا تھا      تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا

اور وہ یہ ہو وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

قدرت جو لگی اور حسینوں کو بنانے      اُس کا کوئی ہمتا ہو نہ چاہا یہ خدانے  
پانی نہ تھی تکمیل ابھی نور و ضیائے      چھوڑا نہ نخب کی طرح دستِ تھانے  
خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

کم فخر میں سے نہیں کچھ اشک ہمارے      آئینہ ہوئے ہوتے تو گوہر یہی بنتے  
ہر مادہ تو ایک ہی ایجاد میں ان کے      توفیق بہ اندازہ ہمت ہر ازل سے  
آنکھوں میں ہو وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

ابرو سے عیاں خیرِ خوار کا عالم      مست آنکھ مگر فتنہ بیدار کا عالم  
ہو جس سے بپا حشر وہ رفتار کا عالم      جب تباہ کنہ دیکھا تھا قہر کا عالم  
میں معتقِ فتنہ محشر نہ ہوا تھا

قسمت یہ کہاں تھی کہ کبیدہ اسے دیکھوں      آنکھوں سے ٹپوں پاؤں غلام کے مزے لوں  
برسوں سے تمنا تھی کہ روٹھے تو مناؤں      میں سادہ دل از روگی یا اسے خوش ہوں

یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تھا

لکھنے میں فرشتوں نے سمندر کو کیا خشک  
اک لمحہ مسلم کو کبھی ہونے نہ دیا خشک  
عاصی ہوں میں ایسا کہ قدم رکھتے ہی تھا خشک  
دریا، معاصی، تنگابی سے ہوا خشک

میر اسرارِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کیا سوز نہاں پر کسی آتش کو ہو تفصیل  
جو اس سے فوائد تھے نہیں قابل تفصیل  
سینہ تھا مرا درہم و دینار کی زنجیل  
جاری تھی اس دروغِ جگر سے مری تحصیل  
آتش کدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

۲۵

میں کب فدائے خنجرِ قاتل نہیں رہا  
کب تیغِ ناز نہ یار کا بسمل نہیں رہا  
لیکن وہ ضبط اب مجھے حاصل نہیں رہا  
عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا  
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

دل میں بھرنے ہیں لاکھ غم اس کے دیئے ہوئے  
پوچھو نہ سرگزشت کہ لب ہیں سیئے ہوئے  
آیا تھا میں بقا کا ہتھیہ کیئے ہوئے  
جانا ہوں داغِ حسرت ہستی لیے ہوئے  
ہوں شمعِ کشتہ درخویرِ محفل نہیں رہا

دشمن تھے اس کے سامنے سینہ سپر کہ میں  
پھرتے تھے ہاتھ پر وہ لیے اپنا سر کہ میں

اب غیر ہیں کہ جن سے پھری ہو نظر کہیں مرنے کی اور دل اور ہی تدبیر کر کہیں

شایان دست بازوے قاتل نہیں رہا

یکساں گداؤ شاہ سے یہاں ساز و باز ہو محمودِ عنصرِ نوری کے برابر ایاز ہو

دل صاف ہو کسی سے نہیں احتراز ہو برہ و سس شش جہت در آئند باز ہو

یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

جب سے کھلا ہوا ہو تصور میں ناب حسن پیش نظر ہو آٹھ پہر آفتاب حسن

اٹھا ہو درمیان سے گویا حجاب حسن واکر ویئے ہیں شوق نے بندِ لقا حسن

غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

تھا صبح و شام و پے کیس چرخِ کج مدار تھا غم سے وقف در و خوش سینہ تھا و گار

دل تھا ہزار کاوشِ حراماں سے بیقرار گو میں رہا رہا بہنِ ستمہائے روزگار

لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

خوننا بہ جگر سے سدا مثلِ باغباں ہم سینچتے رہے چمنِ الفتِ بتاں

دیکھا مال کو تو تر و تھار اے گاں دل سے ہولے کشتِ فامٹ گئی گواں

حاصلِ سولے حسرت حاصل نہیں رہا

یہ تیغِ آرمائے تو حاضر ہو سراسر کھینچے یہ تیرا گر تو ہو سینہ سپر اسر



مرزا ہوں کھیل جاؤں گیس جان پر ہند      بیدار عشق سے نہیں ڈرتا مگر اس  
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں با



جس کو ہم سمجھتے تھے یار مہرباں اپنا      ہو گیا وہی دشمن آہ ناگہاں اپنا  
ہم نے اپنے ہاتھوں سے کر لیا زیاں اپنا      ذکر اُس پر یوش کا اور پھر سیاں اپنا  
بن گیا قیبِ خرتھا جو راز داں اپنا  
ان کو تھی ہوسنا کی بکشی میں تھی کب      پیتے تھے جو میے ساتھ کرتے تھے فقط تراب  
ضد ہی کچھ سر محفل ان کو چڑھ گئی بیہب      محو وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب  
آج ہی ہوا منطو ران کو امتحاں اپنا  
حالِ اضطرابِ دل کچھ اُسے دکھا سکتے      نالہ کے ذریعہ سے دکھا اُسے سنا سکتے  
لطف اس کے جلوے کا دم بہ دم اُٹھا سکتے      منظر اک بلندی پر اور ہم ہٹا سکتے  
عرش سے اُدھر ہوتا کانٹے کے مکاں اپنا  
بستر اُس کے کوچے میں اک طرف جا لینگے      جو کڑی پڑے گی اشق سے اٹھا لینگے  
اب تو اس سے ملنے کی راہ کچھ نکالیں گے      دے وہ جس قدر دولت ہم ہمیشی میں لینگے  
بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

دل میں ہو کہ ملنے کی خود ہی اُن سے ٹھہراؤں      سلسلہ کتابت کا درمیاں سے اُٹھواؤں  
نامہ بر سے کیا ہو گا خود ہی ان کو سمجھاؤں      در و دل لکھوں کب تک جاؤں انکو دکھلاؤں  
انگلیاں نکھارا اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

ہو گیا ہوں جب عادی آستان کے سجدوں کا      پھر بھی تو ہیں آخر ہوں گائیں جہیں فرسا  
پڑ پڑ جرات اور ن سجدے میں یہاں کرتا      گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا  
ننگ سجدہ سے میرے ننگ آستان اپنا

لاکھ اس کی محفل میں غیر کی رسائی ہو      اب کسی بُرائی میں لب ذرا ہلائے تو  
اس کے منہ سے کہلایا ہم کو کہنا تھا جو جو      ناکرے نہ غمازی کر لیا ہو دشمن کو  
دوست کی شکایت ہیں ہم نے ہنریاں اپنا

روز کے ستانے سے کر دیا ہو تنگ اس نے      حد سے اب تو اسی ہر ترابڑھ گئے ستم اس کے  
کہتے ہیں عداوت ہی اس کو ہر ہنرور سے      ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں کتنا تھے  
بے سبب ہوا غالب دشمن آسمان اپنا



ظلم پر وہ عذر و حجت لائیں کیا      غیر تاویل غلط نہ مائیں کیا  
چھوڑ کر ایذا دہی شرمائیں کیا      جو سے باز آئے پر باز آئیں کیا

کہتے ہیں ہم تجھ کو سُنہ دکھلا میں کیا

جو مقرر ہو وہ ہو گا بے گساں پھر ہوں کیوں مصروفِ سعیِ راگساں

ہیں اُمیدیں بھی جو قائم ہو جہاں رات دن گردش میں ہیں سلتِ آساں

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبراہٹیں کیا

صاف یوں بھی تو نہیں کہتے کہ جاؤ اور نہ یہ مژدہ سُناتے ہیں کہ آؤ

وجہ تو اس بے نیازی کی بتاؤ لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ

جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوسا کھائیں کیا

جب چلا قاصد تو ہم تھے ساتھ ساتھ تا ویرِ جانا نہ پہونچے ساتھ ساتھ

کب گئے تھے اس سے پہلے ساتھ ساتھ ہوئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ

یارب اپنے خط کو ہم پہونچائیں کیا

اس کے در پر ہم جو ہیں بسترِ جمائے قتل کے در پر ہیں سب اپنے پر اے

جس کو ہمت ہو اٹھانے کی وہ آئے موجِ خوں سر سے گز رہی کیوں نہ چلے

آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

شوق ہی میں ہو گئی ہستیِ تباہ جیتے جی دیکھی نہ اُس کی جلوہ گاہ

مرے ہم موت کی حسرت میں آہ عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ

مر گئے پر دیکھیے دکھ میں کیا

یا تو خط لکھتے تھے ہم کو پڑی پڑی      یا تناقل سے کیا قصہ ہی طو  
ہی تجاہل اُن کا مرزا طرفہ شی      پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے  
کوئی مبتلا دو کہ ہم مبتلا میں کیا

۲۸

شرط ہے اُس کا ذرا جلوہ نما ہو جانا      پھر تو آساں ہی تجھے مجھ لیتا ہو جانا  
راحتِ جزو نہیں کل سے جدا ہو جانا      عشرتِ قطرہ ہی دریا میں فنا ہو جانا  
درد کا حد سے گزرنا ہی دوا ہو جانا

یا تو تھا مجھ سے محبت میں کبھی عہداید      اب ہی کس تفرقہ انداز کے باعث اُدو کہ  
ہو گیا ایک ہی چمکی میں محبت کا رو      تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفل ابجد  
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

ہوتی تھی اس کے لئے فکرِ نئی صبحِ بنام      نہ ہوئیِ واشدگی اور نہ ہوا کچھ آرام  
بسکہ درمانِ مخالف سے فنا تھا انجام      دل ہوا کشمکشِ چارہِ رحمت میں تمام  
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا دوا ہو جانا

جب تک ہم سے تعلق تھا اور اس طرح کی اہ      چھیڑا اٹھا پاس کیے اور ظلم کیے خاطر خواہ

دفعتا پھر کئے کیوں آپ بتائیں تو گناہ اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ

اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

خونِ اک آتشِ سیال مرے دل میں تھا پانی ہو کر دم گر یہ جو فخرہ پر آیا

خاک بھی تن میں بجز عنصرِ خاکی نہ رہا ضعف سے گر یہ مبدل بہ دم سر ہو

باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

جلوہ گر ان میں تصور سے ہو تیری مثال مردمِ چشم کا آنکھوں سے نکلنا ہو محال

جی میں جو بات کبھی و تبیحے کس طرح نکال دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال

ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

اپنی ہستی کو سر بزم جو کرتی ہو فنا شمع نے مجھ سے دم گر یہ یہ گھلنا سیکھا

بیخ کن ہو مرا گر یہ ہی مری ہستی کا ہو مجھے ابر بہاری کا برس کر گھلنا

روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

سبزہ رکھتا ہی ترے پاؤں کے بجسے کئی نس گل کو بازار میں لانی تیرے جلو سے کی ہو س

تجھ تک کس کو نہیں اٹکے پہونچنے کی ہو س گر نہیں نبھت گل کو ترے کوچے کی ہو س

کیوں ہو گر و روہِ جولانِ صبا ہو جانا

جن کو رہتی ہو صفائی کی تمنا ہریل خواہشِ تصفیۂ قلب ہیں وہ ہیں بے کل

کر کے رہتا ہی ہر اک رنگ میں قہر اعلیٰ تاکہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوا سے صیقل

دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

قابل دید ہی ہر ذرہ یہاں کا غالب کیوں نہ پھر کیجیے نظارہ دنیا غالب

متفق تم سے ہی اس قول میں مرزا غالب بخشے ہی جلوہ گل ذوق تماشا غالب

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں ہو جانا

﴿۷۹﴾

پھر گلوں کا باغ میں منظر کھلا سبز سبز اوراق کا دفتر کھلا

یہ بہار اور ظلم یہ مجھ پر کھلا کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا

کاشکے ہوتا نفس کا در کھلا

ہم ہیں اس دھن میں کہ وہ خود ہی بگا کون جا کر بے طلب نعت اٹھائے

جائیں جاتے ہیں اگر اپنے پرائے ہم پچاریں اور کھلے یوں کون جائے

یار کا دروازہ پائیں گھر کھلا

ان کو ہو دشمن کی یاری پر گھمنڈ دوستی پر جاں نثاری پر گھمنڈ

اُس کو اپنی ہوشیاری پر گھمنڈ ہم کو ہی اس راز داری پر گھمنڈ

دوست کا ہو راز دشمن پر کھلا

داغ کھا کر دل ہوا تھا باغ باغ      تھا مسطر اس گل ترے دماغ  
یہ اندھیرے گھر کا تھا روشن چراغ      واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ

زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

باز آیا ظلم سے کب وہ جواں      ناز سے اس کے ہی بل اک جہاں  
پھینک دی مڑگاں نے کب اپنی سناں      ہاتھ سے رکھ دی کب برو نے کہاں

کب کمر سے غم کے کی خنجر کھلا

خود ہی جب پھرتا ہی یہ گمراہ سا      پھر کسی کا خاک ہو گا رہنا  
خیراب یہ ساتھ ہو تو حرج کیا      مفت کا کس کو بڑا ہی بدرقہ

رہ روی میں پردہ رہا ہر کھلا

کب تک برسائے بارانِ اشک      چارہ کس کس کا کرے بارانِ اشک  
کیا جگر ٹھنڈا کرے بارانِ اشک      سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک

آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

ہو گیا جامِ مسرت جامِ مرگ      حور کا بازو بنی صمصامِ مرگ  
لگی صبحِ زندگانی شامِ مرگ      نامہ کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ

رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

اس سے بڑھ کر رند کیا ہو گا کوئی      ہو نہیں سکتا کبھی ایسا کوئی  
 اس کو کیا چھڑے گا ایمرِ خدا کوئی      دیکھو غالب سے گر اُبھھا کوئی  
 ہر ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

## روایت (ب)

(۳۰)

ہر مرے واسطے سامانِ بقا موجِ شراب      اس سے جیتا ہوں کہ ہر موجِ فزا موجِ شراب  
 ایک سیگ نہ تھی جلوہ نما موجِ شراب      پھر ہوا وقت کہ ہو بالکشا موجِ شراب  
 دے بڑے کو دلِ دستِ ثنا موجِ شراب  
 بنم رندانِ فدا رہنا ہو گلشن      بادہ نوشوں کی طرح جھومتے ہیں سرو و من  
 بخود دست ہیں مرغانِ گلستاں ہمہ تن      پوچھ مت وجہ سیہِ مستی اربابِ جن  
 سایہ تاک میں ہوتی ہو ہوا موجِ شراب  
 جو جسے مل گئی شاہانہ داغ اس کا ہو      تختِ شاہی کی پھر اس مست کو پردا کیا ہو  
 کون ہو اس کا شناور یہ عجب دریا ہو      جو ہو اغرقِ میِ تختِ رسا رکھتا ہو  
 سر سے گزرے پہ بھی ہر بالِ ہما موجِ شراب



خشک استجار کو بھی اس نے کیا بار آور دو رکھا ہو کہ لگیں سرو چراغاں میں شر  
ہوتی ہے اس کی ہو ابھی عجب اعجاز اثر ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہو اگر

موج ہستی کو کرے فیض ہو اموج شراب

موسم گل نے گلستاں میں کیا کیا جاو پھولے پڑتے ہیں مسرت سے گل خنداں و  
موج میں پھرتی ہو مستانہ گلوں کی خوشبو چار موج اٹھتی ہیں طوفان ہوا سے ہر سو

موج گل موج شفق موج صبا موج شراب

مکدے میں جو شرب روز ہیں سرگرم نیاز ان سے پوچھے کوئی شادابی گنزار کارا ز  
ہے یہ باران کی کرامت نہ ہو اکا اعجاز جس قدر روح بناتی ہے جگر تشنہ ناز

دے ہی تسکین بدم آب بقا موج شراب

اپنی حرمت میں یہ نکلی گل تر سے برتر رنگ پر اس کے قدا دل ہی تو صدفی جگر  
قوتِ نایبہ نام اس کا نہو اس کا اثر بسکہ ڈوٹے ہو رگ تاک میں خوں ہو ہو کر

شہپر رنگ سے ہو بالکشا موج شراب

جامِ جمشید کا ہمسرہ مرا جامِ سفال سامنے ہیں مری نظروں کے جہاں کے احوال  
کیوں نہ حاصل ہو مری فکر و خشاں کو کمال موج گل سے چراغاں ہو گزیر گاہ خیال

ہو تصور میں زمیں جلوہ نما موج شراب

آنکھ میں آتے ہی چڑھتی ہے یہ بالائے دماغ      موجزن دل میں ہے ہر وقت ٹٹائے دماغ  
 ہے جو مرغوب اسے منزلِ زیبائے دماغ      نشہ کے پرے میں ہے محوِ تماشا کے دماغ  
 بسکہ رکھتی ہے سر نشو و نما موجِ شراب

ہے عجب عالم نورانی کیفیتِ فصل      کیفیت کوئی نہیں ثانی کیفیتِ فصل  
 کیجئے کیوں نہ ثنا خوانی کیفیتِ فصل      ایک عالم پہ ہے طوفانی کیفیتِ فصل  
 موجِ سبزِ نو خیز سے تامل موجِ شراب

جس کو اس بزم میں ساقی نے دیا ساغرِ دل      اس کے سر میں نہاد ہم و خیالِ جزوِ کل  
 شایعِ فصلِ گلستاں ہے نوائے بلبل      شرحِ ہنگامہ ہستی ہے نہ موسمِ گل  
 رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشامیجِ شراب

شوقِ بادِ دلِ مرزا میں بھرا پھر سجد      بعدِ توبہ کے کہیں پھر نہ خطا ہو سرزد  
 فصلِ گلِ جوش پہ ہے ابر کی بھی آمد      ہوش اُٹتے ہیں مے جلوہ گل دیکھ استاد  
 پھر ہوا وقت کہ ہو بالکشا موجِ شراب

## روایت

(۳۱)

خار زار ایتو ہوا ہی گلشنِ بخارِ دوست      ہونے سبز سے صرف خزاں گلزارِ دوست  
چھپ گئی ہی تیرگی میں تابشِ انوارِ دوست      آمدِ خط سے ہوا ہی سروِ جو بازارِ دوست  
دو دوشِ کشتہ ہو شایدِ خطِ خسارِ دوست

آنکھ اٹھائے اُس کے نظارہ کو ہو کس جگر      کیا لڑا سکتا ہی کوئی برقی تاباں سے نظر  
لن ترفانی اس کو زیبا ہی کمالِ حسن پر      اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر  
کون لا سکتا ہی تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

سامنے ہو کر مرے گزرا کچھ اُن انداز سے      ہر قدم پر پامالی کے مرے میں نے لیتے  
کرویا سرِ تاباں اک دیدہ حیرانِ مجھے      خانہ ویراں سازی حیرتِ تماشا کیجئے  
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتہ رفتارِ دوست

غیر کے ساتھ ان کو دیکھوں یہ کہاں لیرا مجھے      پوچھنے آئے تو دکھلایا یہ نظارہ مجھے  
کچھ نظر آیا نہ مرنے کے سوا چارہ مجھے      عشق میں بیدارِ شکِ غیر نے مارا مجھے  
کشتہ دشمن ہوں آخر گر چہ تھا بیمارِ دوست

ہوا اگر ہر آن ہم پر اک نئی افشاں ہو      اپنا لب کب اُٹھائے شوہِ بیدار ہو

خوش ہو وہ زاری سے اور لذت کش فریاد ہو چشم مارو شن کہ اُس بیرون کا دل شاد ہو  
دیدہ پر خوں ہمارا ساغر سرشار دوست

## قطعہ

یہ فاقہ کی جو ٹھہرائی ہو اس نے ہجر میں چاہتا ہی دیکے دھوکا بھید کچھ لے ہجر میں  
اس بہانے سے غم و ایزد انکھٹے ہجر میں غیروں کرتا ہی پیش مجھے اُس کے ہجر میں  
بے تکلف دوست جیسے کوئی غمخوار دوست

ادعا یہ ہو کہ ہیں تابع مے جن و ملک مہر و مہ جو رو پری و آدمی ارض و فلک  
یوں بیاں کرتا ہی اس مغل کی باتیں بیدھڑک تاکہ میں جانوں کہ ہو اس کے رسائی و اس تک  
مجھ کو دیتا ہی پیام وعدہ دیدار دوست

میرے ہر اک زور کا ظالم لگاتا ہی سرخ اوریہ کہتا ہی کہ اب حال ہوا اس سفر غ  
کیا بتاؤں مجھ کو دکھلاتا ہی کیا کیا سبز باغ جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہ ضعف و ماغ  
سر کرے ہی وہ جاہل لطف عنبر بار دوست

باتوں باتوں میں لگا دیتا ہی دل میں بیشتر یاد دلواتا ہی باتیں یار کی آٹھوں پہر  
ہو تسلی و دلاسا سے جھنا مد نظر چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہی اگر  
ہنس کے کرتا ہی بیان شوخی گفتار دوست

دشمن اس کا مسئلہ آیا ستانے کے لئے دوست بن کر ظلم اس انداز سے اس کیجئے  
ہوں تجھ میں کچھ دونوں میں سے دیکھ کس نے دیئے مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے

یا بیاں کیجئے سپاس لذتِ آزارِ دوست

بات جو ہوتی ہے اچھی دل میں کہہ جاتی ہو آپ کی بھینچ کر سامع کا دل اپنی طرف لاتی ہو آپ

بلع مرزا دمیرم یہ کہہ کر اتر آئی ہو آپ یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہو آپ

ہو رویت شعر میں غائب زمیں تکرارِ دوست



## ردیف (د)

ناز کا لطف حبیبوں سے گیا میرے بعد (۳۶) دلربا عشوۂ دلکش نہ رہا میرے بعد

وہ کرشمہ نہ رہا ہو شرابا میرے بعد حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد

بارے آرام سے ہیں اہلِ جہان میرے بعد

شیوۂ غنچ و دلال آج جہاں سے اٹھا کام سے اپنے ہوا نازِ معطل گویا

اب کہاں ہو کوئی دل ان سے جو ہو عہدِ بڑا منصبِ فتنگی کے کوئی قابلِ نرہ

ہوئی معزولی اندازِ وا دا میرے بعد

اب کہاں ہو کوئی سر باز میسر مجھ سا تیز جس کے لیے کی جائے گی شمشیر قضا  
اب تو بیکار رہی خود جو ہر ذاتی اس کا درخور عرض نہیں جو ہر بیدار کو جا  
نگہ ناز ہی سرمہ سے خفا میرے بعد

یا کبھی ان کی پھر انگشت لہو میں تر تھی یا نظر آتی تھی پوروں پہ حنا کی سُرخ  
میری مرتے ہی صد افسوس تو بیت پنچي خوں ہو دل خاک میں احوال بتاں پنی  
ان کے ناخن ہوئے محتاج حایمے بعد

آج دُنیا سے اٹھی دستِ گریباں کی نزاع اب کبھی ایک جگہ ان کا نہ ہوگا اجماع  
رہنِ عشق سے محفوظ ہوئی دل کی متاع ہو جنوں ہل جنوں کے لیے آغوشِ وداع  
چاک ہوتا ہو گریباں سے جدائے بعد

و کدے بند ہوئے سرو ہوا گلخنِ عشق کون ایسا ہی کہ آباد کرے گلخنِ عشق  
ہو کوئی اب کہ ہوا سوارِ سر تو سن عشق کون ہوتا ہو حریت مئے مردِ افکنِ عشق  
ہو مگر رلب ساقی پہ سلا میرے بعد

بزمِ الفت ہو دھواں دھار تو حیرت کیا ہو کیا تعجب ہو جو اندھیر پہاں چھایا ہو  
مجھ سا پردانہ جانسوز کہاں پیدا ہو شمع بجھتی ہو تو اس سے دھواں ٹھٹھا ہو  
شعلہ عشق سیبہ پوش ہوا میرے بعد

موتوں روئے کی سرپیٹ کے حسرت میری کوئی بھی بات نہ پوچھے گا تمناؤں کی  
 بیکی ہوگی پس مرگ بعد پر چھپائی غم سے مڑا ہوں اتنا نہیں دنیا میں کوئی  
 کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

چھوٹ کر مجھے ہوا بیکیں و تنہا غالب ایسا وارفتہ کہاں اس کو ملے گا غالب  
 ہاتھ ملتا ہو جو افسوس سے مڑتا غالب اے ہو بیکی عشق پہ رونا غالب  
 کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد



## ردیف (ر)

(۳۳)

ہوئے ہیں سدرہ شوق در در و دیوار نہ اس کو روک سکیں گے مگر در و دیوار  
 کریں گے اور اسے تیز تر و در و دیوار بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار

نگاہ شوق کو ہیں بال و پیر در و دیوار

شبِ فراق میں رونے کی آگنی جو آئنگ توپل کی پل میں ہوا کچھ عجیب گھر کا ڈھنگ  
 ادھر ہی خشت کا انبار ادھر ہی تودہ سنگ و غور اشک نے کاشا نہ کا سب یہ رنگ  
 کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

خبر جو ہو کہ سرِ شام آئے گا وہ لنگار      تو سایہِ حد سے بڑھتا کہ ہو قدم پہ نثار  
چلا ہی جاتا ہو بڑھتا ہوا نہیں ہو قرار      نہیں ہو سایہ کہ سنکر نویدِ مقدم یار  
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

چڑھا دماغ میں کچھ نشہِ شباب ایسا      کہ گرم کر دیا بازارِ خود نمائی کا  
کسی سے اب تجھے مطلق حجاب بھی نہ رہا      ہوئی ہو اس قدر رزائی منے جلوہ  
کہ مست ہو تھے کوچے میں ہر در و دیوار

سدا جو جانبِ دیوار و در رہا نکتا      ہوا ہو آئینہ ہر سنگ و خشت حیرت کا  
کیئے ہیں کام مری چشمِ شوق نے کیا کیا      جو ہو تجھے سرِ سودا سے انتظار تو آ  
کہ ہیں دکانِ مستاعِ نظر در و دیوار

رہی ہمیشہ جو گردشِ ہی سایہ کو گھر کے      یہ شوق تھا کہ بلا میں یہ اس کے گھر کی لے  
نصیبِ خنہ مرے عمِ کدہ کے جاگ اُٹھے      وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں تو سایہ سے

ہوئے سدا در و دیوار پر در و دیوار

یہ آرزو ہو کہ اپنوں سے پائیں آزادی      یہ وفاق ان کی ہنہیں ہم کو وجہِ لٹاری  
پہل پہل سے پریشان ہیں دل سے فراہی      نظریں کھٹکے ہو بن تیرے گھر کی آبادی  
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار



ہمیشہ ضبط ہی گریہ کو کر لیا میں نے      اُمٹ کے اشک جو آئے ابھیں پائیں نے  
یہ عجز دیکھ کے گھر کو بچا دیا میں نے      ہجوم گریہ کا سامان کب کیا میں نے  
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

ہر ایک جزو ہو گھر کا سرور سے بیابا      ہر ایک ذرہ نظر آ رہا ہو مست خراب  
ہمارے اشک نے گویا اٹھادیئے ہیں حجاب      نہوچھہ بیخودی عیشِ مقدم سیلاب  
کہ ناچتے ہیں پڑے سرب در و دیوار

نہ کوئی دوست ہو مرنے والے میں      نہ راز داں ہو نہ ہو ہمیشہ زماں میں  
بھرے پڑے ہیں بہت اہل کین زماں میں      نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زماں میں  
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار



پایا نہ میرے گھر کو سنگ مر مر کہے بغیر      ڈھونڈا ہو گھر قریب کا کیونکر کہے بغیر  
بجھا مرا پتہ نہ مگر رکھے بغیر      گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر  
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

جب تک کہ دیکھتے تھے کہ ہو قدرتِ سخن      اک روز بھی تو مجھ کو نہ دی نصرتِ سخن  
پھیرا کبھی تو بولے نہیں فرصتِ سخن      کہتے ہیں جب ہی نہ مجھے طاقتِ سخن

جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

حرام نصیب کون ہی ہمسا جہان میں      بخلا نہ کوئی کام ہمارا جہان میں  
کس طرح دیکھیے ہو گزارا جہان میں      کام اس سے آپڑا ہو کہ جس کا جہان میں  
یوں نہ کوئی نام ستگر کہے بغیر

کیا کیا تمہارے ہاتھ سے ہوتے نہیں ستم      کیا کیا ہیں پہنچے نہیں تم سے رنج و غم  
لیکن جو ہو ذرا بھی شکایت تو لو قسم      جی میں ہی کچھ نہیں ہو ہمارے وگرنہ ہم  
سہر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

ابرو کو اس کی کہتے ہیں شمشیر خوش نیام      تیرا بل ہو اس نگہ جاں ستاں کا نام  
ہوتا ہو مراد کے بیاں میں اک انتظام      مقصد ہو ناز و غمزہ وے گفتگو میں کام  
چلتا نہیں ہو دشمنہ و خفہ کہے بغیر

بہتر سمجھتا ہو کوئی پتھر کو پوجنا      مذہب کسی کا مہر منور کو پوجنا  
ایمان عاشقوں کا ہو دلیر کو پوجنا      چھوڑوں گا میں اس بت کافر کو پوجنا  
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

ہوتا نہ کس طرح سے فرائے خم پیو      دکھلا رہا تھا عالم مستی مقام ہو  
پیش نظر خدا ہو جو ساقی ہو روبرو      ہر چند ہو مشاہد حق کی گفتگو

بستی نہیں ہی شیشہ و ساغر کہے بغیر

رکھتا ہوں پاس اس لیے کاغذِ قلم و دوات  
تھرپستے ہوتا بسہولت ہر ایک بات  
مکن ہی کوئی دن کہے سمجھوں میں سکورات  
بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہوا التفات  
سُننا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

ہر زمانے کچھ کیا جو کبھی حالِ نازِ عرض  
انجام یہ ہوا کہ ہوئی ناگوارِ عرض  
یوں ہی نہ ہو کہیں دلِ نازکِ پارِ عرض  
غالب نہ کر حضور میں تو بار بارِ عرض  
ظاہر ہی تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

﴿۳۴﴾

اس بامِ پر تجلی افوار دیکھ کر  
جیراں ہوں اپنے آپ کو ہتیار دیکھ کر  
بھپکی نہ آنکھ برقِ شرر بار دیکھ کر  
کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر  
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

رکھتی ہو رات دن تپشِ دلِ تپاں نے مجھے  
تابِ سکوں ہی برق کی صورت کہاں مجھے  
کرنا نہ آیا سو زحمت نہاں نے مجھے  
آتشِ پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے  
سرگرمِ ناہائے شرر بار دیکھ کر  
ظلم و ستم کا وقت ہی کوئی نہ جوہر کا  
اک کھیل ہو گیا کہ جب لٹھے ستار لیا

دل اب تو کام سے ہی محبت کے کانپنا      کیا آبرو سے عشق جہاں عام ہو جانا  
 رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر  
 نوبت نہ آئی تھی کہ گلے پر مے چلے      چلنے سے اس کے پہلے ہی مرنا پڑا مجھے  
 یہ اور بوسے لے مے قاتل کے ہاتھ سے      آتا ہی میرے قتل کو پر جوش رشک سے  
 مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر  
 مستی نے تیری کھودیا بصیرت سکونِ خلق      ہو لغزشِ خرام سے زخمی درونِ خلق  
 شیشہ ہوا ہی باعثِ حالِ زیونِ خلق      ثابت ہوا ہی گردنِ مینا پہ خونِ خلق  
 لرزے ہو موجِ محو تری رفتار دیکھ کر  
 پڑتا ہو دمِ مری سر پر الم سے ہاتھ      مصروفِ سینہ کو بی ہی ہر وقت غم سے ہاتھ  
 قیمت کہاں وہ شہس کے ملا تا کریم ہاتھ      واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ  
 مجھ کو حبیبِ لذتِ آزار دیکھ کر  
 مضمون ہمارے تلے ہیں لعلِ یمن کے ساتھ      نسبت ہی حرفِ حرف کو درِ عدن کے ساتھ  
 یکتا ہو اس کو کوئی اگر قدر فن کے ساتھ      یک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ  
 لیکن عیارِ طبعِ خرد بیدار دیکھ کر  
 چلنے سے پیشتر تھے لازم ہی دیکھ بھال      رستے کی اونچ نیچ سے چلنا نہ وہ بال

پرسنگ اہ میں بھی ہو غافل سفر محال      زنا ربانہ سبجہ صد دانہ توڑ ڈال

رہرو چلے ہو راہ کو ہوار دیکھ کر

دن رات خاک دشت کی یا پھانٹا تھا میں      پا کچھ دنوں سے نقش قدم بن رہا تھا میں

مثل شکستہ پاسروادی پڑا تھا میں      ان آبلوں سے پاؤں کے گھر گیا تھا میں

جی خوش ہوا ہو راہ کو پڑ خار دیکھ کر

اس درجہ بطنی ہو خدا جانے کیوں اُسے      ہر دم یہ وہم ہو کہ محبت ہو اور سے

کہتا ہوں ہنسکے مجھ کو ہری چگ اسی لیے      کیا بد گمان ہو مجھ سے کہ آئینہ میں مرے

طوطی کا عکس سمجھے ہو رنگار دیکھ کر

بہت بھٹائی ہوتی طلیکار نور پر      خاک سیہ پہاڑ ہوا کس قصور پر

یہ گرمیاں یہ غیظ اور اک لے شعور پر      گرنی تھی ہم پہ برف تبیلی نہ طور پر

دیتے ہیں یادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

دیکھا جو آستانہ تو آنکھوں میں پھر گیا      حرز اکابح و شام وہ سجدوں کا منہ

دبے جو پھر لو کے نظر آئے جا. جا      سر پھوڑنا وہ غالب آشفہ حال کا

یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

یہ سرگرمی ہوا حق میری بربادی کے سناں پر  
فضول اتنا ترس آیا جو اس گریبانِ تیراں پر

عنایت کی یہ کیوں مجھ زار کے حالِ تیشاں پر  
لرزتا ہوں مرادِ رحمت مہرِ ورخشاں پر

میں ہوں وہ قطرہ شبنم کہ ہوں غریباں پر

ہوئی گوشت کے ہاتوں زمانے بھر میں سوئی  
ہوا ہے ساز و سامانی پہ بھی سامانِ نیسانی

سیہ خانہ میں جب آئے کہ بھگتیں قید تنہائی  
نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی

سفیدی دیدہ یعقوب کی پھرتی ہونداں پر

جوں مانع ہوا استاد کا اسماں ٹھانے سے  
فراغت پا چکا روزِ ازل پڑھنے پڑھانے سے

رہا انکار عقلِ کل کو غیبِ برساتے سے  
فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُن مانے سے

کہ جنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ وبستاں پر

جگر میں خلیش ہرگز نہ رہتی نشترِ غم سے  
یہ ایذا میں نہ ہو تیں جہاںِ راحت کئے مے

کوئی دم جان کو مہلت تو ہوتی دردِ بہم سے  
فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے

بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دلِ نکلاں پر

جدا ہو نقشہٴ عالم سے حسن آباد کا نقشہ  
وہاں بیٹھا ہو سکے روزِ اول سے کرشمے کا

بہت فرمانِ جاری تھے مگر دیکھا تو یہ دیکھا  
نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ نازِ ایسا

کہ پشت چشم سے جس کے ہنوسے ہنر خواں پر  
 پریشانی کے عالم میں جودل بہلانے جاتا تھا  
 نظر آتا تھا مجھ کو تختہ گلزار گلشن سا  
 جلانا تھا مرے دل کو بھڑکنا آتش گل کا  
 مجھے اب دیکھ کہ ابرِ شفق آلودہ یاد آیا  
 کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستانِ یار  
 نہیں آنا نظر علت سے خالی صورت کا پھٹکنا  
 اُڑایا جائے گا آسودگانِ خاک کا خاکا  
 ملے جو خاک میں پھر انکی بربادی سے حال کیا  
 بجز پردانہ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہو گا  
 قیامت اک ہوئے تند ہو خاکِ شہیدان پر  
 نصیحت گر سے مرزا و جد کیا آخرِ خصومت کی  
 کہ پسندِ مشفقانہ ہو دلیل اس کی محبت کی  
 سرانگھوں پر ہر دور وی سے جو کچھ بھی نصیحت کی  
 نہ لڑنا صبح سے غالب کیا ہو اگر اس شدت کی  
 ہمارا ابھی تو آخرِ زور چلتا ہو گریباں پر

»»»

(۳۷)

ہیں مصطلحات ان کے جدا ان کی نیاں اور  
 الفاظ ہیں کچھ اور معانی و بیاں اور  
 ہر بات دو فصلی ہی نہیں اور ہواں اور  
 ہو بسکہ ہر کلام کے اشارے میں نشان اور  
 کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہو گماں اور  
 مدت سے ہو اظہارِ تمنا سے ملاقات  
 ہوں ان سے طبکارِ مصافات و مدارات

بنتی ہی نہیں بات یہ کیا بات ہو یہ بات      یارب نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات  
دے اور دل اُن کو جو نہ دے جھکوتاں اور

اس کے لب شیریں کے مقابل میں ہو کیا قند      ہو برق کہاں اور کہاں اُس کا شکر خند  
تنبیہ دیا کرتے ہیں اکثر جو خرد مند      ابرو سے ہو کیا اس نگہ ناز کو پیوند  
ہو تیر مقرر مگر اس کی ہو کہاں اور

انداز ہو نخوت کا وہی نفس دنی میں      وارفتہ یہ کجخت رہا کبر و منی میں  
سرگرم خودی کی ہے ہم بیخ کنی میں      ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں  
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہو سنگ گراں اور

سر پہ کبھی تازیت یہ الزام نہ لیں گے      بکتی ہوئی اشیا ہیں تو کیا بخل کرینگے  
مانگو گے اگر وزن سے ڈھونڈنے کے دینگے      تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے  
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل جاں اور

مانا کہ مری آنکھوں سے جاری ہوا سوتا      یوں آنسوؤں رونے سے تو دل خوش نہیں ہوتا  
ہاں خون کے سیلاب میں اپنے کو ڈبو تا      ہو خون جگر جوش میں دل کھول کے روتا  
ہوتے جو کئی دیدہ خوں نا بہ فشاں اور

کھائے جوئے زخم تو بسمل کوئے آئے      او کاش وہ پرے تن مجروح کے اڑوئے



یارب کہیں جلاد نہ تعمیل میں اُلتاے      مرنے والوں اس آواز پہ ہر چند سر اُٹاے  
جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کم ہاں اور

نالوں کے دھوئیں کا ہوشب تار میں نقشا      انجم میں ہو آہِ شرر افشاں کا تماشا  
ہوشلہ الفت سے زمانے میں اُجالا      لوگوں کو ہو خورشید جہاں تاب کا دھوکا  
ہر روز دکھاتا ہوں میں کدِ مرغِ نہاں اور

دلِ باختہ کو کب ہوتے سر کی قسم چین      پاتا ہو کہاں بستہ زنجیرِ الم چین  
دیتے ہیں کہاں مجھ کو شبِ روز کے غم چین      لیٹا نہ اگر دلِ ٹھٹھیں دیتا کوئی دم چین  
کرتا جو نہ مرنے کوئی دن آہ و فغاں اور

ٹھٹھتے نہیں رستہ جو ذرا پاتے ہیں نالے      بہتے ہوئے اشکوں کے چلے آتے ہیں نالے  
وہ جوش ہو دریا کو بھی شرماتے ہیں نالے      پاتے نہیں جب آہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے  
رکتی ہو مری طبع تو ہوتی ہو رواں اور

پہلے شعر اُکھتے تھے جو ہر بہت اچھے      تھے سیکڑوں ایک ایک بہت بہت اچھے  
مرزا کے بھی اشعار ہیں اکثر بہت اچھے      ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے  
کہتے ہیں کہ غالب کا ہوا اندازِ بیاں اور

(۲۸)

وقفہ جو یہاں مجھ کو ابھی تھا کوئی دن اور تم کو بھی مناسب تھا ٹھہرنا کوئی دن اور  
تم نے نہ مرا سا تھکنا ہا کوئی دن اور لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور  
تھکا گئے کیوں اب ہو تنہا کوئی دن اور

در پر ترے اس خاص غرض سے ہون ہیں بنا منظور ہو ہستی کا مجھے اپنی مٹانا  
ہو سخت اگر سنگ در اس کی نہیں پروا مٹ جائے گا سرگر ترا پتھر نہ گھسے گا  
ہوں در پر ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

بگڑے ہوئے آثار ہیں کیا بات بناؤں کچھ دھڑکے ہو تو بت دو کہ مناؤں  
اک بات ذرا سی ہو جو مانو تو بتاؤں آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں  
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

دیرینہ محبت کا کیا پاس نہ تم نے حیرت ہو کہ کس دل سے جدا ہوتے ہو مجھ سے  
باندھی ہو مگر ملکِ عام کے ہیں لداوے جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے  
کیا خوب، قیامت کا ہو گیا کوئی دن اور

کس فوق سے تھا محو تماشا ابھی عارف اس بزم سے کس واسطے اٹھا ابھی عارف  
کیوں ہو گیا پیوند زین کا ابھی عارف کیوں ای فلک پیر جو اس تھا ابھی عارف

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرنے کوئی دن اور

والدہ تمہیں گھر کے اُجالے کا سیب تھے چھایا ہوا اک اندھیر مری آنکھوں کے آگے  
کس خاک کے پردے میں ہے میری نظر سے تم ماو شب چاروہم تھے مرے گھر کے  
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

مانا کہ وہ آیا تھا فقط جان ہی لینے ممکن تھا کہ حیلہ سے اُسے مالتے رہتے  
کچھ بات بنا دیتے تو کیوں چھوڑتے ہم سے تم کون سے تھے ایسے کھرے دوست کے  
کر تا ملک الموت تعاضا کوئی دن اور

جلدی جو یہ کی جانے میں کیا جی میں سمائی جاتے ہوئے ہر ایک کیوں آنکھ پھرائی  
افسوس نہ اپنوں کی بھی الفت تمہیں آئی مجھ سے تمہیں نفرت سہی میرے لڑائی  
بچوں کا بھی دیکھا نہ مناشا کوئی دن اور

ناراض ہی تم تھے تو دل غمزدہ تھا خوش تم سامنے تو رہتے تھے ناخوش ہے یا خوش  
جب تم نہ رہے یہ تو کہو دل ہے کیا خوش گزری نہ بہر حال یہ مدت ناخوش و ناخوش  
کرنا تھا جو انہرگ گزارا کوئی دن اور

چوڑے گی ابھی جان کہاں رشتہ قالب مرزا ابھی سمجھے نہیں تم اس کے مطالب  
کیا زیت ہے ایسے کی جو ہو موت کا لب ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب

قسمت میں ہو مرنے کی ٹمنا کوئی دن او

✱

(۳۹)

اجابتوں پہ دعاؤں کی کیجیے کیا ناز نہ عجز اپنا ہوا کارگر نہ سوز و گداز

ازل میں بسکہ ہر اک شو کا ہو چکا ہو طراز حریف مطلب مشکل نہیں فسونِ نیا ز

دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خضر دراز

نظری جب نہیں پھر دوڑ دھوپ ہو بے سود ابھی ہی تجھ سے بہت دور منزل مقصود

ہر ایک ذرہ میں ہی نور ہستی مبعود نہ ہو ہر ذرہ بیاباں نور و ہم وجود

ہنوز تیرے قصور میں ہیں نشیب فراز

ہم آج تک تو رہے شکل و یدہ حیراں ہو انہ سامنے نظروں کے حسنِ یار عیاں

گزاریں صبر میں کچھ اور دن کہاں یہ توان وصالِ جلوہ تماشا ہی پر دماغ کہاں

کہ دیکھیے آئینہ انتظار کو پرواز

رہا ہی یہ تہہ خنجر بھی ذوقِ دید میں مست گیا ہی جان سے پھر بھی ہوا خیالِ پست

کیا ہی یار کے پر تو نے اس کو نیست بہت ہر ایک ذرہ عاشق ہی آفتاب پرست

گئی نہ خاک ہوے پر ہوائے جلوہ ناز

عجب مقام میں مرنا ہی کیا کہوں غالب مثال اس کو اگر دوں تو کس سے دل غالب

فضائیں عالم امکان سے ہو فزوں غالب نہ پوچھ وسعتِ مینا نہ حسنوں غالب  
جہاں یہ کاسہ گردوں ہو اک خاک انداز

(۴۰)

مفت ہوتے ہیں پریشان عزیز کیا مجھے سمجھے ہیں نادان عزیز  
مجھ کو ہو یا رکاشِ فرمان عزیز کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز  
کیا نہیں ہو مجھے ایمان عزیز

مشکل اس کا ہی نکلنا دل سے ہو قفلِ بھی بلا کا دل سے  
تیر کو تو نے جو کھینچا دل سے دل سے نکلا یہ نہ نکلا دل سے  
ہی ترے تیر کا پیکان عزیز

اُن نہ مرزا نے کبھی کی غالب جو مصیبت پڑی جھیلی غالب  
ضبط لازم ہو تمہیں بھی غالب اب لاتے ہی بے گی غالب  
واقعہ سخت ہو اور جان عزیز

(۴۱)

میری ہستی ہو اک نوکھاراز ہیں بقا و فنا ہم دم ساز  
ظاہر انجہام ہو نہ کچھ آغاز نہ گلی نعمہ ہوں نہ پردہ ساز

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تجھ کو ہنسنے سے کام صورتِ گل میں ہوں اور ہم نوائی لبیل  
لاگ دونوں میں اُڑی باکل تو اور آرایشِ خم کا کل

میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

بس زیادہ نہ لے تسلی کی غیر ممکن ہو دل کی آزادی  
کیا عجب ہو کھلے یہ پردہ کبھی لافِ تمکین فریبِ سادہ دلی

ہم ہیں اور رازِ ہائے سینہ گداز

جب سے کنجِ قفس کیا آباد بھول کر بھی نہیں چین کی یاد  
دل نہیں چاہتا کہ ہوں آزاد ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد

ورنہ باقی ہو طاقتِ پرواز

تنگ آیا ہوں ہجرِ دلبر سے کیوں نہ آنکھوں سے اشکِ غم برے  
دل کہاں تک فراق میں ترے وہ بھی دن ہو کہ اس شکر سے

ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

یہ کوئی ضبط ہی کہ میں چپ ہوں دل ہو خالی تو کیا لہو روؤں  
روتے روتے ہوا ہی حالِ زبوں نہیں دل میں مرنے وہ قطرہ غم

جس سے مرگیاں ہوئی نہ ہو گلباز

تینخ برّاں تری نگاہ تیز      عشوہ تیرا جہاں سے گرم سیتز  
خوش خرامی تری قیامت خیز      اے ترا جلوہ پاک تسلیم انگیز  
اے ترا ظلم سر بسر انداز

اٹھ گیا ہی نقابِ روئے نکو      خوب نکلیں گے حسرتیں اب تو  
منعِ پا بوس سے نکر مجھ کو      تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو  
رینزش سجدہ جبین نیا ز

غم سے کس دن میں جاں بلب نہ ہوا      درد سے حال غیر کب نہ ہوا  
لطف مجھ پر یہ بے سبب نہ ہوا      تجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا  
میں غریب اور تو غریب نواز

سرخوش و مست نظم رہتا تھا      دل سے نکاشا ہر سخن پہ خدا  
روئے خاک اڑا اے حرّ زرا      اسد اللہ خاں تمام ہوا

اے درینا وہ رندِ شاہباز

## ردیف (ک)

(۳۲)

چاہتے یہ شوخ تو دنیا میں کیا کم تھا نمک  
ان کے ہاتھوں کب دہان زخم نے چھانمک  
سنگ کے بدلے یہ لے سکتے تھے پتھر کا نمک  
زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک  
کیا مرہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

بے سبب کب ہو نمک سے احتراز زخمِ دل  
اُس کی خاکِ پا پھر کل کی چارہ ساز زخمِ دل  
تو نہیں واقف تو مجھ سے پوچھ را ز زخمِ دل  
گردِ راہِ یار ہی سامانِ ناز زخمِ دل  
ورنہ ہوتا ہی جہاں میں کس قدر پیدا نمک

چاہتا ہوں میں تو یہ پیرا کوئی تھوڑو ہو  
حسرتیں نکلیں کہیں فصلِ بہاری آئے تو  
اور مرہ مجھ کو یہ ہی دیکھوں اسے ہنستا ہو  
مجھ کو ازرا فی رہے تجھ کو مبارک ہو جو  
نالہ بلبیل کا درد اور خندہ گل کا نمک

غیر ممکن تھا کسی مرہم سے ہو اس کا علاج  
تھی تاکِ دو کس کی اس کو اور کس کی احتیاج  
تھا اسی درماں کا طالب اس کے زخموں کا علاج  
شوہرِ جولان تھا کنارا بحر پر کس کا کہ آج  
گردِ ساحلِ ہو بہ زخمِ موجہ دریا نمک

یکھ لے اُس شوخ سے کوئی محبت کا نباہ  
گو بظاہر ہو چکی ہی مجھ سے ترکِ ہم دریاہ



پھر بھی مجھ پر کس قدر مہربانی کی نگاہ داد دیتا ہر مرے زخم جگر کی واہ واہ

یاد کرتا ہوں مجھے دیکھے ہو وہ جس جانمک

پوچھ لو اگر یہ کیسی لگ رہی جوان کوئی تاکہ ہو اس حسرت کا قصہ آسانی سے طو  
تم گئے مجھ پر لگے ہونے لگاؤں پڑ پڑ چھوڑ کر جانا تن مجروح عاشق حیف ہو

دل طلب کے تاکہ زخم اور مانگیں ہیں اعضا نامک

تو دل سے چارہ جوئی باعثِ تحقیر درد کیوں کسی کی سعی سے حاصل کرتا تیر درد  
اس کے ہنسنے سے مجھے ہاتھ آگئی تدبیر درد غیر کی منت نہ کھینچوں گا پسے تو فیر درد

زخم مثلِ خستہ قاتل ہو سرتا پانامک

اپنی آنکھوں سے جو تیرے شوق کو پھر دیکھ لیں حضرت ہر زبانی تیری بیخودی کی آویں  
اب کہاں ہ زخم کھائے اور کہاں ہ لذت یاد ہیں غالب مجھے وہ دن کہ دھندلوق ہیں  
زخم سے گرتا تو تو پلوں سے چلتا تھا نامک

﴿۳۳﴾

ختم قصہ ہو شب بھر بسر ہونے تک صورتِ شمع ہوں مہمانِ سحر ہونے تک  
کیا خبر حال ہو کیا تجھ کو خبر ہونے تک آہ کو چاہیے اک عمر اترے ہونے تک  
کون جیتا ہو تری زلف کے سر ہونے تک

اک تلخ طعم ہو بیا کیوں نہ ہے پھر دل تنگ      روز طوفان حوادث کا ہو آمادہ جنگ  
کس طرح دیکھئے بیچارہ کی نکلے گی اُمتنگ      دام ہر موج میں ہو حلقہ صد کام نہنگ

دیکھیں کیا گزرے ہو قطرہ پہ گہر ہوئے تاک

آتش ہجر سے حالت ہو جگر کی جو خراب      کشمکش سے ہو مری جان گرفتار عذاب  
دل یہ کہتا ہو کہ پہلے مجھے کچھ نہ نواب      عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب

دل کا کیا رنگ کروغن جگر ہوئے تاک

تم سے اور وعدہ وفا ہی ہو کبھی ناممکن      دیکھ لیں خیر کہ لائے ہو خدا کو صفا من  
اپنی اس دار فنا میں ہو بقا ہی کو دن      ہم نے مانا کہ تناقل نہ کرو گے لیکن

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہوئے تاک

ہو گیا حسن کی ہیبت سے دل کوہِ دو نیم      سخت حیرت ہو کہ زندہ رہے کس طرح کلیم  
فرضِ عاشق ہو دم جلوہ کرے جان تسلیم      پر تو خور سے ہو شبنم کو فنا کی تعلیم

میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہوئے تاک

ظرف لکھتا ہو تو کربادہ پرستی غافل      ورنہ یہ بزم رہے گی نہ یہ بستی غافل  
تجھ کو محروم نہ کرنے تری مستی غافل      اک نظر بیش بہا نہیں فرصتِ ہستی غافل

گرمی بزم ہو اک قصہ شر ہوئے تاک

پوچھنے کیا ہو یہ عزت اسے کہ کیسا ہی مزاج کل تھی فرصت اسے اندر وہ مصیبت سے نہ آج  
وہ مرض ہے کہ معالج نہ دوا کا محتاج غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج  
شمع ہر رنگ میں جلتی ہو سحر ہونے تک

## ردیف دل

(۳۴)

یہ بے شعور جب سے ہوئی مبتلائے گل بچھا نہیں ہو اس کی نظر میں سوائے گل  
بھولی ہوئی ہو عہدِ قیام و بقائے گل ہو کس قدر ہلاک فریبِ وفائے گل  
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل  
دلت سے یاد گل میں عناد دل کو تھا شغف اشجار برگ با سے خالی تھے صفت بصف  
اب گل سے شاخ شاخ ہوئی جامِ جم بکف آزادِی نسیمِ مبارک کہ ہر طرف  
ٹوٹے پڑے ہیں حلقہٴ دِ اُم ہوائے گل  
جوشِ بہار میں کوئی غنچہ اگر کھلا کمتر کسی طرح دل صد چاک سے نہ تھا  
سمجھا نہ کوئی خستگی گل کا ماجرا جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا  
ای وائے نالہ لبِ خویش نوائے گل

جب پاسبوس کی بھی اجازت مجھے نہ ہو  
مجرم بنوں لگاؤں جو آنکھوں سے پاؤں کو  
کم قسمتی کا اپنی گلہ مجھ کو کیوں نہ ہو  
خوش حال اُس حریف یہ مست کا کہ جو  
رکھتا ہو مثل سایہ گل سر پہائے گل

گل کو جو دیکھتا ہوں کھٹکتا ہی دل میں خار  
اس کے وجود پر ہو مجھے رشک بار بار  
کہتا ہوں ہونہ یہ کہیں تیرے گلے کا ہار  
ایجا دکرتی ہو اسے تیرے لیے بہار  
میرا رقیب ہو نفسِ عطر سائے گل

دل تکتا گیا ہو غم روزگار سے  
خالی ہو ہاتھ سر میں گرانی خار سے  
فرحت ہو خاک سیر گل ولا لزار سے  
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے باد بہار سے  
مینا سے بے شراب دل بے ہوائے گل

یو باس اس نے حسن میں حاصل ضرور کی  
نسکین کیا ہو اس سے دل نا صبور کی  
لیکن وہ بات اس میں کہاں تیرے نور کی  
سطوت سے تیرے جلوہ حسنِ غیور کی  
نوں ہو مری نگاہ میں نگاہ دائے گل

رکھتا ہو غنچہ دل میں زل سے مرے چپک  
نرگس بھی چاہتی ہو ترے نور کی جھلک  
سنبل کو کر رہی ہو پریشاں ترنی لٹک  
تیرے ہی جلوہ کا ہی یہ دھوکا کہ آج ٹک  
بے اختیار دوڑے ہو گل و رقصائے گل

پھلی ہو جس کی بو سے دل آویز چارسو  
 حاصل ہو جس سے ہر گلِ خداں کو رنگِ بو  
 مرزا کو جس کی باغِ جہاں میں ہی جستجو  
 غالب مجھے ہو اس سے ہم آغوشی آرزو  
 جس کا خیال ہو گلِ جیبِ قبا سے گل

## ردیف (ن)

(۴۵)

اب دُ دل اور وہ خیال کہاں      وہ تصور وہ دیکھ بھال کہاں  
 وہ خوشی اور وہ ملال کہاں      وہ فراق اور وہ وصال کہاں  
 وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں  
 جب تک آزاد وہ کہاں ہم تھے      دید بازی میں ہم نے دن کاٹے  
 دلِ ہواب اور غم ہیں دنیا کے      فرصتِ کار و بار شوق کسے  
 ذوقِ نظارہ جمال کہاں  
 اب نہ دل میں خیال گیسو کا      اور نہ آنکھیں ہیں محو شوقِ لقا  
 دلولہ مٹ گیا جو دل میں تھا      دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا  
 شورِ سودا سے خط و خال کہاں

کیا کروں گریبشِ زمانہ نے جو میلے پست کر دیئے دل کے  
نرہا وہ سخن کا ذوق سنبھلے تھی وہ اک شخص کے تصور سے

اب وہ رعنائی خیال کہاں

بہہ چکا خون دل میں جتنا تھا کوئی قطرہ جگر میں بھی نہ رہا  
ہمیشہ طعن کیا یہ ٹھیکہ دیا ایسا آسان نہیں ہو رونا

دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

تھے کبھی خاکِ آسمانِ عشق اب نہ وہ ہم نہ وہ زمانہ عشق  
جیب پڑ تھی تو تھے یگانہ عشق ہم سے چھوٹا تھا رخاۂ عشق

واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

جو گردوں اٹھائے جاتا ہوں کھڑکیں صبح و شام کھاتا ہوں  
روزِ ایندا نی اٹھاتا ہوں شکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں

میں کہاں اور یہ وبال کہاں

کہیے مرزا کا حال کیا غالب بے طرح ضعف ہو گیا غالب  
ہو یہ پیری بھی کیا بلا غالب مضمحل ہو گئے توئے غالب

وہ عناصر میں اعتدال کہاں

(۴۶)

بھاگتا ہوں دام توڑ کے آفت سید ہوں      بیجا نہیں جو سایہ سے اپنے زیدہ ہوں  
 ہیبت زدہ ہوں چاشنی غم چشیدہ ہوں      ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں  
 میں دستِ غم میں آہوئے مینا دیدہ ہوں  
 کہتے ہیں یوں تو سب مجھے باختیار ہو      لیکن خدا گواہ جو کچھ اختیار ہو  
 مجبور ہو پھر اسے کیا اختیار ہو      ہوں درد مند جبر ہو یا اختیار ہو  
 گے نالہ کشیدہ گے اشکِ چکیدہ ہوں

چکھے ہوئے ہو غصہ و غم کا مزہ دہن      خوش ذائقہ حلاوتِ جاں مجھے کیا دہن  
 اس درجہ تلخ تھا دمِ آخر مرا دہن      جاں لب پر آئی تب بھی نہ شیریں ہوا دہن  
 از بسکہ تلخیِ غم ہجراں پیشیدہ ہوں  
 بے حس ہوں مثلِ عضوِ معطل پڑا ہوا      جنبشِ مجھے ہو ڈرہ برابرِ مجال کیا  
 بل لائی جزا ہوں نہ مستوجبِ سزا      نے سچے سے علاقہ نہ ساعت سے واسطہ  
 میں معرینِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں

یوں دشمنِ فرشتہ نہ جن و پری سے لاگ      حیواں کی تاک میں نہ کسی آدمی سے لاگ  
 بنے سے ہو لگاؤ نہ کچھ غیر ہی سے لاگ      ہوں خاکسار پر نہیں مجھ کو کسی سے لاگ

بغزلِ مروجہ دیوان میں نہیں ہو مصنف کو نالہ کی قلم خاص کی لکھی ہوئی اپنے استاد سوزناں سے ملی تھی۔

نے دانہ فانی ہوں زودم چیدہ ہوں

پوچھو نہ ہمد مومری حسرت کی دہستاں  
حراماں نصیب کر کے قضا لائی ہو میاں  
ناکامیاں نصیب میں نہ ہیں کہ الاماں  
ظاہر میں میری شکل سے افسوس کے نشاں

خارالم سے دست بدنداں گزیدہ ہوں

سنبل نے اپنی زلف کے کھوئے نہیں شکنج  
سبزان باغ ابھی نہیں گرم دلاں و غنچ  
بلغ خیال دل سے مٹائے ہوئے ہو سنج  
ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج

میں عندلیب گلشن نا آفرین ہوں

مسکن نہ آسماں نہ زمیں ہو مری جگہ  
کرسی ہو اور نہ عرش بریں ہو مری جگہ  
میں خود کہیں ہوں اور نہ کہیں ہو مری جگہ  
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہو مری جگہ

ہوں میں کلام نغزوئے ناشنیدہ ہوں

ہواک زانہ بر سر کین و مخالفت  
دنیا کو ہو عروج میں میرے مزاحمت  
پہناں ہو خستری کی نظر سے مری صفت  
جو چاہئے نہیں وہ مری قدر و منزلت

میں یوسف بہ قیمت اول خریدہ ہوں

مشراب پو میرے کیوں ہونے کو قال و قیل  
میں بھی ہوں اپنے رنگ میں بے مثل و یل  
نیکوں نے فرض کر لیا بد مجھ کوئے و لیل  
اہل دس کے زمرے میں ہر چند ہوں ذلیل



پر عاصیوں کے فرقے میں میں برگزیدہ ہوں  
مرزا ہی سے نہیں ہونا نے کو کچھ حسد  
میرے لئے بھی بن گئے انسان وام و دود  
اس طرح کھائے لیتے ہیں جس کی نہیں حد  
پانی سے سگ گزیدہ ڈسے جس طرح اسد  
ڈرنا ہوں آئندہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

(۴۶)

ہم سے برتاؤ برا ہو تو بھلا کہتے ہیں  
کچھ صواب اس نے کیا بھی تو خطا کہتے ہیں  
لطف بیجا کو جوان پر ہی بجا کہتے ہیں  
کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جانا کہتے ہیں  
ہوتی آئی ہر کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں  
دل پریشان ہر مضمون میں پریشان اپنے  
کہنے بیٹھیں کہیں کچھ اور خدا خیر کرے  
آج ہم اپنی پریشانی خاطر ان سے  
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں  
درد و دل خود بھی جو رکھتے تو سمجھتے اس کو  
سادگی سے گراں جو یہ کہیں سب سن لو  
درد و انگیز ہیں اندوہ فرا میں یہ تو  
انکے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو  
جو محو و نغمہ کو اندوہ رہا کہتے ہیں  
رات دن رہتی ہی یہاں نغمے کی حالت غش سے  
نالہ کش خاک ہوں رہتی ہی بڑی گت غش سے

لب تک آجا ہوتی ہے جو مہلت عش سے دل میں آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصت عش سے

اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

ہیں موجد و خدا شرک ہو دل سے مفقود ہم معبود ہیں نہ کہنے کے نہ کعبہ معبود

بقبلہ ہیں تو صرف ایک بہت ہے مقصود ہو پے سرحد ادراک سے اپنا مسجود

قبلہ کو اہل نظر قبلہ مانتے ہیں

یوں تو کانٹوں پہ ہمیشہ ہیں تڑپا ہوا اب محبت کا تری لطف مگر پایا ہے

حالتِ ناز پہ تو نے جو ترس کھلایا ہے پائے افکار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے

خارہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

سوزِ باطن کا جو کچھ حال ستم گرنے سنا دلنشیں ہونے کو تھا ہی کہ یکایک جھوٹا

ہم نے بھی رنگِ بیاں کو وہ میں اپنے بدلا اک شرِ دل میں ہے اس کے کوئی گھبرایا کیا

اگ مطلوب ہو ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

کرتے ہم رو و فتح اس سے تو ہوتا دل تنگ گفتگو کرتے ہوئے رہتا ہے آمادہ بجنگ

ہاں میں ہاں اس کی ملے ہیں تو بستی ہو تنگ دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ

اس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

سُن کے یہ سانہ مرزا بھی ہو دیں شاید جو سخنِ سیخ ہیں اس غم کو نہ بھولیں شاید

بزم ماتم ہو پیا بزم سخن میں شاید  
وحشت و شفتہ اب مرثیہ کہیں شاید  
مرگیا غالب آشفۃ نو کہتے ہیں

(۴۸)

عشق کیا جب شل قمری طوق گردن میں نہیں  
وہ جنوں کیا پتھروں سے زخم اگر تن میں نہیں  
اس کو جنوں کیا کہیں جس کا کہاں بن میں نہیں  
آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں  
ہو گر سیاں تنگ پیراں جو دامن میں نہیں

پہلے دامن میں جتنی گلکاری تھی گاشن میں نہیں  
لطفِ نو نبادی جو تھا مڑگان میں نہیں  
دل تو لب لبو ہو گیا ہے گردن میں نہیں  
ضعف سے اسی گر یہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں  
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خون کہ دامن میں نہیں

چو کہ دیواریں ہوئی تھیں سدا رہ آفتاب  
اس لیے وہ در ہوا ہی سجدہ گاہ آفتاب  
تھی جو زندیدہ نگاہی اک گناہ آفتاب  
ہو گئے ہیں جمع اجزاء نگاہ آفتاب  
درے اس کے گھر کی یواریں وزن میں نہیں

دریہ خانہ کا مہرے اک وہاں شیرازی  
موت کے منہ میں اُس جینے سے طبیعت سیرازی  
درے انگریز زمین خاکِ سیاہ کا ڈھیرازی  
کیا کہوں تاریکی زندانِ غم اندھیرازی  
پہنہ نور صبح سے کلم جس کے وزن میں نہیں

اس کو مارا اُس کو زندہ کر دیا اعجاز سے      اس کو غمزدے سے کیسا دل تو اُس کو ناز سے  
گھر بنایا اس نے ہر دل میں نئے انداز سے      رونق آستی ہو عشقِ خانہ ویراں ساز ہو

انجن بے شمع ہو گر برقِ خرمین میں نہیں

عمر بھریں اس نے لے دیکھ فقط سیکھا ہو طعن      دیکھئے انصاف سے تو سر بسر بیجا ہو طعن  
ہو فقط نا تجربہ کاری کہ یہ کرتا ہو طعن      زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جونی کا ہو طعن

غیر سمجھا ہو کہ لذتِ زخمِ سوزن میں نہیں

جیتے جی اُس شکِ گل کے خوب نظر آئے ہوئے      مر کے بھی پوئے پوئے ہی رطابِ لسان آئے ہوئے  
قبر میں پیشِ نظر وہ گل سے رخسار آئے ہوئے      بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے آئے ہوئے

جلوہِ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

کرنہ درماں چارہ گر مجھ خستہ ورنجور کا      ہر مسام اک زخم ہو گا اس تنِ محروم کا  
دل کی حالت دیکھ چھا ہو گیا زنبور کا      قطرہ قطرہ اک ہیولا ہوئے نئے ناسور کا

خوں بھی ذوقِ درد سے نالغِ مے تن میں نہیں

کثرتِ دہر پر ہوشیخی پیرِ میخانہ کو بھتی      ڈٹ گیا میں رندِ پینے پر تو قلعی کھل گئی  
ایک کش میں خم کے خمِ خالی کیئے اور بس کی      لے گئی ساقی کی نچوٹِ قلزمِ آشامی مری  
موجِ موی کی آج رگِ سینا کی گردن میں نہیں

عم جو آنے کا ہی پھر کو نہ آئے دل سے دوو کیا اُدھیرا پنچہ پیری نے تن کا تار و بود  
 نیستی ہی اپنی ہستی اور عدم اپنا وجود ہو فشا رصفت میں کیا نا توانی کی نمود  
 قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مے تن میں نہیں  
 کس طرح مرزا ہو اس کی بدہ خلقت میں قد مال میں جس کا نہ حصہ ہو نہ ہو دولت میں قد  
 قد کی حسرت عبرت ہو جب قسمت میں قدر تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قد  
 بے تکلف ہوں ہشت خس اگلش میں نہیں

(۴۹)

اب جو مستانہ گھٹا آئے برستی ایک دن آول جل کر اٹھا میں لطف ہستی ایک دن  
 دیکھ لو گے بچو دوں کی تیز دستی ایک دن ہم سے کھل جاؤ وقت جو پرستی ایک دن  
 ورنہ نہ ہم چھڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن  
 جب گرہ میں ام تھے پیرمناں تھا مہر باں رات دن پیہ پیہ پلانے سے تھی تہ نصرت کہاں  
 منطسی میں بھی نہ اس چپکے سے با آئی ناں قرض کی پیتے تھے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں  
 رنگ لائے گی ہماری فائدہ مستی ایک دن  
 بے باہا اس دور کی ایک ایک ساعت جانیئے اس کی رونق کو نہ کچھ بقدر و قیمت جانیئے  
 زار ناںی بھی جو ہو تو سار عشرت جانیئے نغمہ ہائے غم کہ بھی احوال غنیمت جانیئے

بے صدا ہو جائے گا یہ ساری سستی ایک دن

زعم و نامائی پر اس درجہ نہ کرنا داں نہ ہو      مثل گل پڑ مرده ہوگا ورنہ یوں خندان ہو

چارون کی رفعت ہو ہم پر نازاں نہ ہو      عرقہ اوج بنائے عالم انکاں نہ ہو

اس بلندی کے نصیبوں میں ہی سستی ایک دن

شب سحر محل جو بٹھا پائی وہ کرنے لگا      کون کہتا ہو کہ غیروں نے لے لے اکسا دیا

اس بُرے برتاؤ میں مرتزا نہیں اس کی خطا      دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب سستی ایک دن

(۵۰)

ظاہر میں گو شفیق نہیں مہرباں نہیں      ان کے ہمارے ربط کوئی دریاں نہیں

لیکن خفا بھی ہم سے وہ جان جہاں نہیں      ہم پر جفا سے ترک وفا کا گماں نہیں

اک چھیڑا ہو ورنہ مراد امتحاں نہیں

تم پوچھنے جو آئے تو مجھ پر کرم کیا      کچھ بھی اگرچہ رسم عیا دست نہ کی ادا

کیا کم ہو یہ نگاہِ ترجم سے دیکھنا      کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا

پرستش ہو اور پائے سخی دریاں نہیں

ہوتا نہیں وہ رام تو ہو اس کا رم عزیز      بڑھتا ہو جس سے شوق نہ ہو کہا ہو کم عزیز

خفگی کا بھی تو شوق کی ہی ہم کو غم عزیز  
ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز  
نا مہرباں نہیں ہو اگر مہرباں نہیں

کیا جانے ذوق جو رو جانا کو عدو سا ہیز  
ہم جس سے یاد آتے ہیں ہو ظلم ہی چیز  
اس لطف معنوی کی کہاں غیر کو تمیز  
ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز  
نا مہرباں نہیں ہو اگر مہرباں نہیں

کیا بات میں نے کی ہو کہ تم کو بری لگی  
حیرت سی نام بوسہ لب سن کے ہو گئی  
میں نے کیا سوال تو مجھ سے خطا ہوئی  
بوسہ نہیں نہ وہ سبھی و شام ہی سہی  
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گود ہاں نہیں

قصیدہ

ہر چند غمے یار میں اک التہاب ہو  
ہر چند مجھ کو اس کی حضوری عذاب ہو  
ہر چند غیظ و غصہ بوقت خطاب ہو  
ہر چند جاں گدازی تہر و عتاب ہو  
ہر چند پشت گری تاب توں نہیں

لیکن جلاس سے رحم و کرم کی امید ہو  
جو گشتگوئے تلخ ہی حلوئے عید ہو  
اس وقت و انبساط میں شکوہ عیب ہو  
جان مطربہ تراشہ ہلی من مزید ہو  
لب پردہ سنگ زمرہ الاماں نہیں

صادق اگر عشق تو پھر کیا ہو خوف و بیم      کمند زیار گو ہر جاں بھی نہ بن لیم  
پیدا وہ درو کر کہ ہو حال جگر سقیم      خنجر سے پیر سینہ اگر دل نہ ہو دیم  
دل میں چھری چھو جو مرہ تو نچکاں نہیں

بے داغ سینہ ہو تو نہ سینہ لے سے کہو      خالی ہو سوز سے تو جگر کو خال دو  
مضطر اگر نہ تو سلام ایسی جان کو      ہو ننگ سینہ دل اگر آتش کہہ ہو  
ہو عالم دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

وحشت میں سر کو پھوٹا ہوں کھلے بیچ قباب      دیوار و در گریں کہیں ہو کچھ تو انقلاب  
دیوانہ ہوں تو کیا مجھے آتا نہیں حساب      نقصان نہیں جنوں ہیں لایسے تو گھر خراب  
سو گزین کج بے بیاباں گراں نہیں

عقاب ندگی کا مادہ میری سرشت میں      بیت لہضم میں عمر کٹی یا کشت میں  
ہو نا کھا اور خاک مرے بخت نشین      کہتے ہو کیا لکھا ہو تری سر نوشت میں  
گویا جہیں پہ سجدہ بت کا نشان نہیں

ہو حرف گیر اگر ہو زبیاں خاص و عام کی      پروا نہیں کسی کے خیالات خام کی  
شہرت ملائکہ میں بھی ہو میرے نام کی      پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی  
روح القدس اگر چہ مرا ہنر باں نہیں



مرزا سوال بوسہ لب کو وہ ہر گھڑی سُن کر جو ملتا ہے تو سوچھی ہے دور کی  
جب لب لب سے گے گا تو خود ہوگا مقتضی جان ہی بہائے بوسہ و لے کیوں کہے ابھی  
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

(۵۱)

میں جو آوارہ ہوں اس میں مری تصویر نہیں میری تحریر جہیں لایق تصویر نہیں  
قابل چارہ مری گردشِ تفتیر نہیں مانع دشتِ فردی کوئی تدبیر نہیں  
ایک چکر ہو مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

دل کا اک لولہ ہے جو پئے پھرتا ہے کشاں بچو داتا ہوں کہ اولاد بھی نظروں سے نہاں  
کوئی منزل بھی تو پیدا نہیں جز وہم و گماں شوقِ اسِ شبت میں ٹوڑے ہے مجھ کو کہ جہاں  
جادو غیر از نگہِ دین تصویر نہیں

جان تو نذر میں جلا دے دی جاتی ہے اس کے خوش کرنے کی تدبیر تو کی جاتی ہے  
لیکن اُمید چھا قطع ہوئی جاتی ہے حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے  
جادو راہِ رفتِ جزوِ شمشیر نہیں

نہیں ناکامی سراپا کی پروا مجھ کو نہ خیالِ آہ کی بربادِ روی کا مجھ کو  
ہو نہ پوری نہ سہی ہے تو منتِ مجھ کو رنجِ نومیدی جاویدِ گوارا مجھ کو

خوش ہوں گر نالہ زبونی کش تا نہیں

شک ہو زخم تو بے چین دل اپنا ہو جائے جب تک اک زخم نیا اور نہ پیدا ہو جائے  
نگ پٹلاں جو نہ کھاؤں مجھے سوا ہو جائے سر کھانا ہی جہاں زخم سرا چھا ہو جائے  
لذت نگ باندازہ تستیر نہیں

کر لیا عفو کا جب وعدہ راسخ اس نے کون شرمندہ ہو پھر شرم گنہگاری سے  
نفس کہتا ہو کہ لے خوب گناہوں کے منے جب کرم نصرتِ بیباکی و گستاخی دے  
کوئی تقصیرِ جہنم غفلتِ تقصیر نہیں

وہ بھی مڑا سا جریدہ ہو بقول ناسخ صاحب اوصافِ حمیدہ ہو بقول ناسخ  
ہند میں شاعرِ حمیدہ ہو بقول ناسخ غالب اپنا یہ عقیدہ ہو بقول ناسخ  
آپ بے بہرہ ہو جو معتد تیر نہیں

تری رہ گزریں جو ہم دیکھتے ہیں فضا ایسی جنت میں کم دیکھتے ہیں  
گل و لالہ ہر جا ہم دیکھتے ہیں جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں  
نیا بیاں نیا بیاں ارم دیکھتے ہیں  
ہوئے ہم جو مشتاق اس کے سخن کے یہ آنا رگویا ہیں دیوانہ پن کے

دہن ہی نہیں اس بتِ سحر فن کے      دل آشفٹ گاں خالی کج دہن کے  
 سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں  
 ترے قدموزوں نے پایا وہ عالم      عجیب کیا قیامت کرے خیر مقدم  
 جو تو ہوسرا ماں تو محشرِ مسلم      ترے سرو قیامت سے اک قدم  
 قیامت کے گفتے کو کم دیکھتے ہیں  
 جو ہی حیرتِ آئینہ تجھ کو پیاری      تو اس سے بھی بڑھ کر ہی حیرت ہماری  
 فقط اک نگہ کی ہی اُمید واری      تماشا کر ای محو آئینہ داری  
 تجھے کس تماشا سے اہم دیکھتے ہیں  
 رہے ہجر میں رات بھر گرم نالے      گئے قافلے جانبِ عرش ان کے  
 نہ ہوتا نشان تو نشان بھی نہ پاتے      سراغِ توف نالہ لے واغِ دل سے  
 کہ شبر و کافکش قدم دیکھتے ہیں  
 نہیں رکھتے مرزا کسی سے مطالب      نہ دل جانبِ عیش دنیا ہو راغب  
 تماشے زر ہو نہ دولت کے طالب      بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب  
 تماشا سے اہل کرم دیکھتے ہیں

(۵۲)

جلتا ہوں ان کی گرمی تہر و عتاب میں      کیونکر منے نہ پاؤں عذاب عتاب میں  
پہچھو نہ مجھ سے گرمی دوزخ کے باب میں      مٹی ہی غم سے یار سے نار الہتاب میں

کافر ہوں گر نہ مٹی ہو لذت عذاب میں

آیا ہوں درد و غم کے لئے انتخاب میں      دن زندگی کے کاٹا ہا ہوں عذاب میں  
ہوں عرصہ دراز سے اس پیچ و تاب میں      کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں  
شہسائے ہجر کو بھی رکھوں گہ حساب میں

کیا کہیے ہوتی تھی شب غم کس طرح بسر      اختر شمار یوں ہی میں ہو جاتی تھی سحر  
ٹوڑا ستم یہ اور نیا چشم شوق پر      آپھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر

آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

آنکھوں میں ہیشتری نہ تھا نیند کا گرد      کرتا تھا صبح ہجر میں سر پٹ پیٹ کر  
غفلت جو روئے رہتے ہوئی شب کسی قد      آپھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر

آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

لکھ تو دیا انھیں کہ مرا مال ہی زبوں      ہواں سے آرزوئے تسلی تر آبسوں  
آگاہ آن کی عادت خصلت سے خوب ہیں      قاصد کے آئے آئے خط اک اور لکھ رکھوں

رہتے تھے ہم پرالہ جہاں اُسے خاص و عام  
پینے میں آج تجھ کو نہو کس طرح کلام  
اُٹھتا تھا ایسی بزم سے میں روز نشہ کام  
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا درجام

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

انکھیں بھی اہ میں جو بچھاتا ہوا چلے  
چالیں ہزار بار سے یہ پُر دغا چلے  
ملن نہیں کہ مکر و فسوں غیر کا چلے  
جو منکر و فا ہو فریب اس پہ کیا چلے

کیوں بد گمان ہوں دوست دشمن کے باب میں

دشمن کا مجھے تو یہ ہے کہ دشمن نہ آ کرے  
تم ہنستے ہنستے ہو گئے خاموش کس سیئے  
جاتے ہوئے تجھیں مئے گھر سے نہ دیکھ لے  
میں مضطرب ہوں صل میں خوفِ قیام سے

ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

وہ آج میرے گھر جو چلے آئے مست و  
جاتے ہوئے وصال کا وعدہ بھی کر گئے  
شکر خدا کہ ہو گئے قصے تمام ٹو  
میں اور خط و صل خدا ساز بات ہو

جاں نذر دہتی بھول گیا اضطراب میں

ظاہرہ کچھ اثر ہیں نمایاں قباب کے  
آثار بات میں ہیں پیچ و تاب کے  
لیکن ہیں چُپ خیال سے شرم و حجاب کے  
ہو تو رسی چڑھی ہوئی اندر نقاب کے

ہو اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں

تہا ہیوں تو ان کو لڑانا لگا ہ کا      نظریں بچا کے سب کی ملا نا لگا ہ کا  
آفت ہون مگر نہ اٹھانا لگا ہ کا      لاکھوں لگاؤ ایک چرانا لگا ہ کا  
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ جو کہ عرشِ معلے کو بھی ہلائے      وہ نالہ جو زمین کو بھی زلزلے میں لائے  
وہ نالہ اور کان تک اس شوخ کے بچائے      وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے  
جس نالہ سے شکاف پڑے آفتاب میں

جادو وہ چیز ہے کہ جو اس کو عمل میں لائے      مشکل سے مشکل امر کو آسان کر دکھائے  
لیکن مجھے یہی تو ہی افسوس ہائے      وہ سحرِ مدِ طلبی میں نہ کام آئے  
جس سحر سے سینہ رواں ہو شراب میں

تھے یاد ہم پہ پالہ ہمارے سبھی کبھی      دیکھا نہ ہم نے ہوش میں ہرگز اکو بھی کبھی  
وہ دن کہاں کہ شغل سے فرصت نہ تھی کبھی      غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی  
پیتا ہوں روزِ برابر و شبِ ماہِ شباب میں

۵۲

جامِ سب کو کہ نہ بچا کر سحاب میں      شامل نہ کر صہوجی کو شب کے حساب میں  
دہاں کچھ کمی نہیں کہ ہو تو منظر اب میں      کل کے لیے کراچ نہ خست شراب میں

یہ سوئے ظن ہو ساقی کوثر کے باب میں

یا تو ملائکہ سے بھی تھا مرتبہ بلند ہم سا نہیں ہی یا کوئی اب غوار و مستند  
پہونچا رہا ہو ہر شمس ہمیں گز ند ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

انرا کیوں یہ دوح کا قالب سے انزع کیوں بٹھکے کرب سانس کا ہوتا ہی نقطاع  
سننے سے اس کے کہتے پہنچ پہنچ الوداع جان کیوں نکلنے لگتی ہو تن سے دم سماع

گر وہ صدا سمانی ہی چنگ و رہا ب میں

کہتے ہیں صاف صاف یہ انداز چال کے لینا نہیں عادم سے ادھر دم کہیں اسے  
بے اختیار ہوں کہیں مجھ کو گرا نہ دے رو میں ہی خوش عمر کہاں دیکھیے بھٹنے

وئی ہاتھ باگ پر ہو نہ پا ہو رکاب میں

کی لاکھ فکر ہستی آشتیا میں پڑی پڑی قصہ ہوا نہ ان کے وجود و عدم کا طو  
حیرت میں مبتلا ہوں کہ میں بھی ہوں طرفہ شو اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہو

جتنا کہ دہم غیر سے ہوں بیچ و تاب میں

ایک دیکھا کہ موجود و موجود ایک ہو سب مہدوں میں عابد و مہبود ایک ہو  
کیا ذکر سجدہ سجد و مسجود ایک ہو اصل شہود و شاہد و مشہود و ایک ہو

جہاں ہوں پھر مشاہدہ ہو کس حساب میں

موج و حباب میں ہو مقرر وجود بحر  
ان کا وجود بھی ہو سرا سر وجود بحر  
کہئے انہیں عرض تو ہو ہر وجود بحر  
ہو مثل نمود صورہ پر وجود بحر

یاں کیا دھرا ہو قطرہ و موج و حباب میں

جیتے ہیں تانہ سن سے ہم کو ہو آگہی  
ہر ہروں کے واسطے سامان گمراہی  
جب پھپھکے نہ ذات پرے کی کیا رہی  
شرم اک اٹلے ناز ہو اپنے ہی سے ہی  
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

گو خود نما نہیں ہو وہ پردہ نشیں ہنوز  
نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز  
ہو مجرناز خود بھی وہ ناز آفریں ہنوز  
ارایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز  
پیش نظر ہو آئینہ دائم نقاب میں

اشیاء کی ہو تصور اشیاء سب نمود  
دیکھا جو غور سے تو خیالی ہیں سب وجود  
ہستی کی واہجے کی بدولت ہو ہستی بود  
ہو غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود  
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے میں غائب ہیں

مرزا کو ایک عمر سے ہو جستجوئے دوست  
کچھ آرزو نہیں ہو بجز آرزوئے دوست  
انکبیں ہیں ہمنشیں کی طرف لہو دوست  
نائبہ ایم دوست آتی ہو بے دوست



مشغول حق ہوں بسدگی بو تراب میں

\*\*\*

(۵۵)

کس طرح روکوں گریہ شام و سحر کو میں      رونے میں رونہ بیٹھوں کہیں چشم تر کو میں  
کس کس کے بچ و غم میں کھپاؤں گا سر کو میں      جیساں ہوں ل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں  
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوہ گر کو میں

مانا نہ دل سے تیرا پتہ دشمنوں کو دوں      آگاہ تیرے نام سے اغیار کو کروں  
آوارہ و خراب تری جستجو میں ہوں      چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں  
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جس راہ میں قدم کا بھی لکھنا تھا تنگ عار      طو سر کے بل کیا اُسے اللہ رے اضطراب  
دم بھر کو بھی تو دل نے نہ لینے دیا قرار      جانا پڑا قریب کے در پر ہزار بار  
اچھی کا شس جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

آمان میرے قتل کو کس زعم پر ہوئے      انجان تم نے جان لیا جان من مجھے  
دھکی میں تو وہ آئے نہ معلوم ہو جسے      ہی کیا جو کسکے باندھو گے میری بلاؤں سے  
کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

میں جانتا تھا مجھ کو فقط ان سے کام ہو      الفت ہو ماسول سے تو سودائے غام ہی

اُس پر بھی ہے یہ قدر تو میرا سلام ہو      لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے شک و نام ہو  
یہ جانتا اگر تو سلطانہ گھر کو میں !

کرتا ہوں تنو قدم بھی اگر طو ہو کے ساتھ      یعنی ہر اک قدم پہ ہوں ک خضر نو کے ساتھ  
آہستہ رو کے ساتھ کبھی تیز رو کے ساتھ      چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ  
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہر جذبہ کدوں ہی میں سب عمر دی گزرا      لیکن خدا گواہ کہ ایماں ہے ہر قرار  
ہاں شوق دید کا تو ہوں بیشک گناہگار      خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار  
کیا پوچھتا ہوں اُس بت پیدا دگر کو میں

پھر گم ہوا تلاش میں اس کی میں دلفکار      ہوش و حواس پر نہ رہا پھر کچھ اختیار  
پھر سعی و جستجو کا جنوں سر پہ ہے سوار      پھر بیخودی میں بھول گیا راہ کوئے یار  
جانا دگر نہ ایک دن اپنی خیر کو میں

پرساں حال کوئی ہنسر کا نہیں ہا      باقی جہاں میں قدر ہنر و نہیں ذرا  
مجھ کو یہ ترنم اب بھی ہیں گاہک ہزار ہا      اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا  
سمجھا ہوں دلپذیر متاع ہنر کو میں

مرزا میری دعا بھی ہے ہر بصد نیاز      دیکھوں جہاں یار میں ای رب کار ساز

جس طرح پہلے کہہ گیا ہو اک سخن طراز غالب خدا کرے کہ سوار سمن دان  
دیکھوں عسلی بہادر عالی گہر کو میں

(۵۶)

کون کہتا ہو خفا مجھ سے وہ مغرور نہیں کینہ و بعض جو مجھ سے ہو وہ مستور نہیں  
لے سکے نام مرا کوئی یہ فتور نہیں ذکر میرا بہ بدی بھی لے منظور نہیں  
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

بسا اک عمر کے بیدار ہو طالع شوق خوش نصیبی ہو کہ چکا تو ذرا طالع شوق  
آج تو بے سرباری ہو مرا طالع شوق وعدہ سیر گلستاں ہو خوشا طالع شوق  
مردہ قتل مقتدر ہو جو مذکور نہیں

ہو فقط نقطہ موہوم اگر ہو عالم دہن اس شوخ دل آرا کا مگر ہو عالم  
وہم ہی وہم ہو گو پیش نظر ہو عالم شاہد ہستی مطلق کی کمر ہو عالم  
لوگ کہتے ہیں کہ ہو پرا ہمیں منظور نہیں

غور سے دیکھ اگر رکھتا ہو چشم باطن تجھ پہ کھل جائے گا یہ عقدہ مشکل اک دن  
جزو ہو کل سے جدا یہ نہیں ہرگز ممکن فطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہو وہ یاسین  
ہم کو تشبیہ تناک طرفی منصور نہیں

وائے ناکامی اُمید کہ ہمت نہ ہی بار غم جس سے اٹھائے تھے وہ قدر نہ ہی  
چسملول کا ہوا ہست وہ جرات نہ ہی حسرت اذوقِ خرابی کہ وہ طاق نہ ہی  
عشق پر بدہ کے گوں تن رہو رہیں

ہنسکے کہتے ہیں گئے آپ اگر جنت میں ہو نگے غلمان ہی غلمان دہان یا وریں  
کچھ تعجب نہیں جو آپ وہاں جو رہی لیں میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمہیں  
کس لعونت سے ہاتھ کہتے ہیں کہ ہم جو نہیں

یہ تو ممکن نہیں تو دل سے مجھے بھولا ہو ہاں جو اغماض سے لے کام تو چارہ کیا؟  
کچھ بہانہ بھی رہے یاد کا تو اچھا ہو ظلم کر ظلم اگر لطیف دریغ آتا ہو  
تو ثنافل سے کسی رنگ میں سعد ورنہیں

ای خوشا ہزم طرب جس میں بہم ہیں ہم لوگ دافعِ سنج واطم و شمن غم ہیں ہم لوگ  
آج تک اہر و نقشِ قدم ہیں ہم لوگ صاف دردِ کش پیمانہ جم ہیں ہم لوگ  
وائے وہ بادہ کہ افشرد کہ انگور رہیں

اے فدا ہرے نکمتوں کا فدا فی غالب میری حکمت کا ثنا گر ہوشیاری غالب  
پوچھو مرزا سے مری نعمہ سرا ہی غالب ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب  
میر سے دعویٰ سے پوچھو یہ حجت ہو کہ مشہور نہیں

(۵۶)

قابلِ رجزِ فغانِ دلِ ناشاد نہیں آہِ وزاری یہ مری لایتِ ایراد نہیں  
 ہو فقط یادِ دہانی کوئی فریاد نہیں نالہ جزِ حسنِ طلبِ اسوِ ستمِ ایجا و نہیں  
 ہو تقاضا، جفا شکوہِ بیداد نہیں

عاشقوں کو نہیں محبوب سے جاں بھی محبوب ہاں سمجھتے ہیں صنا جوئی دشمنِ معیوب  
 نگِ عشاقِ مخافِ زاد کا بیجا اسلوب عشق و مزدوری عشرتِ گمِ خسرو کیا خوب  
 ہم کو تسلیم نہ کو نامی فریاد نہیں

کھتی تھی خانہ نشینی تگ و دو سے محروم ابے کا وٹ و دمِ حشمتِ ہونہ دل ہو مغموم  
 گویا ہاں میں ہو آبادیِ رونقِ معدوم کم نہیں وہ بھی خرابی میں یہ وسعتِ معلوم  
 دشت میں ہو مجھے وہ عیشِ گھریا و نہیں

ہر تغیر سے زمانہ کے ہو عبرتِ مطلب دور اس کا سبق آموزیِ عالم کا سبب  
 یہ موزب وہ ہو جو خوب سکھاتا ہو ادب اہلِ بینش کو ہو طوفانِ حولدتِ مکتب  
 نظر موجِ کم از سیلی استاد نہیں

کس خوشی سے تو بھبھلا کیے ہم جو رو و جفا آہ و نالہ کو کیا ضبطِ سمجھ کر شکوہ  
 پھر گئی سمجھا نہ ستم گارنے پا بندِ رضا وائے محرومیِ تسلیم و پدا حالِ وفا

جانتا ہی کہ ہمیں طاقت فرما نہیں

آشیانے سے قدم اب تو خال اپنا کہیں  
اب نہیں ہو وہ زمانہ کہ ہے گوشہ نشین  
شکر کرا ج کوئی دام نہیں فرشتہ میں  
سبد گل کے تلے بند کرے ہی گلپیں

مژدہ ای مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

دل کے لینے کو تو ہر دم تھا تقاضا لا لا  
بوسہ مانگا تو بہ تکرار یہ بولا لا لا  
تھا تو ممدوم دہن لانے معما کھولا  
نفی سے کہتی ہی اثبات تراوش گویا

دی ہی جائے دہن اس کو دم ایجا نہیں

شبم اس عشرت گلزار پہ گریاں کیوں ہی  
دیدہ نرگس حیرت زدہ حیراں کیوں ہی  
منقبض غنچہ گل وقت بہاراں کیوں ہی  
دیدہ نرگس حیرت زدہ حیراں کیوں ہی

گرچہ چراغان سر رہ گزر باد نہیں

تم اگر بھول گئے اپنی حکایت غالب  
سنو ہر زا سے وہ پرورد روایت غالب  
ہوئی سہو کی یہ کیا تھیں عادت غالب  
کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب

تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

۵۴

مرے عقایدِ راسخ میں کچھ فساد نہیں  
خدا خواستہ میں منکر معاد نہیں

خوب گل چھترے اڑا کوئی مراد ہی نہیں

غلط کہ یا مجھے طویل روزداد نہیں نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں

شب فراق سے روز جزا زیادہ نہیں

یہ بات ساقی ہوش نے کیا بنائی ہے کہ ہو نہ ابر تو پینے میں کیا برائی ہے

ایستہ کیا اسی صورت سے پی پلائی ہے کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے

بلا سے آج اگر دن کو ابر باد نہیں

کون رقیب برائی بھی تو بُرا نہ کہیں بھلائی لاکھ ہو مجھ سے مگر بھلا نہ کہیں

کجی زباں سے کوئی کلمہ خیر کا نہ کہیں جو آؤں سامنے ان کے تو مرجھا نہ کہیں

جو جاؤں پاس سے ان کے تو خیر باد نہیں

دل و جگر غم و اندازے رشک بہتے ہیں سرشکِ خونِ جگر چشمِ نر سے بہتے ہیں

عدو کے ساتھ وہ مصروفِ عیش رہتے ہیں کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں

کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

کھلا ہی رہتا ہے اٹھوں پہر فیض کا باب اس آستانے سے ملتا نہیں کسی کو جواب

جو صرف راہِ خدا ہو نہیں کچھ اُس کا حساب علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب

گداے کو چہ میخانہ نامراد نہیں

ایسے جہان میں ہم مبتلائے رنجِ مدام کھلی جو آنکھ تو دیکھنا نہ جز غم و آلام

سنا نہیں بھی ہم نے سرورِ عیش کا نام      جہاں میں ہوں غم و شادی بہم ہیں کیا کام  
 دیا ہی ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں  
 اک التماس تو مرزا کی بھی سُنو غالب      کرو وہ بات نتیجہ بھی جس کا ہو غالب  
 خفیف ہو گئے یہ چھیڑاں سے چھوڑو غالب      تم اُن کے عیسے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب  
 یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

(۵۹)

روزِ مضمون نیا باندھتے ہیں      روزِ مرہ بھی جدا باندھتے ہیں  
 تجھ کو ہم برقِ ادا باندھتے ہیں      تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں  
 ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں  
 نالہ دل کی حقیقت کیا ہے      کامیاب اس سے کوئی ہوتا ہے  
 چھیڑنا اس کو فقط منشا ہے      اہ کا کس نے اثر دیکھا ہے  
 ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں  
 تجھ کو وہ چال ہے حاصلِ عمر      دم میں طی کرتی ہے منزلِ عمر  
 تیری رفتار ہے کاملِ عمر      تیری فرصت کے مقابلِ عمر  
 برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں



بند کا جبکہ ہی بندہ مفہوم      مرگ کی پھر ہی توقع موہوم  
کیوں رہیں شوقِ اجل میں مفہوم      قیدِ ہستی سے رہائی معلوم  
اشک کو بے سرو پا باندھتے ہیں

سر میں لکھتا ہی نہ یہ نشہِ مل      نہ اسے نازشِ عشقِ بلبل  
ناز ہو حسنِ پیر اپنے با کھل      نشہِ رنگ سے ہو واشدِ گل  
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

ان کی بندش کو سخنِ چیت پوچھ      کس طرح لیتے ہیں تحسینِ مت پوچھ  
شعرا کی غلط آئیں مت پوچھ      غلطیہائے مضامین مت پوچھ  
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

مجھ سے وحشی کا کیا کیا درماں      ڈال دی پاؤں میں گیا جولاں  
چارہ گر اپنے ہیں کتنے ناداں      اہل تدبیر کی واما نہ گیساں  
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

تھے وہ مرزا ہی سے پہاں غالب      ہم سے دھوکا نہیں آساں غالب  
ہم کو سمجھا کوئی ناداں غالب      سادہ پرکار ہیں خواہاں غالب  
ہم سے پچانِ وفا باندھتے ہیں

(۶۰)

جب تیری خاک سہ کی برابر نہیں توں میں کیا شکوہ سنج جو رشتہ در نہیں ہوں میں

رہتے میں سنگ در کا بھی ہمسر نہیں ہوں میں دایم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں

خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

ہو جائے مضطرب تو نہیں کچھ خطائے دل انصاف شرط ہو کبھی راحت بھی پائے دل

دن ات جو چرخ کہاں تک اٹھائے دل کیوں گردش مدام سے گھبرانہ جائے دل

انسان ہوں پیالہ وس غر نہیں ہوں میں

بیکار کیوں سمجھتے ہیں اہل جہاں مجھے نقصان کیا کسی کو ہو میرے وجود سے

سہواً غلم نہیں ہوں کہ معنی بدل گئے یارب مجھے زمانہ ٹٹاتا ہو کس لئے

لوح جہاں پہ حرف مکر نہیں توں میں

تجویز قتل مجرم الفت کے واسطے ہو سنگ مدعی عدالت کے واسطے

یہ جو رو ظلم اہل محبت کے واسطے حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے

آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

حضرت حقیر جانتے ہیں کس لئے مجھے بے آبرو کیا مری تقدیر نے مجھے

نسبت نہیں ہو کوئی جہادات سے مجھے کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے

لعل و زمر و دوز و گوہر نہیں ہیں

اجرام چرخ بھی تو نہ محروم ہوں درین  
اور مجھ سے آج کٹ وہی جوں کا توں دین  
بندہ نواز کس لیے آخر ہی یوں درین  
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں کیوں دین  
رہتے ہیں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہیں

گردوں نے بوسے پاؤں کے کس شوق سے لیے  
سر پر قدم تھالے زمیں تک نہ لے گئے  
یہ دیکھ لو کہ ہی تو فقط ہی مرے لیے  
کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کے لیے

کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

مرزا کی طرح شغل تمھیں بھی کوئی نہ تھا  
بیکار بیٹھے بیٹھے زمانہ گزرتا گیا  
خوابیدہ نخت شکمہ ہی بیدار تو ہوا  
غالب نے طیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا  
وہ دن گئے کہ کہتے تھے تو کر نہیں ہیں

۶۱

تھیں کبھی زلفیں جو زیب سنبلستاں ہو گئیں  
خار بن کر جلوہ گر دلہ و زہر گھاں ہو گئیں  
شکل زکس حشر پہائے شوخ و فشاں ہو گئیں  
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں  
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پہاں ہو گئیں  
آہ ای عہد جوانی وہ امنگیں اب کہاں  
تو ہی جب نصرت ہوا پھر کیا ہی عمر جاوے

دلوئے ہی دل میں تھے کچھ اور حبیب تھے جواں  
یاد تھیں ہم کو بھی لکھا رنگ بزم آرائیاں

لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

ہو گیا ہر چند پہلو سے جدا تختِ جگر  
دکھتی آنکھوں ہوا گم ایک سبک نورِ نذر

دیدہ بے نور واقعے شوق سے آنکھوں پہر  
قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر

لیکن آنکھیں روزِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سیکڑوں قربانی رشکِ قنابت مر گئے  
ہیں زبانِ خلق پر دن رات جن کے تذکرے

غیر کا نظارگی ہونا نہ چاہا عشق نے  
سب رقیبوں سے ہیں خوشن بختانِ مصر سے

ہو زلیخا خوش کہ موماہ کسٹاں ہو گئیں

ہم کو یہ سمجھ ہوئے ہیں اس قدر بے ننگ نام  
ننگِ اہان کیلئے ہم ہوں گرانِ کلام

خیر اگر چاہا خدا نے پھر تو بن جائے گا کام  
ان پر نیرادوں لینگے حنکد میں ہم انتقام

قدستِ حق سے یہی عوریں گرواں ہو گئیں

دل میں تو بیشک اترتی ہیں یہ پھریاں بارِ بار  
اُن واحد کیلئے لیکن نہیں ان کو قرار

تیرن کر آ رہی ہیں جا رہی ہیں برقِ وار  
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں بے لکے پا

جو مری کو تا ہی قسمت سے نرگاں ہو گئیں

دیدہ ہوا دنِ رباں نے تو کھا کر پیچ و تاب  
کم ہوا منتِ حاجتِ مری اس کا عتاب

ہو گیا ہی سہل گو خصل میں ہونا یا رباب  
واں گیا بھی میں ان کی گالیوں کا کیا جواب  
یا دھنیں جتنی دعائیں صرف رباب ہو گئیں

کام اچھا دے گیا صبر و سکون انجام کار  
ورنہ پہنچی تھی یہ نوبت پیر ہن ہوتا رمار  
دل فٹاں کرتا تو پھر ہاتھوں کو کیوں ہوتا قرار  
بسکہ رو کا میں نے اور سینے میں ابھریں بار بار  
میری آہیں بچیہ چاک گریباں ہو گئیں

میکے میں تشنہ بھر نہ نا کام آگیا  
چشمہ آب بقا تک وہ مو آ شام آگیا  
جی گیا جو کشتہ شمشیرِ لام آگیا  
جاں فزا ہی یادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا  
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

اپنے نصب العین ہیں جملہ مذاہب بالعموم  
نقش ہیں دل پر تمام ان کے قوانین و علوم  
ایسے ہیں اپنی نظر میں لکھ ہواں سب کی حدیم  
ہم موحہ ہیں ہمارا کیش ہو ترک رسوم  
ملتیں جب مٹ گئیں اجزاء ایماں ہو گئیں

ابتدا میں تو بہت کچھ دل کو ترپاتا ہو رنج  
غزوہ کی جان کو آٹھوں پر کھاتا ہو رنج  
ضبط و اعتدال سے آخر ہنگام آہو رنج  
رنج سے جو گر ہوا انسان ٹوٹ جاتا ہو رنج  
مشکلیں چم پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

دو توارنے کا میرے کیوں اٹاٹے ہو مذاق  
یہ لہو روا بھی ہو آنکھوں کا حسن اتفاق

روح کلام غالب  
۱۱۳  
ہو گیا ہی سہل گو خصل میں ہونا یا رباب  
واں گیا بھی میں ان کی گالیوں کا کیا جواب  
یا دھنیں جتنی دعائیں صرف رباب ہو گئیں  
کام اچھا دے گیا صبر و سکون انجام کار  
ورنہ پہنچی تھی یہ نوبت پیر ہن ہوتا رمار  
دل فٹاں کرتا تو پھر ہاتھوں کو کیوں ہوتا قرار  
بسکہ رو کا میں نے اور سینے میں ابھریں بار بار  
میری آہیں بچیہ چاک گریباں ہو گئیں  
میکے میں تشنہ بھر نہ نا کام آگیا  
چشمہ آب بقا تک وہ مو آ شام آگیا  
جی گیا جو کشتہ شمشیرِ لام آگیا  
جاں فزا ہی یادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا  
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں  
اپنے نصب العین ہیں جملہ مذاہب بالعموم  
نقش ہیں دل پر تمام ان کے قوانین و علوم  
ایسے ہیں اپنی نظر میں لکھ ہواں سب کی حدیم  
ہم موحہ ہیں ہمارا کیش ہو ترک رسوم  
ملتیں جب مٹ گئیں اجزاء ایماں ہو گئیں  
ابتدا میں تو بہت کچھ دل کو ترپاتا ہو رنج  
غزوہ کی جان کو آٹھوں پر کھاتا ہو رنج  
ضبط و اعتدال سے آخر ہنگام آہو رنج  
رنج سے جو گر ہوا انسان ٹوٹ جاتا ہو رنج  
مشکلیں چم پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں  
دو توارنے کا میرے کیوں اٹاٹے ہو مذاق  
یہ لہو روا بھی ہو آنکھوں کا حسن اتفاق

ہو شب ہجران کی تاریکی زیادہ دلِ شاق  
اشکِ خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہر نامِ فراق  
میں یہ سمجھو لگا کہ دو سمیں فروزاں ہو گئیں

بزم میں جو ہمیش تیرا ہی راہیں اس کی ہیں  
صبحِ نظارہ پس کہ دیتا ہوا ایں اس کی ہیں  
اس سے بھی ہوشِ نصیب ہے راہیں اس کی ہیں  
نیناس کی ہو دماغ اس کا ہوا تہیں اس کی ہیں  
تیری زلفیں جس کے بازو پر پیشیاں گئیں

کس غضب کا یہ طوفاں خیز و ناالاماں  
اس کی آنکھوں نے تو باندھا ابر بارانِ کماں  
کروئے اس نے بھی مرزا کی طرح دیرا رواں  
یوں ہی گزرتا رہا قلبِ اہل جہاں  
دیکھنا ان بستیوں کو نظم کہ ویراں ہو گئیں

(۹۲)

دشتِ ہوا اور طاقتِ رفا بھی نہیں  
دامنِ بقدرِ خلعتِ یکِ خا بھی نہیں  
ہمساجنوں زوہ کوئی نادر بھی نہیں  
دیوانگی سے دوش پہ زنا بھی نہیں

یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

ہو کر غریبِ درطہ حیرماں ابھر چکے  
یہ یاس جیتے جی ہی تو سمجھو کہ مر چکے  
دن اپنے جبکہ شوقِ لقا میں گزر چکے  
دل کو بنا زحسرت دیدار کر چکے  
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنے ہیں کچھ سے کئے ہیں جو سر سے اہ طو البتہ تجھ کو پا نہیں سکتے ہیں سست پڑی  
 ممکن کبھی ہوئی نہیں کوئی حال شو ملنا تیرا اگر نہیں آساں تو سہل ہو  
 دشوار تو یہی ہو کہ دشوار بھی نہیں

میں اک نحیف نزار ہوں بے طاقت تو اں اس پر یہ دل کے ولولے یشوق جاں تل  
 حیرت یہ کہہ ہی ہو کہ اب چاہیئے کہاں بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہو اور یاں  
 طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

سودائے سرو وجہ پراگندگی ہوش وحشت ابھارتی ہو کہ کرنا لہ و خروش  
 گراؤں بائے کس سے کہ جائے جنوں کا جوش شوریدگی کے ہاتھ سے سرو و بال دوش  
 صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

دشمن ہی کچھ عناد کو سمجھا کریں شرف پھر نے بھی وہ جو پھٹتے ہیں دن رات سرکھٹ  
 لیکن میں جو بے بضاعت ہو کچھ بھی تو لو حلف گنجائش عداوت اغیار یک طرف  
 یاں دل میں ضعت سے ہوس یا رہی نہیں

فریاد میں جو میں نے بلادی کبھی زبان قائم نہ پھر نہ مین رہے گی نہ آسمان  
 آسان میری آہ جہاں سوز کو نہ جان ڈرنا لہائے نزار سے میرے خدا کو مان  
 آخر فوائے مرغ گرفت رہی نہیں

ہو زخم زار سینہ کو پیکاں سے روکشی      زخمی جگر کو خنجر ہراں سے روکشی  
 کرتا جو اس کا تیر نظر جاں سے روکشی      دل میں ہر یاد کی صفِ ترگاں سے روکشی  
 حالانکہ طاقتِ خلش غار بھی نہیں

لیتے ہیں کامِ اداؤں سے آلاستِ حرب کا      خنجر کی اور تیر کی حاجت نہیں ذرا  
 کرتے ہیں خونِ خلق نہتے ہیں وہ تو کیا      اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اور خدا  
 لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مرزا جو بادشاہ تھا استلیم شعر کا      جس کا ہو ملکِ نظم میں جھنڈا اگر اہوا  
 فرزانہ کوئی ہو گا یہ غالب گمان تھا      دیکھا استاد کو خلوت و جلوت میں بارہا  
 دیوانہ گر نہیں ہو تو ہوشیار بھی نہیں

۹۴

رفوگر کس طرح شک ہو بھلا تیرے ٹہری پن میں      کہ بیٹھا ہو رفوگر نے مرنے نفلوں کو دہن میں  
 سمجھ لیتا جو ہوتی تجھ کو کچھ بھی آنکھ اس فن میں      نہیں ہو زخم کوئی نہ خیمے کے زورِ مرے تن میں  
 ہوا ہوتا را شکلیں مستشہ چشم سوزن میں

دمِ نظارہ دیوار و در ہوں وقفِ حیرانی      کہ اچھا رنگ لائی اشکِ چشمِ ترکی طنیانی  
 ان آنکھوں کی بدولت بھر گیا اُمید پر پانی      ہوئی ہر مائعِ ذوق تماشا خانہ ویرانی



کعب سیداب باقی ہو رنگِ پنیہ و زن میں  
 کبھی ابرو کے سرِ صدقے میں قنایتِ برآں ہوں  
 کبھی ترچھی نگاہوں سے جراتِ خواہ پریاں ہوں  
 دُور سوزِ غم سے جلوہ گاہِ داغِ پہناں ہوں  
 و دیعتِ خانہ بیداد کا و شہائے مرگاں ہوں  
 لیکن نامِ شاہد ہی مرا بہ قطرہِ خونِ تن میں  
 نہ چھو کیا بلا ہو تیرگی شہائے ہجراں کی  
 چمکے تھے کی ہر اس میں مہرِ وفا کی  
 سیاہی مات ہو بختِ یہ کی فردِ عصیاں کی  
 بیاں کس سے غفلت گستری میرے شہتیاں کی  
 شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنیہ دیو اور لکڑی زن میں  
 ہنسی یاروں نے کیا کی کس نصیحت بھٹک کر مانی  
 نہ اب ہوش و حشمت نہ فرطِ ناشکیبائی  
 سکوں سا ہو گیا دل کو گیا سامانِ رسوائی  
 نکو مش مائے بے رطبی شورِ جنوں آئی  
 ہوا ہو خندہ اجابِ پنجہ چسبہ امن میں  
 نہ ہے تقدیرِ آئینہ کہ یہ ہو سامنے اُس کے  
 کہاں پہنچا دیا شانِ خدا اس کے معتد نے  
 یہ ہیرت ہو دنیا پائی ہو کیا اُس کی غلی سے  
 ہوئے اُس روش کے جلوہ تماشاں کے آگے  
 ہر افشاں جو ہر آئینہ میں مثلِ تہِ زن میں  
 کروں کیا ہوشیاریوں سے مری حالتِ مخالف ہو  
 مرادِ مہب جدا سے مری ملتِ مخالف ہو  
 نجانوں نہایت باہریوں پر محبتِ مخالف ہو  
 نکلے ڈالا ہوا محسوس میں کیا محبتِ مخالف ہو

جو گل ہوں گلشنِ نیش ہوں گلشنِ نیش ہوں گلشنِ نیش ہوں

مقامِ شکوہ کیا ۵ درد اگر لاکھوں دے مجھ کو      ذریعے بھی تو بخشے درد کی برداشت کے ٹھکانے  
سبکدوشی نہو گی اس کے احسانات سے مجھ کو      ہزاروں دل لے جو ش جنون عشق نے مجھ کو

سید ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

خیالِ گیسو سے پرہیز میں ناپید چو لیاں ہیں      بتوں کے دم میں یا ہوں کس سیدہ مسلماناں میں  
اداپران کی ہر زہ کی طرح کیونکر نہ قرباں ہوں      اسدِ زندانیِ تاثیر الفت لائے خواہاں ہوں  
نغمہ دستِ آرزو ہو گیا ہر طوق گردن میں

(۶۱)

طمانیتِ دل ارباب میں خاک نہیں      خیالِ زر کے سوا اور سر میں خاک نہیں  
چمورپن ہو یہاں اور گھر میں خاک نہیں      مرے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں  
سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

خالِ ہونکہ وہاں بختِ نارسا لے جائے      کوئی اٹھا کے چہن تک نفس مرا لے جائے  
غرض ہو کیا اسے صیاد کی بلا لے جائے      مگر غبارِ ہونے پر ہوا اڑا لے جائے  
وگر نہ تاب و توان بل و پر میں خاک نہیں

ہوئے ہیں فرشِ زمیں گلِ بہار بے حد      کھڑا ادب سے سرِ ماہِ سر و خوش قد

وجودِ عینِ مرکبِ گلوں سے شاید ہی      یہ کس بہشتِ شمائل کی آمد آمد ہو  
 کہ غیرِ جلوہ گل رہگزر میں خاک نہیں  
 جو فکروں مجھے ہوتی تو یوں نہ گھل جاتا      سنبھالتا کسی صورت سے اس کو بھلاتا  
 مجھے ہی جب نہیں پروا وہ کیوں نہ کھاتا      بھلا اُسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا  
 اثر مرے نفس بے اثر میں خاک نہیں  
 کیا خدانے نہ مجھ کو کسی سے شرمندہ      ہوا کسی کی نہ منت کشی سے شرمندہ  
 نہیں ای کچھ بھی تو ہوں اپنے جی سے شرمندہ      ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ  
 سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں  
 دھامِ طالبِ حسنِ المآب میں و کشش      کسی کی یاد میں بے ارتباب ہیں میکش  
 زمانہ کہتا ہست شراب ہیں محو کشش      خیالِ جلوہ گل سے خراب ہیں میکش  
 شراب خانہ کی دیوار و دریں خاک نہیں  
 جو دیکھتے ہیں مضامینِ تازہ کی آمد      مذاقِ اڑاتے ہیں حرزِ اتمامِ الِحد  
 کہا جب ہی غالب نے ہو کے دق بے حد      ہمارے شعر میں اب صرف دل لگی کے سد  
 کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

(۶۵)

ہم سے نہ کہیے بار بار کرتے ہو یا کئے کیوں  
اپنے ہی دل سے پوچھیے زخم جگر دکھائے کیوں  
فرطالم سے خون لال شک میں پہنچائے کیوں  
دل ہی تو ہر نہ سنگ خشک دس بھڑائے کیوں

روینکے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

اس میں کسی کو دخل کیا بلکہ عدو نہیں زمین  
سر پہ ٹھاکے ہم اسے لے تو بجائینگے کہیں  
اپنا نشان مٹائینگے صورت نقش پا یہیں  
دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاناں نہیں  
بیٹھے ہیں رہ گزر ہم کوئی ہمیں ٹھاکے کیوں

چشم بشر میں ہو اگر حسرت مہر نیم روز  
دیکھ سکے نہ بھر کے جی طلعت مہر نیم روز  
تاب کہاں کہ ہو اسے لو بیت مہر نیم روز  
جب وہ جمال و لغز صورت مہر نیم روز

آپ ہی ہو نظارہ سوز پرے میں منہ چھپائے کیوں

خوف سے تیرے دہروا نہیں سکتے مہر و ماہ  
ان کو کہاں یہ تاب ہو دیکھیں عریض جلاہ گاہ  
سکتہ ہوا نہ کو بھی ڈالے تو اگر نگاہ  
وشہ غمرہ جانستاں ناوک ناز بے پناہ

تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

دہر میں شادی و اہل میں نون ایک ہیں  
زندگی و محن بہم اہل میں نون ایک ہیں  
قطرہ آب آسیم اہل میں نون ایک ہیں  
تبد حیات و بند غم اہل میں نون ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اُن سے مدد کا سادہ پتہ لگئی بواہوس کی شرم  
باندھ کر آیا تھا کفن پہ لگئی بواہوس کی شرم  
نال کیا وہ تیغ زن رہ گئی بواہوس کی شرم  
حسن اور اس چمن ظن لگئی بواہوس کی شرم  
اپنے یہ اعتماد ہو غیر کو آزمائے کیوں

ہم کو یہ دھن کہ چھٹ بجے راہ صواب پاس وضع  
اس کو یہ صندل دھستے ہو کچھ تو جواب پاس وضع  
راہ رسم و راہ ہو غمے خواب پاس وضع  
وال وہ غرور و عزو نازیاں یہ خواب پاس وضع  
راہ میں ہم ملیں کہاں نہ وہ بلائے کیوں

میں ہوں تلاش یار میں کہتے ہو جس کو گم رہی  
بک نہ لگاؤ ہمدموں تم نے یہ بات کیا کہی  
اس کی بھلاہر سے مجھ کو ہو خوب آگئی  
ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی  
جس کو ہودین و دل عزیز اسکی گلی میں جاکیوں

کم ہونی میکشی کچھ دور مدام بند ہیں  
بزم سے اٹھ گئے سبویا کہیں جام بند ہیں  
میں خوشی سے میرزا خاص نہ عام بند ہیں  
غائب تھے بغیر کون سے کام بند ہیں  
روئے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

—————

(۶۶)

نہ اٹھائے سے مجھے کیا یہ بتا دیا کہ یوں صاف جواب دے مجھے میرے سوال کا کہ یوں

چپے چلے گا کام کیا لب تو ذرا ہلا کہ یوں! غنچہ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں

بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

غمرہ جو اس کا دیکھ لے سینے میں پھر نہ دل رہا ناز و کرشمہ دیکھ کر ہوش اڑیں رہے ہے  
بیخ نگہ اگر چلے ہو کے ہو جگر نہ ہے پریش طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کے

اس کے ہر اک شاہ سے نکلے ہو یہ ادا کہ یوں

ہیم و امید میں ہے کیا کہیں کس طرح جیے حسرت یا س غیشِ عمر کے دن گنوا دیے  
ہاتھ اٹھا اٹھا کے ہم دل سے دعا کیا کیے رات کے وقت مہرے ساتھ رقیب کو لیے

آئے وہ یاں خدا کرے پر کرے خدا کہ یوں

لی ہیں جگر میں چٹکیاں طور بھا تو دیکھئے مجھ کو جواب کیا دیا طرزِ ادا تو دیکھئے  
کیسا حجاب ٹھا دیا شرم و حیا تو دیکھئے غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے

سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھت کہ یوں

سکتے میں خاص عام ہیں عربِ جمال پر سے ہونٹ سیئے ہوئے سے ہیں آج تو اہلِ بزم کے  
حکم سکوت بھی ہمیں گو نہ دیا ہوشوخی نے بزم میں اس کے وبرو کیوں نہ خوش بیٹھے

اس کی تو خامشی میں بھی ہو یہی دعا کہ یوں

کیا کہیں بزمِ یار میں بات ہی کچھ بگڑ گئی مفت میں ہو گیا مرن مرن نظر تھی دل لگی

دیر تک امنی ہی بات بن آئی غیر کی میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے ہی  
سُن کے ستم طریقت نے مجھ کاٹھا دیا کہ یوں

اُس کو دکھاؤں عشق کا جوشِ خروش کس طرح لاسے زباں پہ حالِ دل شمعِ جھوٹ کس طرح  
ثوق ہوں کہیں بیانِ بدہ و گوشت کس طرح مجھ سے کہا جو یا نے جاتے ہیں ہوش کس طرح  
دیکھ کے میری بخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

آرشد وہاں جو تھی طبع اسی میں شاد تھی تادریار ہو گزر دل کی یہی مراد تھی  
خاک میں بھی اگر ملا خاک بھی وقفِ یاد تھی کب مجھے کوئے یار میں بہنے کی وضع یاد تھی  
آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پاکہ یوں

عشق میں صدق ہو اگر اُس کا مالِ ہموال جزوِ جوکل سے جا ملا ہو گیا ایک سُن کا حال  
دہر سکون و اتحاد کیوں ہو پھر یہ اتصال گرتے دل میں ہو خیالِ صل میں شوق کا زوال  
موجِ محیطِ آب میں مائے دوستِ پاکہ یوں

یوں تو ہیں ہند میں بہت فنِ سخن کے مدعی ہیں یہ جدا ہی بنائیں طرزِ ادا کا و رہی  
حق تو یہی جو میرزا ختم ہوئی سخنِ نوری جو یہ کہے کہ رنجتہ کیونکہ ہو زنگِ فارسی  
گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا لیں

## ردیف (و)

(۶۷)

کچھ بات ہو بطر زمامت ہی کیوں نہ ہو عزت ازی ہم کو خواہ امانت ہی کیوں نہ ہو  
کچھ رکھئے ہم سے لیں دیت ہی کیوں نہ ہو وارستہ اس سے ہیں محبت ہی کیوں نہ ہو  
یکجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

مکن نہیں ہو دل میں گزرا نبساط کا دل میں ہ شوق و ذوق کہاں ارتباط کا  
اب نہ میں رہا نہ زمانہ نشاط کا چھوڑا نہ مجھ میں صنف نے رنگ اختلاط کا

ہو دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

آزادگی کا اپنی مجھے مل گیا صلہ ٹوٹا ہی التجا سے اعانت کا سلسلہ  
تکوہ کسی کا ہو نہ کسی کا مجھے گلہ ڈالا نہ بی کسی نے کسی سے معاملہ

اپنے سے کھینچتا ہوں نجات ہی کیوں نہ ہو

لیں چمکیاں جگر میں جو مجھ سے کبھی ملا چھیرا ہمیشہ شکوہ دشمن کا سلسلہ  
کی بات بھی تو وہ کہ دیا جس نے دل ہلا ہو مجھ کو تجھ سے تذکرہ غیب کا گلہ

ہر چند بریل شکایت ہی کیوں نہ ہو

کیسوی ہو بشر کو میسر یہ ہو حال اس کے لئے ہو غلوٹ غلوٹ کا ایک ٹال



تنہا بھی ہو تو نفس سے تہی ہو چیل و قال      ہو آدمی بجائے خود اک محشر خیال  
 ہم آئین سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو  
 ہم انقلاب سے متاثر ہوں کیا مجال      ہرگز نہ لیں ہزار سبق دے جہاں کا حال  
 وارستگی میں تہ و غیرت کا رکھ خیال      ہنگامہ نہ بونی ہمت ہو انفصال  
 جاہل نہ کہتے دہرے عبرت ہی کیوں نہ ہو  
 آزادگی جہان سے فرزا نگہ نہیں      کیا رم ہو اور چیز جو دیوانگی نہیں  
 دنیا سے بھاگنا کوئی مردانگی نہیں      وارستگی بے بیگانگی نہیں  
 اپنے سے کرنے غیر سے جنت ہی کیوں نہ ہو  
 رکھتا ہو شاہراہ فنا میں قدم کوئی      ہوتا ہو محو دل سے خیالِ عدم کوئی  
 اس فکر جاں گداز سے پھٹتے ہیں ہم کوئی      مٹتا ہو قوتِ فرصتِ مستی کا غم کوئی  
 عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو  
 کرتے پھریں رقیبِ چناں و چنیں اسد      جاتے ہیں اس کے کوچے سے عزرا کہیں اسد  
 دکھیں گے آپ قبر ہماری وہیں اسد      اُس فتنہ خوکے ڈسے اب کھٹتے نہیں اسد  
 اس میں تھما رہے سر یہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

ستایا تو نہیں میں نے کسی مرغِ نوازن کو      مجھے یوں پکھتے ہیں جیسے پکھیں اپنے دشمن کو  
فغانِ تہا ہوں میں جب دکھتا ہوں نشیمن کو      قفس میں تہں گرا چکا کھنجر جا میں میرے شیون کا

مرا ہونا بڑا کیا ہو تو اسخجانِ گلشن کو      مگر یہ روسیہ اس کے شش میں تو ہر دم  
وجودِ غیرِ حب تک ہی تو مجھ کو کچھ نہ کچھ غم ہو      نہیں گر ہمدی آساں ہو یہ شک کیا کم ہو  
نہ دی ہوئی تھرا یا آئے دوستِ تن کو

بھرتیا بجیہ گر کا دل بھی ظالم میری حالت پر      اثر ڈالانہ اس منظر نے بھی تیری طبیعت پر  
ہنسی آتی ہے مجھ کو تیرے دعوائے محبت پر      نہ نکلا آنچھ سے تیری کائناتِ سوسِ حراست پر

کیا سینے میں جس نے نہ بچکانِ مشکانِ سوزن کو      کہ یا اے سکونِ مطلق نہیں قلبِ مشوش میں  
جنوں کی حرکتیں قائم ہیں ہوں استغش میں      خدا شرمائے ہاتھوں کو کہتے ہیں کشاکش میں  
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دہن کو

ہم اپنا غنّ خونِ نابجا آساں سمجھتے ہیں      رواں ہونا گلے پر تیغ کا آساں سمجھتے ہیں  
نکلنا جانبِ قتلِ ترا آساں سمجھتے ہیں      ابھی ہم قتلِ گہہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں

ہنیں دیکھا شنو و مجھے خوں میں سے تون کو

ہاں ستوراہن سے سناں و تیرے کا ہمیشہ مادہ اس میں ہاں تشریف کا  
زمانہ اب اس کے لائق تو قیرے کا ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیریں کا

کیا بیتاب کاں میں جنبش جو ہر نے آہن کو

مجھے کیا اس سے ابریر گھمے یا گھر کے کھل جائے دیر خوش آب پانی کی جگہ یار و زبیرائے  
نیستی سمجھتا ہوں اگر کالی گھٹا چھائے خوشی کیا کھیت پر سیے اگر سو بار ابرائے  
سمجھتا ہوں کہ دھوٹے جو بھی سے برق خرمن کو

زبیر گھمے اس کے سانسے مثالِ جاناں ہے بتوں کو جان کر سگانِ کعبہ دل سے قرباں ہے  
اگر کبھی حقیقت یہاں لو وہ پکا مسلمان ہے وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے

مے بیت خانہ میں کبھی میں گا رو بہرہن کو

پھر ایا سرگفتِ شوقِ اجل نے چار سو مجھ کو لیے پھرتی تھی زور جاں دہی کی آرزو مجھ کو  
رہی جلا دہی کی زندگی بھر جستجو مجھ کو شہادت تھی ہری قسمت میں تھی یہ جو مجھ کو

جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

جو ہوتا مال مٹی نیند کیونکہ خاک پر سوتا زور و گوہر کے ہوتے کس طرح ٹھنڈے جگر سوتا  
متاعِ رفہرہ جاتی تو پھر کیا بے خطر ہوتا نہ لٹا دن کو تو کب ات کو یوں بے خبر سوتا

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں بہن کو

مضامین کے خزینے بہتے ہیں سینے میں شاعر کے

خزینہ دار و مالک ہیں سخنوران و فغان کے

گہر کی قدر کیا ہو سامنے الفاظِ نادر کے

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جاہر کے

جگر کیا ہم نہیں کہتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

دراقدس کا اک دربان ہو مفتوح ہیں غالب

سکندر کو ہو فخر آستانِ بوسی یہیں غالب

اسی دروازہ پر رکھتا ہو مرزا بھی ہیں غالب

مرے شاہ سلیمان جاہ سے نسبت نہیں غالب

فریدوں و جم و یکسر و دوا رب و سہمن کو

۹

شکرِ سنانی من ہوئے اُس خستہ تن کے پاؤ

جانا کہاں کہ ہو گئے ایک ایک من کے پاؤ

کیا جانتا تھا وہ نہیں جھوٹے سخن کے پاؤ

دی سادگی سے جان پڑوں کو مکن کے پاؤ

ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرِ زن کے پاؤ

جی ہیں ہو چجے بتِ نازک بدن کے پاؤ

جلیے سجاہری پوچھے ہیں برہمن کے پاؤ

ہاتھ آئیں کس طرح مگر اُس پُرفتن کے پاؤ

دھوتا ہوں میں پیچے کو اس سیم تن کے پاؤ

رکھتا ہو ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤ

کہتے تھے اپنے نفس کو ہم نامِ سرا ہو یہ

بچتے تھے اس کے سایہ سے گویا بلا ہو یہ

آئارہ اب ہمارے لئے ہو گیا ہے یہ بھلا گئے تھے ہم بہت سوابس کی سزا ہے  
ہو کر اسپر دابتے ہیں راہزن کے پاؤ

سارا بدن ہو فرط جراحت سے چور چور عاجز ہوں میں دواؤ دوش سے تو کیا تھو  
جرح کچھ علاج تو ان کا بھی کر ضرور مریم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور  
تن سے سوا نگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤ

صد چاک دل ہو صورتِ صد برگ چار برگ صحرائیں تھکانہ کچھ بھی غم برقہ و تلک برگ  
پھر ہو چلا ہو قبر میں وحشت کا ساز و برگ اللہ سے ذوقِ وحشت نوروی کہ بعد مرگ  
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤ

گلبن کی شاخِ شلف ہوئی جامِ گل بکف ہیں قبریوں کی تاک میں سب سرو صفت  
کس کس کی جان دیکھیے امسال ہو تلف ہو جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف  
اڑتے ہوئے اُکھٹے ہیں مرغِ چین کے پاؤ

ماز و نراکتِ مبی بھی دیکھی سیسی نہیں رفقا کے خیال سے تھکتا ہو وہ حسین  
ظاہر ہیں سب تنہا کے آثارِ ہم نشین شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں  
دیکھتے ہیں آج اس بتِ ناکثان کے پاؤ

ایسا سخن شناس تو شاید نہ ہو پڑھ کر سخنِ ظفر کا جو لب چاٹتا نہ ہو

مرزا یقین کیوں مجھے اس قول کا نہ ہو غالب مرے کلام میں کیوں کہ مرزا نہ ہو  
پتیا ہوں دھوکے خسر و شیریں سخن کے پانوں

❖  
(۷۰)

یہ قدم رنچہ پا کیا کوئی کم ہو ہم کو ان کا لانا ہی سر بزم کرم ہو ہم کو  
خاک بوسی کا عجب شوق اتم ہو ہم کو واں پہونچکر جو غش آتا پڑی ہم ہو ہم کو  
صدرہ آہنگ میں بوس قدم ہو ہم کو

سہریں سودائے چمن ہو نہ ہو اے گلشن تیرے در سے ہو نہیں پاؤ اٹھانا بھی کھن  
لاغری وہ ہو کہ اک بال ہیں گویا ہمدن ضعف سے نقش پڑی مور ہو طوق گردن  
تیرے کپچے سے کہاں طاقت رم ہو ہم کو

آج ہمدرد زمانے میں کہاں پیدا ہو ایک کا ایک کو ہو درد تو بے جا کیا ہو  
غم سے جو واسطہ میرا ہو وہی دل کا ہو دل کو میں اور مجھے دل مجھ و فار کھتا ہو  
کس قدر ذوق گرفتاری ہم ہو ہم کو

دائے غفلت کہ نہیں اتنی خبر بھی اب تو سامنے کون ہو اور آپ نے دیکھا کس کو  
ہم سے اب دیدہ و دانستہ ہوا غماض ہو جو جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو  
یہ نگاہ غلط انداز تو ہم ہو ہم کو

رہنے دیں دست ہی طرح ہیں گوشہ نشین      میر گلزار سے دل اور بھی ہو گا غمگین  
 کھائے زخم جگر پر یہ ہمیں تاب نہیں      رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں  
 نالہ مُرغِ چمن تیغ و دم ہو ہم کو  
 صاف ظاہر ہو کہ وعدہ تھا مگر صاف تھا      وقتِ اصرار کھلا آ کے نتیجہ اس کا  
 ایسی قسموں کا بھروسہ ہمیں کیونکر ہوتا      سر اڑانے کے جو وعدے کو بکتر چاہا  
 ہنس کے بولے کہ تے سر کی قسم ہو ہم کو  
 بے سبب اشکِ رواں کا تو نہیں اندھا نا      عین جو ہر ای یہ ان کا کہ ہوں آنکھیں غبار  
 نہ ہو روئیں تو مڑگاں پہ کہاں آئے بہار      دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ و لیکن ناچار  
 پاس بے روفی دینا اہم ہو ہم کو  
 داخل شکوہ سمجھتے ہو جو خاموشی کو      حال کیا ہو جو کبھی نالہ پر در دُسنو  
 کیا کریں چین کسی طرح نہ جب لینے دو      تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو  
 ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہو ہم کو  
 غل حیران ہو کس وجہ سے چھوڑی ہٹی      کچھ تو ہو جس لئے طو کی ہو مسافت اتنی  
 ایک بیک چھوڑ دی کیوں الفتِ راحت کی      لکھو آئے کا باعث نہیں کھلتا یعنی  
 ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہو ہم کو

جب چلے گھر سے تو مٹی دل میں پاں اور ہی لہر  
بیٹھ رہنا ہیں اور ترک سفر ہو اک قہر  
قصہ ہی دور کا مانع جو نہ ہو گردش ہر  
مقطع سلسلہ شوق نہیں ہو یہ شہر

عزم سیر نجف و طوافِ حرم ہو ہم کو  
آپ کی طرح ہی مرزا بھی کرم کا طالب  
دل کھنچا جاتا ہو اربابِ کرم کی جانب  
وجہ نقل و حرکت کیا کہوں مرزا صاحب  
لئے جاتی ہو کہیں ایک توقع غالب  
جادو رہ کششِ کافِ کرم ہو ہم کو

۵۱

کیا قابلِ خطاب وہی روسیہ ہو  
مجھ پر نہ بھول کر بھی کرم کی نگاہ ہو  
چاہو اسی کو دل میں گراں کی چاہ ہو  
تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو  
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

الزام رکھ کے غیر پہ کیا صاف ہو گئے  
گویا یہ خون ہی نہیں دسے جناب کے  
فرماتے ہو کہ قتل کیا تجھ کو غیر نے  
بچتے نہیں مواخذہ روزِ حسرت سے  
قاتل اگر رقیب ہو تو تم گواہ ہو

جس طرح قتلِ خون میں حسین بے ہراس ہیں  
کیا وہ بھی یوں ہی دشمن جانِ اناس ہیں  
کیا یوں ہی ان کے شینہ بھی قتلِ یاس ہیں  
کیا وہ بھی بے گنہ کش حقِ ناشناس ہیں



مانا کہ تم بشر نہیں غور شدید و ماہ ہو

محل تمام شوق بقائیں ہی بے قرار تکتے ہیں غیسر بھی نگہ سے بابر  
یہ رشاک کس طرح نہ کرے مجھ کو دل نگار اُبھرا ہوا نقاب میں ہو ان کے ایک تار

مرا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

رکتانہ میکن سے تو رکھتا جگہ کی قید آزاد کے لیے نہیں زیبا جگہ کی قید  
وارستگی بجای تو بے جا جگہ کی قید جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید

مسجد ہو مدبر سے ہو کوئی خانقاہ ہو

ہر چیز باغِ خلد کی ہی منتخب درست حور و قصور و شہد و انار و غنبد درست  
مشہور ہے کہ ہو وہ مقام طرب درست سُننے ہیں جو بہشت کی تعریف سے درست

لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

سُونانہ ہو گا دیس اگر ہم نہ ہوں کہیں ذاتی نہ کوئی گھر ہے نہ گھر کی کہیں زمیں  
مرا وجود شاہ ہی رونق فزاے دیں غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں

دُنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

تھیں ضبط سے جب کام لو تو کیونکر ہو تجھیں نہ فرصت تدبیر دو تو کیونکر ہو

اب اس سے حضرت بل بات ہو تو کیونکر ہو  
کئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو

کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

حصولِ صلت و دیدار تو ہی امرِ محال  
لفظ ہی باعثِ تسکین تصورِ مثال

امید و یاس کو سمجھا ہو آرزو کا آل  
ہماری ذہن میں اس فکر کا ہونا مصال

کہ گرنے ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

کبھی خیال کہ اظہارِ مدعا کیجے  
کبھی یہ وہم کہ ہرگز نہ یہ خطا کیجے

کہاں تک اپنے مقاصد کا التوا کیجے  
ادب ہی اور یہی کشمکش تو کیا کیجے

جیا ہی اور یہی گو ملو تو کیونکر ہو

متمن را دل ہو کہ رشک و حسد کا بغینہ  
بھرا ہی رہتا ہی بغض و نفاق سے سینہ

یہاں تک اپنے مقابل سے ہر تمہیں کینہ  
الچھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ

جو تم سے شہر میں ہوں ایک تو کیونکر ہو

وہ رشک مہرِ رات بھر تو جلوہ نما  
منود ہونے نہ پائی سحر کہ چل نکلا

مری نگاہ میں اندھیر کیوں نہ چھا جاتا  
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا

وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

لیا جو فرطِ عقیدت سے ہم نے بوسہ پا  
تو تم نے غایتِ نخوت سے سر کو ٹھکرایا

نہ شرم کچھ تھیں بندوں کی ہر نہ خوف خدا تھیں کہو کہ گزارہ منہم پرستوں کا  
بتوں کی ہو جو بھاری سی ہو تو کیونکر ہو

کہیں حضرت دل خاک وہ بھاری قدر ہوئی نہ کچھ بھی ہماری سوائے خواری قدر  
گنوا چکے ہوں ہاں ہم جب اپنی ساری قدر ہمیں پھر ان سے اُمید اور انھیں ہماری قدر  
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

ہیں تو آجہ قرآن تھا جو مضمون تھا بجا ہی ہم نے جو پڑھ کر کہا ہو اُمتا  
وفا ضرور کریں گے وہ وعدہ فردا غلط نہ تھا ہمیں خط پر گمان لگی کا  
نہ مانے دیئے دیدار جو تو کیونکر ہو

سکوں سے کام نہ لوں ضبط اب ہیں تو قصود مگر ہوں ضبط میں اس اضطراب سے مغفود  
زمانہ بھر میں نہ مرزا سا پائے گا صبور مجھے جنوں نہیں غالب دے بقول حضور  
فراق یا میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

\*\*\*

(۷۳)

جو ناب ضبط غم ہوا شک نکھوں سے رواں کہیں کسی سے دل کی بیٹائی کا دہ پردہ بیاں کہیں ہو  
جو بودر دانا تو شکوہ درو نہاں کیوں ہو کسی کو دوسے کے دل کوئی نوا سخ فغاں کہیں ہو  
نہ ہو جب ل ہی پہلو میں تیرے چہرہ میں نا کہیں ہو

وہ ہر دم سلسلہ توڑیں تو ہم کب تک سے جو رہیں  
 رہیں ہم جو نظارہ کہاں تک جیت نہ توڑیں  
 خنواہ ہیں تو ہوں ہم رشتہ تمکین کو کیوں توڑیں  
 وہ اپنی خونہ چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں  
 سب سے پیش کیا چھپیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہیں

چھپا رکھا تھا ہم نے اپنے دل میں ازل الفت کو  
 نہ کی اُد صبر و استقلال سے جھیل اہر افیت کو  
 خیر کیا تھی ہمارے در پہ نہانی کی غفلت کو  
 کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو  
 نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہیں

نہ کرنے دے ہمیں وحشت میں بھدہ اپنی چو کھٹ کا  
 پہاڑوں تاک کے پکار بہری سو داسے سراپنا  
 ہیں ہر کچھ نہ کچھ تو چارہ جو شش جنوں کرنا  
 وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا  
 تو پھر اسی سنگ ل تیرا ہی سنگ ستاں کیوں ہیں

گل و سرور یا حین کا مفصل ذکر کر ہم دم  
 کڑا دل کر کے سب حالات مجھ سے کہہ کر ہم دم  
 یہ میرے پوچھنے پر تو نے تھا ما کیوں جگر ہم دم  
 نفس میں مجھ سے رو دا دہن کہتے نہ ڈر ہم دم

گری ہو جس پہ کل بجلی وہ میرا آئینا کیوں ہیں  
 نظربندی کیسی ہو مہا کیسا ہو سمجھاؤ  
 طبعیت کو عجب کھن ہو اس گٹھی کو سلجھاؤ  
 یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں لیکن پہنلاؤ  
 اگر پر دن نہیں مد نظر تو سامنے آؤ  
 اگر دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہا کیوں ہیں

کچھ ایسا ہی ہر انسان کی طبیعت کا تھا خدا ہی کہ یہ اپنی خطا کو غیر کے سہم ڈال دیتا ہے  
 ہیں ٹھہرے گنہگاروں میں یہ انصاف اچھا ہے غلط ہے جانبِ دل کا شکوہ دیکھو جہم کس کا ہے  
 یہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ رخ کا آئینہ دنیا کی حیرانی کو کیا کم ہے پریشیاں نصفِ عالم کی پریشیاں کو کیا کم ہے  
 نگاہ تیز جانبازوں کی قیابی کو کیا کم ہے یہ فتنہ آدمی کی خانہ دیرانی کو کیا کم ہے  
 ہوئے تم وہ دست جس کے ثمن اس کا آسمان کیوں ہو

غایت تم نے کی جس پراسی کا ناک میں دم ہے ہوئے غمخوار جس غمگیں کے تم وہ طعنہ غم ہے  
 تھاری مہربانی میں بھی جلا دی کا عالم ہے یہ فتنہ آدمی کی خانہ دیرانی کو کیا کم ہے  
 ہوئے تم وہ دست جس کے ثمن اس کا آسمان کیوں ہو

مہبتِ رشک کی ظلم و دن رات بہتے ہیں تھادی مہربانی سے پریشیاں حال رہتے ہیں  
 امنی سو جھی ہو تم کو شکایاں نکلوں سے بہتے ہیں یہی ہی آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں  
 عذو کے ہو لیئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

ابھی آئے ابھی جاتے ہو جاناکس کو کہتے ہیں یہ آنا ہی تھا راتوں آنا کس کو کہتے ہیں  
 کم بختا ہی اس کو تو جلا نا کس کو کہتے ہیں یہی ہی آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں  
 عذو کے ہو لیئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

جو کہتا تھا بڑی اور غیر کے گھر محل آرائی تو ہنس کر ٹالتے تھے مجھ کو ٹھیرتے تھے بڑائی  
 لگے اب بحث بھی کرنے جتا کر اپنی دانائی کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں سوائی  
 بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہنا کہ ہاں کیوں ہو  
 چلا جادو نہ جب قہر نہ اس کے برو غالب کرے گی کیا اثر پھر خاک تیری گفتگو غالب  
 سر بزم اس سے بے فائدہ کیوں بدو غالب نکالا چاہتا اور کام کیا طعنوں سے تو غالب  
 ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

## روایت (۱)

(۷۴) سب ملتوں کے ساتھ مراعات چاہیے آپس میں اتحاد ہو وہ بات چاہیے  
 رندی و زراہدی میں مساوات چاہیے مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے  
 بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیے  
 رخ کے قریب زلف کی ظلمات چاہیے دن سے ملی جلی ہوئی یہ رات چاہیے  
 ہر شوکا اس کی منہ ہی سے اثبات چاہیے مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے  
 بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیے  
 مصروف آپ مشوق بھائی میں تھے عمر بھر مطلق نہ تھی کسی دل مظلوم کی خبر

بیٹھے ہیں اب تو ہاتھوں سے تھلے ہوئے جبکہ عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر

آخر ستم کی کچھ تو مصافات چاہیے

جرات تو دیکھ اس دل کو تاہ دست کی اس نامراد نے کبھی ہمت نہ پست کی

اب غم ہو نیست کا نہ خوشی اس کو ہست کی دے داد ای فلک دل حسرت پرست کی

ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مصافات چاہیے

صورت کو ان کی روح جب اپنی ترس گئی نہ بیرکار گر نہ ہوئی کوئی دید کی

اس سے زیادہ شکل رسائی کوئی نہ تھی سیکھے ہیں مہر خوں کے لیے ہم مصوری

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

یہ لوٹتا ہو ثروت و اقبال و جاہ کو کرتا ہوں غافل اس سے دل عیش خواہ کو

سمجھا نہیں ثواب کبھی اس گناہ کو مے سے غرض نشاط ہو کس رو سیاہ کو

اک گو نہ بخود می نگھے دل ات چاہیے

بیکار شریں ہم وہ محرک اگر نہ ہو ق مرزا یہ راز وہ ہو جو پاتے ہیں از جو

اسی کا سب ظہور عدم سے ہو جان لو نشو و نما ہو اصل سے غالب فروع کو

خاموشی ہی سے نکلے ہو بات چاہیے

ہر لہجہ کی بول بول جہاں میں فصاحت جدا ہر گلستاں نے پائی ہو آب ہوا جدا

ہر گل کی بوجہ ایزدیش اور ادوا جدا  
ہی رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

سر میں اگر خودی ہو نہ لے نام بے خودی  
خود میں ہی تو نہ کر ہو سر جام بے خودی

کر جہہ شکر کا جو ملے جام بے خودی  
سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگام بے خودی

رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیئے

قائم ہو ایک حال پہ کس طرح آدمی  
کرنی ہو راہ طواسے جذب و سلوک کی

ہر فعل کی ہو حالت موجودہ مقتضی  
سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگام بے خودی

رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیئے

خالی نہ ہو حقیقت عرفاں سے کوئی بات  
انسان حرف حرف سے پیدا کرے نکات

نظارہ صفات سے ہو جائے محو ذات  
یعنی بحسب گردش پہیمانہ صفات

عارف ہمیشہ مست و ذات چاہیئے

(۷۵)

ذرا سی جان تن میں ہو فدا کرنے کو ہوں وہ بھی  
رگوں میں جو لہو تھا ہی سرشک لالہ گوں وہ بھی

جگر رکھتا تھا لیکن اب ہی با حال ہوں وہ بھی  
بساط عجز میں تھا ایک لک قطرہ خون وہ بھی

سور ہٹا ہی بانداز چکین سرنگوں وہ بھی





یہ کیا کم مہربانی ہو کہ ٹالا بات کو اس نے  
خدا نا خواستہ دل سے نہ وہ روٹھنا نہ ہم بھٹے  
وگر نہ معرفت میں لینے کے دینے پر گئے ہوتے  
کہتے اس شرح سے آرزو ہم چندے مختلف سے  
تخلف بر طرف تھا ایک انداز جنوں ہ بھی

نکالے کو نسے ارمان دل آخر مقدر نے  
طبیعت کو ذرا سمجھاؤ سا ہی اس قصور سے  
کہ ہم ہوں منتظر پیاب اجل کی آمد آمد کے  
خیال مرگ کیا تسکین دل آرزوہ کو بخشے  
مرے دام تمنا میں ہواک حیدر زبون ہ بھی

سرشکِ خون بہانے سے تو تھا یہ مدعا ہمدم  
لو اس سے تو سوزِ قلب نہ دنا ہو گیا ہمدم  
کہ دل کی آگ اس پانی سے کم ہو گی فراہم  
نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم  
کہ ہو گا باعثِ افزائشِ رودر دل وہ بھی

بجائی زور بازو پر جہاں تک اپنے اتراؤ  
بہرِ نیا وہ اس کے جوہر کو نہ چمکاؤ  
کہ تو تعریف اپنی سرخرو اس کو بٹھہراؤ  
نہ اتنا بھڑکشی تیغ بھاپر ناز مہراؤ  
مرے دریائے مینابی میں ہواک موجِ خون بھی

توق کیا سوال اس سے اگر اکے ور کا کیجے  
ہو غالی دکھانا ہی جو عرضِ مدعا کیجے  
مناسب ہو کہ اشکِ حسرت و ارماں پیا کیجے  
مئی عشرت کی خواہش ساقی گردوں کیا کیجے  
لیجے بیٹھا ہواک ڈوچار جام و از گوں بھی

آئینہ دیکھ میں مرزا ہوں کہ سے سرگرداں نہیں آئے میں تائیں سے ملنے کا کوئی سااں  
 کسی صورت میں لکھیے ہوتی بھی آساں مے دل میں ہو عاشقِ قیصل و شکوہ ہواں  
 خدا وہ دن کہے جو اس میں یہ بھی کہوں وہ بھی

۱۱۱۱۱

(۷۶)

نکالے گی نہ چکر سے ہمیں گردش زمانے کی یہ گردش جس قدر بھی ہو سزا ہو دل لگانے کی  
 نہیں پر اب کوئی صورت نہیں آرم پانے کی غم دنیا سے گریا پی بھی فرصت نہ ٹھانے کی  
 فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

اُسے اپنی تپش کا حال کچھ لکھ تو دیا یارب مگر خط کو مرے وہ پڑھ بھی لے اُمید کیا یارب  
 جلا ہی دے کہ سو زدل تو ظاہر ہو یا یارب کھلے گا کس طرح مضمون مے مکتوب کا یارب  
 قسم کھائی ہو اُس کا فونے کا فذ کے جلانے کی

اگر آہ آتشبار نالہ آتش افشاں ہو نہیں چارہ کہ عالم آشکارا رازِ پنہاں ہو  
 دباؤں یہ دہتی آگ کیونکر عقل حیراں ہو لپٹنا پر نیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہو  
 دے شعلہ ہو حکمت دل میں سو ز غم چھپانے کی

کوئی بیکار اُن کا جانب گزار جانا تھا گلستاں کو مگر اس رنگ سے مقتل بنا تھا  
 گلوں کو بھی تو اپنے زخم خور دوں میں لانا تھا انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھنا تھا

اُٹھتے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

مقدہ ہی میں تھا کچھ تجھ سے فسوں ساز پر مرنا  
بد انجامی تھی اپنی خوبی آغاز پر مرنا  
مناسب تو نہ تھا اس ظاہری انداز پر مرنا  
ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا  
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر غیب جانے کی

غمِ دُوریاں کسے شکووں سے جھپٹ کھل گئی اپنی  
طبیعت کی وہ قوت اور وہ جولانی غلط نگلی  
حسینوں کی اُٹھائے بات کس کو تاب ہو تپنی  
لکڑ کو بوجہ حادث کا تحمل کر نہیں سکتی  
مری طاقت کہ ضامن تھی تبوں کے نالٹھانے کی

زمانے میں نہیں سچی محبت کا نشان غالب  
جنھیں کہتے ہیں مخلص و ست لب ہیں کہاں غالب  
بیانِ حال میں صراحت مرزا کی زباں غالب  
کہوں کیا خوبی و ضلعِ ہمار زماں غالب  
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی بھی بارہائی کی

✱

(۷۷)

نڈاں سے بھی زیادہ ہر ایسا مکان ہو  
اک قید میں پڑے ہیں مصیبت میں جان ہو  
یہاں نقطہ خیال زمیں کا نشان ہو  
کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہو  
جس میں کہ ایک ہفتیہ مور آسمان ہو

سیارے گھومتے ہیں فلک پر ترسے لیئے  
اسباب اور کچھ بھی نہیں ان کی سیر کے

چکر دیئے ہیں چرخ کو تیری تلاش نے  
ہر کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے

پر تو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہو

بیچارہ دل حوادثِ دنیا سے ہو بہ تنگ  
ہو کیوں نہ چور چور کہ کھایا ہو سخت سنگ

اس سنگ نے کچھ ہم سے ہو میری عقل دنگ  
حالانکہ ہو یہ سیلی خوار اسے لالہ رنگ

غافل کو میرے شیشے پہ ہو کا گمان ہو

اپنا تو دل تھا آگ سے گویا بھرا ہوا  
کہ تا قیام بھڑوہ اس آتش کدے میں کیا

خالی تھا سوزِ عشق سے ہاں دل قریب کا  
کی اس نے گرم سینہ اہل ہوس میں جا

آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہو

کچھ بات جھک کے کان میں کہنا سہا نہ تھا  
آہ کوئی سبب بھی تھا دامن کی آڑ کا

اب تم ڈھٹائی سے تو نہ جھٹلاؤ ہر ملا  
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا

بس چپ ہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہو

آنکھیں لگی ہیں جانبِ در انتظار میں  
تصویرِ ساخوش ہو شوقِ نگار میں

آیا ہو گشتِ کر کے ابھی خارزار میں  
بیٹھا ہو جو کہ سایہ دیوارِ یار میں

فرماں والے کشورِ ہندوستان ہو

غم نے لہو پلانے کا اچھا صلا دیا  
اک داغِ جاں گداز جگر پر لگا دیا

اس داغ نے تمام جگر کو حبلہ دیا ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا  
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہو

اس پر چڑھتے نہیں وہ قہر کی نظر ظاہر ہوا نہیں ہی بھروسہ رقیب پر  
مہرِ اکا بخت بر سرِ یاری ہو سربہر ہو بائے اعتماد و فاداری اس قدر  
غالب ہم اس میں غش ہیں کہ نامہربان ہو

(۷۸)

یا تو میں کرتا تھا غم سے آہ و فزاری ہائے اور نہ کہ تانا تھا کچھ غم گساری ہائے  
یا دم آخر جفا فی شرطِ یاری ہائے ہائے درد سے میرے ہو تھکونے فزاری ہائے ہائے  
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شکاری ہائے ہائے

دل کا دل ہی میں یا کچھ بھی نہ نکلا جو صلہ پست ثابت ہو گیا الفت میں تیرا وصلہ  
منہ چھپا یا بچ سے بس اتنا ہی تھا کیا وصلہ تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا وصلہ  
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے

عہدِ تجھ سے زندگی بھر کے لیے تو لیا کیا خبر تھی زندگی بھلے گی تیری سہ و وفا  
سامنے آیا مری تفتدیر کا لکھا ہوا عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا  
عمر کو بھی تو نہیں تھی پاداری ہائے ہائے

اٹھ چکے ہیں جبکہ سامانِ بخت سے زندگی ہو پھر اس سے کیا نئی کیا دل کو بھلے زندگی  
کون مر کر جیے چوٹھے میں جاے زندگی نہ ہر گزتی اوستھے آب دہو اسے زندگی  
یعنی تجھے بھی اسے ناسا زنگاری ہائے

نازکی سے یاد کیا تھا تر از رخ پھول سا صورتِ برگِ خزاں یا اب ہو مر جھایا ہوا  
کس ہونے کو گل تر تھ کو پتر مرن کیا گلِ فشانِ ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا  
خاک پر ہوتی ہی تیری لالہ کاری ہائے

تجھ کو رہنا تھا ہائے دیدہ مناک ہیں یا مناسب تھا بنانا گھر دلِ مدحاک ہیں  
خوبیشتن داری سے تیری آگیا و مناک ہیں شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک ہیں  
ختم ہو الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے

کامیابی اب کہاں نہ بات ہی او دل گئی وہ بہارِ عاشقی وہ رونقِ محفل گئی  
عہد لینے کی وہ ساری سنی لا حاصل گئی خاک میں ناموس پہانِ محبت مل گئی  
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے

منہ چھپایا خاک میں کیوں آخر آیا کیا خیال کیا کسی پر ہو گیا ظاہر ترے دل کا خیال  
جیکر رسوائی کا تھا ظالم تجھے اتنا خیال کیوں مری غنوارگی کا تجھ کو ۱ یا تھا خیال  
و ششٹی اپنی تھی میری دوستداری ہائے

اُدھے اُدھے اور جب اس نے لگا سے بارہا دیکھ گئی نازک کلائی اور بارہوش ہو  
پھر بھلا کس طرح نکلے اپنے دل کا مدعا ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا  
دل پر اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے

کر دیا جو بے طرح رنج و الم نے خستہ حال موت کا آنا کھٹن ہی اور جیتا ہو وبال  
صبح کرنا شام کا فرقت زدہ کو ہر حال کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تابہ برنگال  
ہو نظر خو کر دے اختر شماری ہائے

کون ہوا بے سننے والا کس سے کہیے اپنا مال دور کیجے کس کی صورت دیکھ کر دل کا ملال  
کوئی دیکھے تو مری حیران نصیبی کا کمال گوش محروم پیام چشم محروم جمال  
ایک نسل نس پر یہ نا امید داری ہائے

نام کو مشہور دُنیا میں ہوا بے نام و ننگ حال مرزا دیکھ کر ال جہاں ہوتے ہیں دنگ  
دل میں باقی تھی ابھی صحرا فردی کی اُننگ عشق نے پکڑا نہ تھا غالب بھی حشر کلا رنگ  
رہ گیا تھا دل میں کچھ ذوق خواری ہائے

(۷۹)

کیوں قیدِ زندگی سے دل اتنا اُداس ہے جیسا س سے چھوٹا ہے تو پھر کیا ہر اس ہے  
کہتے ہیں جس کو موت وہ ہر وقت پاس ہے گشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے

تسکیں کو دے نوید کہ مئے کی آس ہو

پھرتا ہی رات دن یہ پریشاں ادھر ادھر  
اس کو نہیں قیام کبھی ایک حال پر  
وحشتِ نوح کے حال سے اور غفلت اس قدر  
لیتا نہیں مرے دل آوارہ کی خبر

اب تک وہ جانتا ہی کہ میرے ہی پاس ہو

جغات کو دکھائی نہ اس درد کی جھلک  
محروم اس مئے سے رہے سر بسر ملک  
ہوں اس عطائے خاص سے منتِ کفر فلک  
کیجے بیان سرور تب غم کہاں تلک

ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہو

ہوتا ہی صحبتوں ہی سے انساں بُرا بھلا  
صحبت ملی بھی اُس کو مگر کیا اثر کیا  
ہونا تھا آشنائیِ دل سے حق آشنا  
ہو وہ غرورِ حسن سے بیگانہ وفا

ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہو

سودائی ہیں وہ جن کو ہر صہبائے اجتناب  
انساں کو چاہیے کہ پیئے جائے بے حساب  
کرتا ہو خوب جذبِ طوبات آفتاب  
پی جس قدر طے شبِ مہتاب میں شراب

اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہو

مہرِ زاپھر ہی دشت میں چاروں طرف آس  
روقتِ فزا و ہاں ہو درختوں کی صفِ آس  
دُور نہیں ہی باعثِ قدرِ صدقِ آس  
ہر اک مکان کو ہی مکیں سے شرفِ آس



مجنوں جو مر گیا ہی تو جگل اُداس ہی

(۸۰)

میری سنوڑی پہ عبتِ قیل و قال ہو      مطلب کی میرے پائے کوئی کیا مجال ہو  
کہتا ہوں سب کچھ اور زبانِ میری لال ہو      گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہو  
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی مجال ہو

اجاب چپ ہیں سُن کے دلِ ار کا گلہ      و در زبان ہی چرخِ ستم کا رکا گلہ  
سُننا ہو کون یا رِ جفا کا رکا گلہ      کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ  
دلِ فردِ جمع و خرچِ زبانِ ہائے لال ہو

دارِ فہمِ دل کو کب سے ہو ارمانِ دید کا      آنکھیں مری ہوں کاش کبھی جلوہ آشنا  
مشکلِ تجھے نہیں کہ حجاباتِ دسے اٹھا      کس پہرے میں ہو آئینہ پر دارِ کو خدا  
رحمت کہ عذرِ خواہ لبِ بے سوال ہو

پروا اُسے کسی کی ہو کیا وہ تو ہو غنی      پر خاش ہو کسی سے اُسے بہ ہو بد ظنی  
روکے ہوئے حجاب ہی یا پاکِ دامنِ      ہی ہو خدا نخواستہ وہ اور دشمنی  
ای شوقِ مشغول یہ تجھے کیا خیال ہو

خوشبوئے مصطفیٰ سے معطر ہی یہ مکان      جس پر درود بھیجتے رہتے ہیں انس و جان

اس کے طواف میں ہو شب و روز آسمان مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان

نافِ زمین ہو نہ کہ نافِ عزال ہو

گردش کا میری اور ہی کچھ رنگِ تنگ ہو گردوں بھی دیکھ کر مری حالت کو تنگ ہو  
جوشِ جنوں میں یہ تک و دو کی اُننگ ہو وحشت پہ میری عرصہ آفاق تنگ ہو

دریا زمین کو عسوقِ انفسال ہو

مہرِ ناز کی طرح نفس کو سمجھائیو اسد اس خواب پر نہ بھول کر اترائیو اسد  
دھوکہ نہ دہو کہ ہم سے کہیں کھائیو اسد ہستی کے متا فریب میں آجائیو اسد

عالمِ تمام حلفتِ دامِ خیال ہو

(۸۱)

غیر سے تجھ کو محبت ہی سہی تجھ سے اغیار کو الفت ہی سہی

مجھ پر اغیار کو سبقت ہی سہی عشقِ مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی

میری وحشت تری شہرت ہی سہی

کونسی ایسی خطا کی ہم نے جس سے لائق نہ ہے محفل کے

سلسلہ کچھ تو لگا سے رکھئے قطع کیجئے نہ نساقِ ہم سے

کچھ نہیں ہو تو عداوت ہی سہی

ہو کہاں کی یہ بھلا دانا ئی کیوں ہو مرغوب تھیں تنہائی  
نہ جنونی ہوں نہ میں سودائی میرے ہونے میں ہو کیا بوائی

اور وہ مجلس نہیں خلوت ہی ہی

عالم کن کو دستاں سمجھو اس سے ملتا ہو سبق انسان کو  
بھول کر غیر کا احسان نہ لو اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو

آگہی گر نہیں غفلت ہی ہی

ہو کہاں مثل شر اس کو قیام گرم رفتار یہ رہتی ہو صدام  
نہ توقف ہو نہ دم بھر آرام عمر ہر چند کہ ہو برق خرام

دل کے غول کرنے کی فرصت ہی ہی

رات دن عشق کا دم بھرتے ہیں رنج و ایزا سے نہیں ٹرتے ہیں  
اُن پہ مرنے کے لیے مرتے ہیں ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں

نہ سہی عشق مہیبت ہی ہی

شاد ہیں دور میں تیرے اجلاں اور ناشاد و حزیں ہیں اشراف  
اس قدر دین نہ ہو گی اسراف کچھ تو دے ہو فلک نا انصاف

آہ و فریاد کی فرصت ہی ہی

ہجر میں غم کو ترے پالیں گے      داد بھی اس کی کبھی پالیں گے  
جس طرح ہو گا یہ دن ٹالیں گے      ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے

نئے نیازی تری عادت ہی تھی

کیا عجب ہو کہ وہ تیرے آس      کچھ کرے رحم ترس کھائے آس  
یہی ہر زاکی بھی ہر آس      یا رے سے چھپڑ پسی جائے آس

گر نہیں صل تو حسرت ہی تھی

(۸۲)

آواز سے رات غیر سحر تک کسائیے      دل کھول کر مذاق برابر کھائیے  
پاکر خموش مجھ کو جو چاہا کھائیے      اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی چائیے  
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

بن کر فقیر میں ترے در پر اگر گیا      دربان مجھ کو دیکھ کے غصے میں بھگیا  
چپ چاپ ہیں جو تیری گلی سے گزر گیا      دل ہی تو ہی سیاست درباں سے ڈر گیا  
میں درجاؤں در سے ترے بے صدا کیے

آئی پھر چین میں بہا بختہ پی      اس مہمان کی مجھے خاطر عزیزا  
قصہ ہوا ہر نہ رہا ریائی کا آج طو      کرتا پھروں ہوں خرقد و سجادہ بہن ڈ

مَدّت ہوئی ہی دعوتِ آب و ہوا کیے

ہو دستیاب آدمی کو گرچہ عمرِ خضر لاکھوں ہی پائیں ایک نہ دو گرچہ عمرِ خضر

وانا کبھی نہ لے اُسے دو گرچہ عمرِ خضر بے صرفہ ہی گزرتی ہی ہو گرچہ عمرِ خضر

حضرت بھی کل کہیں گے کہ تم کیا کیا کیے

سچا امین اس کو سمجھتے رہے فہیم سب مال اس نے ہضم کیے بے ہوش نیم

اب وہ جواہرات کہیں ہیں نہ زرد نہ سیم مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ ای لیئم

تو نے وہ گنجھائے گراں مایہ کیا کیے

دن رات ہی ہماری بُرائی کی جستجو پھرتے ہیں مارے مارے جس میں کو بکو

پہان اٹھاتے بہتے ہیں ہنگامِ گفستگو کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے حدو

کس دن ہمارے سر پہ نہ آ رہے چلا کیے

خرپڑی کہاں سے اُسے مہنتیں یہ خو ہرگز کسی حسین کو زیبا نہیں یہ خو

لٹاٹھا پیشتر تو نہ وہ مہمیں یہ خو صحبت میں غیر کی نہ پُری ہو کہیں یہ خو

دینے لگا ہی بوسے بغیر التجا کیے

مول ہیں یوں تو اور بھی دنیا میں نازیں لیکن نہیں ہر سادہ دل ایسا کوئی حسین

ہد میں تو اس کو کہوں گا نہ نیم نشیں صد کی ہی اور بات مگر خو بُری نہیں

بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

صدرا نے عرض حال کا پایا جواب کیا      لوگے تم اپنی بات کا اچھا جواب کیا  
چاہو نہ تم جواب تو اس کا جواب کیا      غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا  
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

\*\*\*

(۸۳)

وحشتِ اشرفیاتِ بہانِ خراب ہے      مثلِ شررِ قیام کی یہاں کس کو تاب ہے  
اس ہ گزریں جو ہو وہ پادِ رکاب ہے      رفتارِ عمر قطع رہ اضطراب ہے

اس سال کے حساب کو برقِ آفتاب ہے

ہیں نرم محو میں رنگِ نرالے بہار کے      ہر جامِ پیرِ شراب گل تر ہے دیکھ لے  
مُرخِ چین کا ہے بیڑی پر گماں مجھ      مینا سے موی سرو و نشاطِ بہار سے

بالِ تدرو جلوہ موجِ شراب ہے

تھا دل کو شوقِ اکِ نغمہِ التفات کا      معلوم تھا نہ حال اُن آنکھوں کی گھات کا  
ٹو ایک تیر میں ہوا قصہ حیات کا      زخمی ہوا ہی پاشنہ پائے ثبات کا

نوبھانگے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

دہرِ خراب ہیں ہی خرابات کی صفت      مژدہ ہو میکشوں کو تو مستوں کو تہنیت

جاگیر یہ وہ ہے کہ انھیں کوہی تو لیست جاداد یادہ نوٹھی زنداں ہو پیش بہت

غافل گماں کرے ہو کہ گیتی خراب ہو

آنر نظر کو کرتی ہو اس کی چمک فنا اس پر نگاہ ڈالے کسی کو ہو تاب کیا

آساں نہیں ہو مہر درختاں کو دیکھنا نظارہ کیا حریف ہو اس برقی حسن کا

جوش بہار جلوے کو جس کے نقاب ہو

پہلے ہی کچھ تو شوق میں تھا حال دل نہیں دیدار سے تو اور بھی اس کا بڑھا جنوں

اب اور ہی کچھ اس کو متنا ہو کیا کہوں میں نامہ اودل کی تسلی کو کیا کہوں

مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کا میاں ہو

بھڑتے ہیں پھول یوں تو لب را زوار سے ہنر لہلہ گل مرے لیے کیا کم ہیں خا سے

یہ اور بات چیت کرے اس نکار سے گزرا اسد مسرت پینا م یار سے

قاصد پہ مجھ کو رشک سوال و جواب ہو

۸۴

وہ اگر میری تمنا پر ترس کھا جائے ہو سامنے آنکھوں کے برقی حسن چمکا جائے ہو

خود بخود آنکھوں کے آگے خیرگی چھا جائے ہو دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ شک جائے ہو

میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہو

لا انہیں سکتی ہو ہرگز تاب آتش کوئی شہر  
ہوتے ہی دو آتشہ تیزاب ہو جاتی ہو کر  
سوز پہناں بڑھ کے قصہ خود بخود کرے گا  
ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گوندیشے میں ہو

آگینہ تند ہی صہبا سے پگھلا جائے ہو

تھا مناسب کوئی تدبیر ایسی دشمن کی کسے  
گفتگو میں تانا دہ ہر بار بے باکی کرے  
کیوں نہ دل اس کا بڑھے جب دگرزاتی کسے  
غیر کو کیونکہ وہ یارب منع گستاخی کسے

گر جیابھی اس کو آتی ہو تو شرمنا جائے ہو

صبر کب تک کیجئے اور کب تک غم کھائیے  
تا بکی حال دل پر درد سے دکھ پائیے  
دل کو ضبطِ نالہ کی تدبیر کیا بتلائیے  
شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے  
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہو

کیا مسرت خیز ہو ای دوسرت تیری بزمگاہ  
تو جہاں ہو پھر وہاں غم ہا نہیں سکنا ہو راہ  
واہ ہوتی ہو وہاں جا کر اگر کرتا ہوں آہ  
دو چشم بد تری بزم طرب سے واہ واہ  
نغمہ ہو جاتا ہو داں گر نالہ میرا جائے ہو

ہم یہ کب کہتے ہیں ظاہر ہو کوئی نام از عشق  
یا ہمیں دنیا کہے وارفہ و جانب از عشق  
کیا کریں جب بدحواسی اپنی ہو غماز عشق  
گرچہ ہو طرزِ تغافل پر وہ دایرہ از عشق  
پر ہم ایسے کھوے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہو



دشمنوں کے حال پر وہ آج کل ہو مہرباں      کچھ ہماری بھی سنے اتنی اُسے فرصت کہاں  
وہ ہو اور آٹھوں پہرا غبار کی دلدلاریاں      اس کی بزم آریاں سنکر دلِ بنجور یہاں  
مثلِ نقشِ مدعائے غیبر بیٹھا جائے ہو

اک تو قدرت ہی نے اس کو نازنین پیدا کیا      اور اس میں تھا ہی کیا ناز و نزاکت کے سوا  
اور سونے پر مہیا کا عشق کا انا ہوا      ہو کے عاشق وہ پری سرخ اور نازک بن گیا  
رنگ کھلتا جائے ہی جتنا کہ اڑنا جائے ہو

دیکھئے تصویر کی آنکھیں بھی افسوں ساز ہیں      اور عقیق لب میں ظاہر جو ہر اعجاز ہیں  
اللہ اللہ ایک کھینچنے میں بھی سوا انداز ہیں      نقش کو اُس کے مصوٰر پر بھی کیا کیا انداز ہیں  
کھینچتا ہی جس قدر اتنا ہی کھینچا جائے ہو

رکتے ہیں قزاق سے اجابیا وطنِ انصافِ وحد      دیکھئے اس سبکی کی بھی کہیں ہوتی ہو وحد  
پتہ نئی لائی ہو کیا رنگِ اذلہ الصفا      سایہ میرا مجھ سے مثلِ دو و بھاگے ہو اسد  
پاس مجھ آتشِ بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہو

❖

(۸۵)

جانِ شادی کی تننا میرے آبِ گل میں ہو      کچھ تننا اور ہی لیکن دلِ بسمل میں ہو  
کیا کروں تدبیرِ مایب جانِ کس مثل میں ہو      سادگی پر اس کی مرجانے کی سر مثل میں ہو

بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہو

دل سے دل کو راہ ہو مجھ کو یقیں ہرگز نہ تھا گفتگو کی آج کچھ اس نے تو عقدہ کھل گیا  
کوئی میرے جی سے پوچھے اس کی باتوں کا مزا دیکھنا تقصیر کی لذت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میسے دل میں ہو

قطع مجھ سے کر چکے وہ دوستی کا سلسلہ اُن کی بزمِ عیش کے قابل کہاں میں غمزدہ  
پھر بھی ہر دم کچھ نہ کچھ رہتا ہی میرا تذکرہ گرچہ ہو کس کس بُرائی سے ولے با اینہم

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہو کہ اس محفل میں ہو

تو اگر چھا جائے گی ہم پر مصیبت ڈھائے گی جب نہ ہوگا شغل دل پر اک قیامت آئے گی  
زندگانی بے مزہ کر کے مزا کیا پائے گی بس ہجوم نا اُمید سی خاک میں مل جائے گی

یہ جو اک لذت ہماری سی بے حال میں ہو

ہم تو کرتے سر کے بل چل کر رہ مقصود طو بیٹھنے کا ضعف کرتا ہو تقاضا پڑی بہ پڑی  
پاؤں نے پکڑی زمینیں بنجیر پا ہو کوئی شو سنج رہ کیوں کھینچئے واما ندگی کو عشق ہو

اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہو

دل قیسی وسیع کا عیش کی منزل سہی ہم نے لومانا کہ ہم جلنے ہی کے قابل ہی  
سوزِ غم رگہائے تن میں خون کے شال سہی جلوہ زار آتش و دُرخ ہمارا دل سہی

فتنہ شور قیامت کس کے آگ میں ہو

تھا تو بے نزدیک مہرِ قابلِ قہر و عتاب      پھر کیا اک بے گنہ کو کیوں گرفتارِ عذاب  
اس مصیبتِ کمال اس کو کہ حالتِ ہجرِ خراب      ہو دلِ شوریں غالبِ طلسمِ بیچ و تاب  
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہو

\*\*\*

(۸۶)

خالی نہ تیری چشمِ کرم کی نظر گئی      چمکی مثالِ برقِ ادھر آئی ادھر گئی  
پینے ہی تک نہ صرف یہ آکر گزر گئی      دل سے تری بگاہِ بگڑتا آتر گئی  
دونوں کو اک دایں رضا مند کر گئی

وہ دورِ جامِ محو نہ وہ محوِ پرستیاں      وہ بزمِ دل رہا ہو نہ ساقیِ دلستاں  
مرفوش کہاں خمار سے ہیں اب تو سرگراں      وہ بادِ شبنامہ کی سرستیاں کہاں  
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

ات سے آڑو تھی دل بے قرار میں      پر ہوں تو اڑ کے جا پیے بزمِ نگار میں  
رکھ بیٹھ گیا ہوں میں اس رہ گزار میں      اڑتی پھرے ہو خاکِ مری کوئے یار میں  
بارے اب آؤ ہوا ہو بس بال و پر گئی

بلکہ لہجائے ہم کو نہ پر وازِ نقشِ پا      گھر کر رہا ہو دل میں ہر اک نازِ نقشِ پا

دلکش ہو گئی طرزِ فسوں سا نہ نقشِ پایا  
دیکھو تو دلِ فزہی اندازِ نقشِ پایا

موجِ خرامِ یار بھی کیا گلِ ستر گئی

تھی خاص یہ روش کبھی مردانِ کار کی  
یہ وضع ہر وضع نے اب اختیار کی

جاتی رہی تمیز ہی اغیار و یار کی  
ہر بواہوس نے حسنِ پرستی شعار کی

اب آبروئے شیوہ اہلِ نظر گئی

عالم ہی اور ہی ترے حسنِ شباب کا  
منسل ہو دیکھنا رخِ پیر آب و تاب کا

بے سود و رایگاں ہوا اٹھنا حجاب کا  
نظارہ نے بھی کام کیا وہاں نقاب کا

مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

جانا وہ مجھ سے ہاتھ چھڑا کر غضب ہوا  
ہر چند تم نے وعدہ فردا کیا تو کیا

دُشوار ہو گیا دلِ مضطر کا تمنا  
فردا و دسی کا تفرقہ یکساں بارش گیا

کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

موتِ نرا کی طرح دیکھتے تھے شادماں تمہیں  
پیری میں بھی جہان نے پایا جواں تمہیں

لیکن غمِ عالم نے کیا خستہ جاں تمہیں  
مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں

وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

(۸۷)

رہنے کو کیا بُرا ہے جو جنت میں گھر لے  
پھر تو جہاں جہاں ہو وہاں تو اگر لے  
آرام دل کو جلوہ رخ دیکھ کر لے  
تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق لے  
عورانِ خلد میں تری صورت گر لے

اس طرح کر چپا کے غیبِ دفن بعدِ قتل  
طاہر نہ ہو ہوا آؤ کہ ہر دُعا بعدِ قتل  
قاتل اگر ہو تو غمِ دفن بعدِ قتل  
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل  
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر لے

بھولا ہی پیکی بھی تو وفاداری قدیم  
ایسا گیا کہ جا کے وہیں ہو گیا مقیم  
ظالم کے انتظار میں ہو حالِ دل ستیم  
تجھے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم  
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر لے

مشہور ہے جہاں میں اثر جذبِ عشق کا  
صحرا میں کھنچ کے ناقہ لے چلا گیا  
اس جذب کا ہمیں نہیں سبب وجہ ادعا  
تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا  
فرصت کشاکشِ غم نہاں سے گر لے

ٹوٹی ہیں اُن کے ساتھ بہت ہم نے منزلیں  
لیکن نہ پیشرو کبھی مانیں گے ہم آہنیں  
اس رہ میں راہبر کی ضرورت نہیں ہیں  
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں

مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

نام خدا تم آج ہو ساقی جامِ جہنم      اغیار اور حریف ہیں اس بزم میں ہم  
دیتے ہو ہم کو موت و نہ دینا کسی سے کم      ساقی گری کی ہنرم کرو آج ورنہ ہم

ہر شب پیاہی کرتے ہیں موحس قدر ملے

میت ہوئی ہمیں نہیں مہر نہ کا کچھ پتا      اس آستان کے خاک نشینوں میں بھی تھا  
وہ بھی وہیں لے گا جہاں ہو گا زہنا      اسی سا کھارن کو چہ دلدار دیکھنا  
تم کو کہیں جو غالب آشفۃ سر ملے

✽

(۸۸)

اس طرف کچھ ناتوانی اور ہو      اُس طرف زعمِ جوانی اور ہو

گرہنی نامہربانی اور ہو      کوئی دن گر زندگانی اور ہو

اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہو

میرے سینے پر ہو گلخن کا گماں      ہو زبانِ شمع کی صورتِ زباں

کیا بتاؤں اپنے دل کی گرمیاں      آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں

سوزِ غمہائے نہانی اور ہو

ہنشیں ان سے سفارش کیا کریں      حکم یہ ہو نام بھی میرا نہ لیں

کیجئے اب کس طرح راضی انہیں بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں

پر کچھ اب کے سرگرائی ادھر

ایچی کو کیا زوال اور کیا خطر صاف کہہ دے گا بیان ہی ہوں اگر

ہو رہا کیوں تامل اس قدر دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ ہر

کچھ تو پہنچاںم زبانی اور ہو

دور میں ہیں چرخ گرداں پر نجوم رات دن ہیں دائر محور نجوم

دہر میں ہیں وجہ خیر و شر نجوم قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم

وہ بلائے آسمانی اور ہو

اچکا ہے غم تشریب اختتام ٹوٹنے والا ہو کوئی دم میں ہم

منتظر رہتا ہو صبح و شام ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام

ایک مرگ ناگہانی اور ہو

(۸۹)

کچھ دہاں کی خبر نہیں آتی کیوں صبا راہ پر نہیں آتی

کوئی تدبیر کر نہیں آتی کوئی اُمید بر نہیں آتی

کوئی صورت نظر نہیں آتی

چرخ آزار کے ہو کیوں در پڑی چین دیتا نہیں مجھے ہی ہی  
 ہوتی ہو اپنے وقت پر ہر شئی موت کا ایک دن معین ہی  
 نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

دل ہی جب گم ہو دل لگی کیسی پاس تھا جب تو کچھ اُننگ بھی تھی  
 کچھ ہیں اب تو ہو گئے مٹی آگے آتی تھی حال دل پہنشی

اب کسی بات پر نہیں آتی  
 حسن بندوں کا ہو ریاضتِ نہم ہندگی اور نیک سیرت و نہم  
 زیورِ عبد ہو عبادتِ نہم جانتا ہوں ثوابِ طاعت و نہم

پر طبیعتِ ادا نہیں آتی  
 ہونے دو حسرتوں کا دل میں خوں وہ بگڑ جائیں گے اگر کہدوں  
 اپنے دل میں ہو اور ہی مضمون ہو کچھ ایسی ہی بات جو چپٹیں  
 ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

میرے نالے کہیں ٹھہرتے ہیں جا کے روزان کے کان بھرتے ہیں  
 خوش تو ہیں وہ مگر مگرتے ہیں کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں  
 میری آواز گر نہیں آتی



دُکھ سے فرصت جو میں ذرا پاتا      چہر کر سینہ تجھ کو دکھلاتا  
عقل ہوتی تو خود سمجھ جاتا      داغِ دل گرفتہ نہیں آتا

بو بھی اس چارہ گر نہیں آتی

اوشکایتِ عبثِ تغافل کی      کیا کہیں کچھ خبر نہ اس نے لی  
جب ابیں خود خبر نہیں اپنی      ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی  
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

روز کے غم سے جان پر پہنچی      یارب اس سے نجات کب ہوگی  
ہو گیا سیرِ زندگی سے جی      مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی  
موت آتی ہی پر نہیں آتی

ہوش میں تم جو آؤ گے غالب      پند مکرنا اسے پاؤ گے غالب  
حق کو کیا منہ دکھاؤ گے غالب      کہے کس منہ سے جاؤ گے غالب  
شرمِ تم کو مگر نہیں آتی

\*(۹۰)\*

نالہ و آہ میں دھرا کیا ہو      حاصلِ گریہ و بُھکا کیا ہو  
اس تڑپنے سے مدعا کیا ہو      دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہو

آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہو یہاں دل کو شوقِ جلوہ یار اور وہاں پر وہ مایع دیدار

ان کو ہی بات بات پر انکار ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار

یا الہی یہ ماحیر کیا ہے

غیر کب تک کہے گا حالِ دروں آپ کب تک سنیں گے میضوں

ہو جی انتہائے ضبط و سکون میں بھی منہ میں زبان کھتا ہوں

کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

کہتے ہیں واقفانِ غیب و شہود ایک ہیں عبد و عابد و معبود

آخر ان کا ہی اس سے کیا مقصود جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجد

پھر یہ ہنگامہ ایسا کیا ہے

جگھٹے کیسے عاشقوں کے ہیں اور معشوق کس کو کہتے ہیں

حُسن کے پھر یہ کیسے جلوے ہیں یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں

عشوہ و غمرہ و اد کیا ہے

ایک سے ایک نازیں کیوں ہے دام بردوش ہر حسین کیوں ہے

فکرِ صیدِ دلِ حسنین کیوں ہے شکنِ زلفِ عنبرین کیوں ہے

بگم جو چشم سرمہ سا کیا ہو

کس لیے پھول رنگ لاسے ہیں کیوں یہ لالے نے دلغ کھائے ہیں

کس نے یہ تازہ گل کھائے ہیں سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں

ابر کیا چسپز ہو ہو اکیسا ہو

ہیں محبت کے بھی نرالے بھید آہ نغمہ ہو اس میں نالہ نشید

یاس کو خرغہ اور اجل کو نوید ہم کو ان سے وفا کی ہو امید

جو نہیں جانتے دفا کیا ہو

دیکھ کسی کو دیا تو کیا ہو گا تیرے حق میں بہت بُرا ہو گا

بد نتیجہ بُرائی کا ہو گا ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا

اور درویش کی صدا کیا ہو

کب یہ کمر اختیار کرتا ہوں کب دُعا بار بار کرتا ہوں

طرز دشمن سے عار کرتا ہوں جانِ تم پر نثار کرتا ہوں

میں نہیں جانتا دُعا کیا ہو

فصلِ موشرا ہو گود ہیں غالب شعر کہتا ہو دلنشین غالب

ہو مگر رند بالیقین غالب میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب

مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہو

✽

(۹۱)

ای چارہ گرو تم انھیں سمجھا کے تو ہو گئے اور ساتھ لیئے قرن آمد بھی ہو گئے  
اظہارِ تمنا سے مگر بات ہی کھو آئے کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالب ہو گئے  
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہہ دو آئے

احسانِ اجل ہو جو ذرا دے مجھے مہلت ہو اس کے نظارے کی تمنا دمِ جلت  
وہ دیکھ تو لے آنکھ سے اپنی مری حالت ہو کشتکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت  
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے دیکھنے کو آئے

آکر مرے گھر بھی وہی وحشت ہو وہی دم آتے ہی اجازت کے تقاضے ہوئے بہم  
میشکل ہو قیام ایک جگہ کا انھیں اُن م ہو صاعقہ و شعلہ و سیلاب کا عالم  
آنا ہی سمجھ میں میری آنا نہیں گئے

تربت میں مری آکے نہ بھاگینگے نکیرین مردہ بھی مجھ پا کے نہ بھاگینگے نکیرین  
پرستش سے بھٹی کرتا کے نہ بھاگینگے نکیرین ظاہر ہو کہ گھبرا کے نہ بھاگینگے نکیرین  
ہاں منہ سے مگر بادہ و دوشینہ کی ہوئے

ہیں تیغِ بکف کون جو پھرتے ہیں اکڑتے یہ کون ہیں جو وعظ میں دنیا سے ہیں لڑتے

پر پردہ کوئی اور ہی ہم کس سے بگڑتے جلا دے ڈرتے ہیں نہ واعط سے بھگڑتے

ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

ہم ہوں تو ہر انسان میں دے طعنہ نایافت ہاں اہل طلب کون سنے طعنہ نایافت  
ہم کم ہوئے اور ختم ہوئے طعنہ نایافت ہاں اہل طلب کون سنے طعنہ نایافت

دیکھا کہ وہ دلتا نہیں اپنے ہی کو کھوئے

ہم وہ نہیں ناکامیوں کے نام سے بیٹھیں اندیشہ مایوسی انجام سے بیٹھیں  
رج سفر و سختی احرام سے بیٹھیں اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آدم سے بیٹھیں

اس در پہ نہیں یا تو کیسے ہی کو ہو آئے

اُس شوخ کے لانے کی تو کرنے گئے تدبیر اور واں ترے رونے کی لگے کھینچنے تصویر  
دوبی ہوئی تقدیر سے اُلٹی ہوئی تاثیر کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر  
اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبوئے

لطف ہاں عید کا دن ات ہی غالب کیا جلسہ یا ران خوش اوقات ہی غالب  
مزا کے لیے وہ در حاجات ہی غالب اس انجمن ناز کی کیا بات ہی غالب  
ہم بھی گئے واں ادر تری تقدیر کی وائے

(۹۲)

جب سے رنگِ بہار طاری ہو      کچھ عجب کیفیت ہماری ہو  
پھر ہوشِ چشم تر سے جاری ہو      پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہو

سینہ جو بایں زخمِ کاری ہو

پہلے بیکارِ محض تھا ناخن      اب مگر کام دے گیا ناخن  
داغِ دل کی طرف بڑھا ناخن      پھر جگر کھودنے لگا ناخن  
امیدِ فصلِ لالہ کاری ہو

پھر عبادت کا ہو نیا انداز      اور ہی سمتِ رخ ہو وقتِ نماز  
سُن کے نائقے کی دل ربا آواز      قبلہ مقصدِ نگاہِ نیاز

پھر وہی پردہِ عمارتی ہو

ہو کے گاہک بنے ہیں سودائی      دیدہ و دل کو کچھ نہ سبھائی  
رہ گئی ان کی ساری دانائی      چشمِ دلال جنسِ رسوائی

دل خریدارِ ذوقِ خواری ہو

مل کے دونوں نے ہو یہ ٹھہرائی      ایک عالم بنے تماشا ئی  
دونوں دولت کے ہیں تنائی      وہ ہی صد رنگِ نالہ فرسائی

وہ ہی صد گونہ اشکباری ہو

تنگ ہوں ہجر جاں گداز سے پھر عشق ہی اس قدر دہراؤ سے پھر  
مست ہوں چشمِ نیماؤ سے پھر دل ہوا ہی خرامِ ناز سے پھر

محشرستانِ بے قراری ہو

حُسنِ پھر تر کتا ز کرتا ہو پھر درِ فتنہ باز کرتا ہو  
نُونِ اہلِ نیاز کرتا ہو جلوہ پھر عرصِ ناز کرتا ہو

روز بازارِ جاں سپاری ہو

لاکھ صدے سنئے گزرتے ہیں جان اُس پر نشان کرتے ہیں  
پھر دم اُس پُر دغا کا بھرتے ہیں پھر اُسی بے وفا پر مرتے ہیں

پھر وہی زندگی ہماری ہو

ن

اے ہیں دادخواہ اہلِ نیاز ہیں جفا پیشہ گوشِ بر آواز  
طاہر اب ہیں گئے حسنِ عشق کے راز پھر کھلا ہو درِ عدالتِ ناز

گرم باز اور فوجِ مداری ہو

ہر زبِ دست ہو گیا ہو شیر زیرِ دستوں کو کر رہا ہو زیر

عدل و انصاف میں نہ کیوں ہو دیر ہو رہا ہی جہان میں اندھیر

زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر کیا دل نے یوں بیاں احوال رو دے سن کے حاکم و عمال

سہرا اجلاس پھر ہی قال و مقال پھر دیا پارہ حب گرنے سوال

ایک فریاد و آہ وزاری ہے

ابھی ثابت نہیں جفا کا سبب نہ ابھی ہی ثبوتِ قہر و غضب

دیکھیے ہو معاملہ طو کب پھر ہوے ہیں گواہ عشق طلب

اشکباری کا حکم جاری ہے

عشق انصاف پر اگر آیا بال کی کھال ہی رکھ لے گا

دیکھیے اس کا ہو نتیجہ کیا دل و نگر کاں کا جو مقدمہ تھا

آج پھر اس کی رو بکاری ہے

یہ مضر اکو تو یقین غالب ہوے مغلوب تم کہیں غالب

دل گیا ہی کوئی حسین غالب بے خودی بے سبب نہیں غالب

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے



(۹۳)

کی سرکشی تو فریادِ ندامت سے خم ہوئے      اپنی تسلیوں سے خجل دم بدم ہوئے  
 حد سے بڑھے تو موردِ رنج و الم ہوئے      بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے  
 جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

لالے پڑے ہوئے ہیں ہمیں اپنی جان کے      کب تک ہیں گے دکھیے ظلم آسمان کے  
 چکھے نہ ہم نے کچھ بھی مزے اس جہان کے      پہناں تھا دامِ سختِ قریب آسمان کے  
 اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اب کیا میں پہلے کیا تھے یقینہً طویل ہو      ہم ہیں بھی کچھ اسی میں ابھی قال و قیل ہو  
 ہر روز انحطاط ہو مہلتِ تسلیل ہو      ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہو  
 یاں تاک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

مستور پر وہ لائے خفا میں ہیں اس قدر      آنکھوں کے سامنے ہیں اور آتے نہیں نظر  
 گویا گئے ہیں ہستی موہوم سے گزر      سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہو کیا خبر  
 وہ لوگ فتنہ رفته سرِ ایا الم ہوئے

وہ کون ہو کہ جس نے ستایا نہیں ہمیں      حیراں ہیں تیرے سامنے کس کس کا نام لیں  
 کیا کہیے جو فلک نے نکالی ہیں کاوشیں      تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہریں

تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے قسم ہوئے  
 گوجرم عرضِ حال میں کافی گئی زباں  
 چھوڑا مگر نہ حسرتِ دل کا بھی بیاں  
 تحریر بھی کیا کیئے وحشت کی داستان  
 لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں  
 ہر چند اس میں باتھ ہمارے قلم ہوئے  
 یالبت ملک پہنچے ارادے تھے عشق کے  
 یا گھٹکے دل میں رہ گئی سب جوصلے گھٹے  
 ڈر سے کیا تباہ و فنا خود کو آہ نے  
 اللہ سے تیری تندہیِ خو جس کی ہم سے  
 اجزا رنالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے  
 ہو کس طرح سے کوئی فرومایہ فردِ عشق  
 دشمن کا جوصلہ ہو کہ سہ جائے درِ عشق  
 ہوتا ہو کوئی جان چرا کر بھی مردِ عشق  
 اہلِ ہوس کی فسخ ہو ترکِ نبردِ عشق  
 جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے  
 مجبور کر دیا ہو و دیت سے یار نے  
 آنا پڑا و جو و میں گویا اسی لیے  
 ہوتا بھرا ہوا جو نہ دل و دم نہ مارتے  
 نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے  
 جو واں نہ کھنچ سکے وہ یہاں آکے دم ہوئے  
 دل کو لگی ہوئی تھی یہاں صحنِ جوشِ کی  
 اور دل لگی کی بھی ہمیں عادتِ قدیم تھی  
 صدفِ ناز کی طرح ان رسیِ غسی میں بھی  
 چھوڑی آسنا نہ ہم نے گدائی میں ل لگی

سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

✽

(۹۴)

گھر گھر نشاط و عیش کا جوش و خروش ہو      بزمِ طرب کیں ہو کہیں ناؤ نوش ہو  
اور یہاں و فورِ غم سے پراگندہ ہوش ہو      ظلمتِ کدہ میں میسے شبِ غم کا جوش ہو  
اک شمع ہو دلیلِ سحر سو خموش ہو

ہو چونکہ دردِ ہجر میں و زوں کا ایک حال      ممکن نہیں کہ ایک سے ہو ایک کو ملال  
اہم نہیں ہو رشکِ حسد کا کوئی خیال      فی مژدہ وصال نہ نظارہ جمال  
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہو

لم کر دیا ہوش نے ساقی کا اجتناب      سرکا ہو آج رخ سے ذرا گوشہ نقاب  
وہاں سے ہو دیدہ مشتاق کا میاب      مرنے کیا ہو حسنِ خود آرا کو بے حجاب  
ای شوق ہاں اجازتِ تسلیم ہوش ہو

اس کے گلے کا ہار جو ورتیں ہوا      گویا صدف کا اختِ قسمت چپک گیا  
اک شک و بھی ہو صدف کا تو ذکر کیا      گوہر کو عقد گردنِ خوباں میں دیکھنا  
کیا اوج پرستارہ گوہر فروش ہو

ہو شکر کی جگہ کہ نہیں ہم وہی پرست      ڈوگھوٹ میں جن میں نہ ہے ہوش پاؤ دست

اچھا کیا تمھارے تصور نے بند و بست      دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست  
بزم خیال میکدہ بے خروش ہو

ن

کرتی تھی مجھ کو قلت می یا تو مضحل      یا اب خیال بادہ کشی بھی ہو جاں گسل  
کردار سے ہوں اپنی پشیمان منتقل      ای تازہ واردان بساطِ ہوائے دل  
زنہار اگر تمھیں ہوس ناؤ و توش ہو

مجھ کو کچھ اپ اپنے اگر خمیر خواہ ہو      سنبھلو ذرا جو طالب امن و پناہ ہو  
تم بھی کہیں نہ میری طرح سے تباہ ہو      دیکھو مجھے جو دیدِ عبرت نگاہ ہو  
میری سُنو جو گوشِ حقیقت نبوش ہو

اس بزم میں نہ پاؤ گے کچھ غیر گری      جاتی رہے گی عقل سراسر ہی سہی  
مجھ پر گزر چکی ہو جو میں نے تمھیں کہی      ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آہی  
مطرب نہ نہ رہنِ تکین و ہوش ہو

کہتے ہیں جس کو اہل جہاں محفلِ نشاط      اک خوابِ خوش سے بڑھکے نہیں میں بلِ نشاط  
رونی کو اس کی لفظ بہ لفظ ہو انحطاط      یاشب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط  
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہو

چاروں طرف لفظ چائے پیئے ہو رنگ  
بجائے شورِ قفلِ مینا سے جلِ ترنگ  
اودل میں اہلِ بزم کے اک بوشِ اراٹنگ  
لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ  
ہے جہنمِ نگاہ وہ فردوسِ گوشتِ ہی

ای انساط و پیش کا منظر تو بزم میں  
پیدا ہی لطفِ گردشِ ساغر تو بزم میں  
کچھ نیست کا مژہ ہی میسر تو بزم میں  
یا صبح و دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں  
نہ وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہی

حالت ہی اور کچھ نظر آتی ہی بزم کی  
روشنی ہی اس جگہ بھی گویا ہوئی نہ تھی  
نخل جو تھی بھری ہوئی سنسان ہو گئی  
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی  
اک شمع رہ گئی ہی سو وہ بھی تموش ہی

تھوڑے کی نہ کوئی کمیِ عرضِ خالیں  
تا ہو نہ ہمتِ کوئی مے کے وبال میں  
اک درد ہی بکھرا ہوا اُس کے مقابل میں  
آئے ہیں غیب سے یہ مضامینِ خیال میں  
غالب صریحاً نہ لوائے سروش ہی

(۹۵)

انہیں ان کو نہیں چاہ کا میری نہ ہی  
جان لیکر بھی اگر قدر نہ کچھ کی نہ ہی  
وہ جو کہتے ہیں ہمیں جان نہیں ہی نہ ہی  
نہ ہوئی گھر سے مرنے سے تسلی نہ ہی

امتحان اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

میرے حصے میں نہیں گل نہ سہی خار تو ہو  
دل میں اک صورت یاوگل و گلزار تو ہو  
گو مسرت سے ہوں محروم غم یا تو ہو  
خار خار الم حسرت دیدار تو ہو  
شوق گلچین گلستان تسلی نہ سہی

کیا کوئی فرض ہی ہر روز اُسے آئے ہی بنے  
اپنے ہاتھوں سے ہمیں جام پلائے ہی بنے  
وہ نہیں ہونے ہو مگر آج اُسے ہی بنے  
میری رستاں خم کو منہ سے لگائے ہی بنے  
ایک نگر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

اپنے دیوانے کی گو اس نے نہ کی قدر تو کیا  
جوش و خروش دیا اُس کا ستارہ چمکا  
اپنی آنکھوں کا بیاباں نے بنایا تارا  
نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا  
گر نہیں شمع سیہ خانہ لیلی نہ سہی

روکتے ہیں مجھے احباب فناء و نفاق  
ہر گھڑی جب مجھے گھوٹیں تو نہ کیونکر مطلق  
سازِ عشرت ہی نہیں باعثِ رونقِ مطلق  
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہو گھر کی رونق  
نوحہ غم ہی سہی نغمہ شادی نہ سہی

دیدہ عقل پہ حاسد کے پڑا ہو پروا  
کر دیا ہو مرضِ رشاک و حد نے اندھا  
مطلب پنا آئے سمجھاؤں بھی تو حاصل کیا  
نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

گہ نہیں ہیں مرے اشعار میں مستی نہ ہستی

تم سے مرزا جو کہیں اس کو نصیحت سمجھو  
ہیں جو ہمدرد تو یہ ان کی عنایت سمجھو  
پیش جو آئی ہی بہتر یہی حالت سمجھو  
فرصت صحبتِ خواہاں ہی غنیمت سمجھو  
نہ ہوئی غالب اگر عسرِ طبیعی نہ ہستی



(۹۶)

کبھی کیا تھا نہ ظالم نے اس طرح کرم آگے  
ہمارے سائے سے پہلے تو کرتا تھا وہ دم لگے  
نہ کی تھی تیغِ سیر قل گاہ یوں علم آگے  
عجب نشاط سے جلا دے چلے ہیں ہم آگے  
کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے دو قدم آگے

مرے ہی حصے میں آئے زمانے کے غم و کلفت  
مرے ہی اسطے پیدا ہوئے ہیں ماتم و حسرت  
خوابوں سے زمانے کی ہی کہاں مجھے فرصت  
دُضمانے تھا مجھے چاہا خراب بادہ الفت

فقط خراب کھاب بس نہ چل سکا تم آگے

ہمارے دل کی شادی غمِ فراق نے ہستی  
بسی بسائی ہوئی حسرتوں کی اجڑی ہو بستی  
کچھ اب تو ہمت و طاقت میں تھری ہوئی بستی  
غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عیش کی مستی  
وگر نہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

بتائیں کیا کہ تمنا ہمارے دل کی ہو اسکیا  
لگی ہو دھن کہ شیں خود جواب کچھ نہ کچھ اس کا

دیا ہی نامہ گھر دل کو ہر کچھ اوہی سودا خدا کے واسطے داد اس جنوں توفیق کی دینا  
 کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ برس ہم آگے  
 تمہارے چھونے سے ترغیب میں آگے ہیں بلا کے تمہارے چھونے میں آگے نہ جیتے جی کبھی چھوٹے  
 ہمارا دل ہی کچھ اُلجھا ہوا تھا کیا کہیں تم سے یہ عمر بھر جو پریشاں کیا اٹھائی ہیں ہم نے  
 تمہارے آئے ہو ای طرح ہا سے غم بہ خم آگے  
 بہت دنوں تو ہم اس امر کے بہت سہ پہ دیو ہم اشکوں یہ بہا میں کہ قصہ ہی کہیں ٹو  
 اب اپنی ہستی کا عقدہ کھلا کہ یہ ہر کیا شے دل دھکے ہیں افشاں جو ایک عقدہ غوں ہو  
 ہم اپنے زعم میں سمجھ ہو سے تھے اس کو ہم آگے  
 وہ اشک تم منزل پر کب بہاتے ہیں غالب غصیب ہوئے کی میرے خوشی مٹاتے ہیں غالب  
 لانے خاک میں کھوکھاں وہ آتے ہیں غالب قسم جنازہ پہ آئے کی میرے کھاتے ہیں غالب  
 ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

(۹۶)

آہ کرنے سے غصیب اس کا سوا ہوتا ہو  
 لب ہلا نا سبب ترک و فنا ہوتا ہو  
 اُلہ کر تا ہوں تو سرگرم جھٹا ہوتا ہو  
 شکوے سے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہو  
 یہ بھی منت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہو



ہنگ ہوں کب تک تھکایا کروں میں جو رہ جھٹا کو نسا ظلم ہی جو آپ نے مجھ پر نہ کیا  
بے سبب تو نہیں اشکوں کا مئے تار بن جھا پڑ ہوں میں شکوے سے یوں آگ سے جیسے باجا

اک ذرا چھپیر سیئے پھر دیکھیئے کیا ہوتا ہے

دل غم دوست کی ہی عین تمنا یہ تو ہم جو شاکی ہوں تو وہ اور ستائے ہم کو  
کاش آگاہ وہ اسرار شکایت سے نہ ہو گو سمجھتا نہیں پر حسرتِ تلافی دیکھو

شکوہ جو رستے سرگرم جھٹا ہوتا ہے

کردیا روز کی گردش نے اسے خستہ حال پاؤں بھی اب تو اٹھانا ہو اسے سخت محال  
ہو گیا خلن کو اندازہ رفتار محال عشق کی راہ میں ہی چرخ کو کب کی وہ چال

خستہ و جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

ہم یہاں تک ہوئے جو گریب یاد و ستم دیر ہوئی ہی جفاؤں میں تو ہوتا ہی الم  
دل کو تو تازہ جراحات کی خواہش پیہم کیوں نہ ٹھہریں ہر فنِ نادک بیدا کہ ہم

آپ اٹھلا لائے ہیں گرتیر خطا ہوتا ہے

بختِ برگشتہ نے لینے ہی نہ دی ہم کو پناہ رکھتے اور کاش نہ ہم اپنی بھلائی پہ نگاہ  
کام سب ٹوٹے تدبیر سے ہوئے اپنے تباہ خوب تھا پہلے ہی سے ہوئے ہم اپنے بد خواہ

کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

ڈر سے شکوہ نہیں کرتے ہیں تو ترکِ ادب      نا توانی کی ہی آخر کوئی حد بھی یارب

نارِ نالی بھی ہے دشوار دم رنج و تعب      نالہ جاتا تھا پرے عیشِ بریں سے اور اب

لب تک آتا ہی جو ایسا ہی رسا ہوتا ہی

طبعِ قدرت نے مجھے دی ہے عجب جاوِ فن      میں جو چاہوں سرفِ قیاس کھلا دوں گلشن

راگ لاسکتا ہے کیا مجھ سے کوئی مرغِ چین      خامہ میرا کہ وہ ہے بارِ بدِ بزمِ سخن

شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہی

ذات کو تیری کیا حق نے پناہِ عالم      تیرا سا پسِ مخلوق پہ ہے ابرِ کرم

اہلِ دنیا کو ترے فیض سے ہے عیشِ بہم      او شہنشاہ کو اکبِ سپہ و مہرِ علم

تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہی

محض افسانہ ہیں شاہانِ سلف کے قصے      بیچ ہیں شوکتِ اقبال میں تیرے آگے

کچھ ٹھکانا ہی بھلا جاہ و چشم کا تیرے      ساتِ اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے

تو وہ لشکر کا ترے فصل بہا ہوتا ہی

اگر دیکھتا ہے ترے دیکے فلک کا یہ حال      ذرہ ذرہ ترے دروازے کا خورشیدِ مثال

ماہِ کامل کو جن میں سائی میں حاصلِ ہیکال      ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہی ہلال

استار پرے مہِ ناصیب ہوتا ہی

بند ہیں مرغِ چین مجھ سے خوش الحانی میں      کچھ نہ کچھ نغمہ سرا ہوں جو پریشانی میں  
ہو ترا لطف مدِ طبع کی جولانی میں      میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزلِ خوانی میں

یہ بھی تیرا ہی کرمِ ذوقِ سنرا ہوتا ہو

کہنے کیا چرخِ تنگوار کو ہی نا انصاف      ذکر کیا غیر کا اپنے بھی ہیں مہترا کے خلاف  
لنی ہمارے نہیں قاف سے لیکر تا قاف      رکھو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

آج کچھ دردِ مرے دل میں سوا ہوتا ہو

✱

(۹۸)

ہلائے دہراؤ بے باکیوں کی خو کیا ہو      لٹکائے سامنے انسان کی آبرو کیا ہو  
کلامِ ہشک یہ دشمن کے رو برو کیا ہو      ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہو  
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفت گو کیا ہو

نگاہِ گرم سے ظالم نے جس کو دیکھ لیا      جلا کر اس کو کیا خاکِ دم میں سرتاپا  
کمال یہ ہو کہ کرتا ہو آگ سے ٹھنڈا      نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا  
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہو

برائیوں کے ہماری سبق ہزار دہے      یقین ہو کہ نہ فقروں میں آؤ گے اس کے  
خیال اس کا نہیں ہو کہے وہ جو چاہے      یہ رشاک ہو کہ وہ ہوتا ہو ہم سخنِ تم سے

دگر نہ خوفِ بد آموزیِ عبد و کیا ہی

نہ دے گا کامِ رفوگر یہاں ترا کچھ فن اٹھا کے طاق میں رکھ اپنے رشتہ و سوزن

سرسبک چشم کے تاروں سے جل چکا دامن چپکا رہا ہی بدن پر لہو سے پیرا ہن

ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہی

رہا نہ تن ہی تو دل کا کہاں پتا ہوگا یقین ہی جسم سے پہلے ہی مٹ چکا ہوگا

سوائے خاک یہاں دستیاب کیا ہوگا جلا ہی جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا

کر دیتے ہو جو اب را کھ جستجو کیا ہی

غلط کہ رہتا ہی جو یائے فخرِ قاتل کہیں گے ہم تو کہ ہی اس کی دھڑلا حائل

بہتے ہیں شک یں گل گل کے کیا جگر کیا دل رگوں میں دھڑلتے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہی

جو ہی تو فرقہ زہاد کو ہی اس کی تمیز کہ کس کو کہتے ہیں غلمان عو رہی کیا چیز

ہیں غرض نہیں کوئی عنسلام ہو کہ کنیز وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز

سوائے بادۂ گلغام و مشکبو کیا ہی

چڑھا کے ساغر و مینائے مرنہ ہوں سرشار سہو بھی منہ سے لگا کر نہ سیر ہوں زہن پار

یقین کیجئے میں نام کا نہیں می خوار پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دودھ پار

پیشینہٴ وقتِ دُح و کوڑہ و سب کو کیا ہے

ہمارے حال پران کو کہیں نظر ہو بھی اور التفاتِ مریضِ فراق پر ہو بھی

نیچہ خاک نہ ہو گا اگر خسبر ہو بھی رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی

تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

عروجِ طالعِ غالب اگر اسے بھاتا حسد کی آگ میں حلسہ نہ یوں بھینکا جاتا

نہ پھر یہ شعر وہ صرصر از زبانِ پیر لاتا ہوا ہے شہ کا مصاحب پھر سے ہی اترتا

وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

(۹۹)

تابِ الم اب مجھے زہنا نہیں ہو قابو میں مرے دل اُفکا نہیں ہو

آہِ ذرا دل پر اختیار نہیں ہو آگہ مری جان کو تر نہیں ہو

طاقتِ بیدارِ انتظار نہیں ہو

دل کو تو قابو میں اپنے لیے لیا پہلے کہتے ہیں فرمائشِ جانِ جانِ کج ہم سے

لطفِ ملے گا بھلا کب عیشِ اس کے دیتے ہیں جنتِ حیاتِ ہر کے بدلے

نشہ بہ اندازہٴ نما نہیں ہو

چھائی ہے کچھ اس طرح کی یکسی اب تو روتا ہوں سہرا زہی کوئی نہ ہو دل

شکوہِ قیہوں کا کیا کیا تیرا گلہ ہو      گر یہ نکالے ہو تری بزم سے مجھ کو

ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہو

وجہ بھی تو چاہیے کچھ رنج کی آخر      کونسی شے میں ہو پایا عاجز و قاصر

چاہو جو تم جان بھی کر سکتے ہیں حاضر      ہم سے عبت ہو گمانِ رنجشِ خاطر

خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہو

غفلتِ دل سے بھلا کیا پائے معافی      اس میں ہی غنمی ہو سب دیاے معافی

اس کو سمجھ منزل و ماوائے معافی      دل سے اٹھا لطیف جلوہ ہائے معافی

غیر گل آئینہ بہار نہیں ہو

اس پہ کیے میں نے برسوں تک تقاضے      سُن کے ہمیشہ مگر کچھ ٹالا ہی ہوتے

طالعِ خفہ مرے انکے تو ہیں جاگے      قتل کا میرے عہد تو کیا ہو بارے

وائے اگر عہد استوار نہیں ہو

تو نے یہ کیا زہ کی ٹھہرائی ہو غالب      چال یہ موزن انے تری پائی ہو غالب

جام و سہو کا تو تو سودائی ہو غالب      تو نے قسم میکشی کی کھائی ہو غالب

تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہو

زمانے بھر کے رنج و غم ہیں اور تنہا مراد دل ہے (۱۰۰) قلم مجھ سے اس کو گراں کا سخت مشکل ہے  
 بڑھادی بوجھ اتنا سوائے زمانو سر بھی مائل ہے ہجوم غم سے یاں تک نہ گونی مجھ کو حاصل ہے  
 کہ تارِ دہن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

مجھے او چارہ گرد نظر راحت نہیں تن کی  
 منے لوں اگر کاٹے رگیں بھی میری گئی دن کی  
 بیٹے جازم دل پروانہ کر کچھ طعن دشمن کی  
 رفوے زخم سے مطلب ہو لذت خیم سنوں کی  
 بھیبھیت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہو

گلستاں میں اگر وہ وفق افزائی کرے غالب  
تو نور اس کا عطا نگرس کو بدینا فی کرے غالب  
عجب کیا ہوے خوش صورت راؤ سودائی کسے غالب  
وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب  
چمکنا غنچہ گل کا حدائے خندہ دل ہو

(۱۰۱) جس روز کہ تو سیر کو گلزار میں آوے گل تازہ کھلے نہت گل خار میں آوے  
 بالیدگی سوکھے ہوئے اشجار میں آوے جس بزم میں تو ناز سے گفتا رہی آوے  
 جاں کا لبِ صورت دیواریں آوے

گلشن میں پیدا ہو عجب لطف کا منظر  
لے بڑھکے بلائیں تری ہر شاخ گل تر

تو اس قدر دلکش سے جو گلزار میں آوے

مانا کہ غم و ہنم سے دل زار کھلا ہو      برسا دیئے خرگاہاں نے جو دریا بھی تو کیا ہو  
آنکھیں بھی ہو روئیں تو کیا فخر ہو ہو      تب ناز گرا نہا گئی اشک بجا ہو

جب سخت جگر دیدہ غوہاں میں آوے

ہر چند ہوا جوش فرو مجھ کو ستا کر      کچھ دل کو ہوئی راحت و تسکین بھی دم بھر  
وہ بات بھی کر جس سے ملے لطف مکر      دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ سنگد

کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آئے

اعجاز کا رنگ اپنے جو دکھلائے اشارہ      بیجاں کو جاندار بنا جائے اشارہ  
جادو سے غضب کھینے کیا ڈھلائے اشارہ      اس چشم فسون گر کا اگر پائے اشارہ

طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آئے

مصرف و عاؤں میں ہیں کس سے یارب      تاہر ہنہ پا گزرے کوئی پاس سے یارب  
نکلتے ہیں پڑے راہ عجب پاس سے یارب      کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب

اک ابلہ پا وادی پر خاں میں آئے

آیا مرے آغوش میں کبہ تن نازک      کس دن ہوا راحت کا سبب ہ تن نازک  
پھندے میں ہو یوں غیر کے ابہ تن نازک      مرجاؤں کیوں شکستے جبہ تن نازک



آغوشِ خیمِ حلقہٴ زار میں آوے

پہلائے ہوئے دستِ طلب ہیں سرسبز  
دیکھا ہو زمانے میں انھیں غمِ ابری اکثر  
انساں کیلئے حرص ہی دشمن ہو قوی تر  
خارت گردِ ناموس نہ ہو گر ہو بس زر  
کیوں شاہدِ گلِ باغ سے بازار میں آوے

اما کہ جنوں کا ہو تجھے جوشِ فراواں  
باقی ترے ہاتھوں سے ہی جینے والوں  
یوں ٹوٹے اڑنا تو نہیں ہو تجھے شایاں  
تب چاکِ گریباں کا مزہ ہو دلِ ناواں  
جب اک نفسُ ابچھا ہوا ہر تار میں آوے

کیا حالِ تپِ سوزِ دروں کہیے زیاں سے  
لگ جائے کہیں آگ نہ گرمی کے بیاں سے  
بہتر کہ نہیں ہی رہے اہلِ جہاں سے  
آتشِ کدہ ہو سینہ مرا رازِ نہاں سے  
اے آوے اگر معرضِ اظہار میں آوے

قوتِ لکی طرحِ سحر کی قسم اس کو سمجھیے  
مضوں ہو اگر روح تو جسم اس کو سمجھیے  
افسوں اے ٹھہرائے ام اس کو سمجھیے  
گنجینہٴ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے  
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

\*\*\*

(۱۰۲)

اندھو خیمِ سحر یا رسا خال اچھا ہو  
اس کے ابرو سے نہ خنجر نہ ہلال اچھا ہو

مہر کچھ ہی تو ذرا قبل زوال اچھا ہی حسن نہ گرچہ بہنگام کمال اچھا ہی

اُس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہی

مفت کے مال کے اس درجہ ہیں خواہاں کپڑا وہ ہی دانو اسی گھات میں ہیں شام و گڑھا  
چاہتے ہیں کہ رقم کوئی ملے خاطر خواہ بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہی ہر وقت گھا  
جی میں کہتے ہیں کہ مفت اُسے تو مال اچھا ہی

کب سیر ہوا جمشید کو پہا نہ نیا دور میں تا دم آخر وہی اک جام ہا  
دل سے اترا جو بہاں دُور کیا پھینک دیا اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہی

کر دیا ہی غم ہجراں نے مرا سینہ شوق نام ہی نام ہی اب جان کا باقی ہی رہا  
رنگ ہتا ہی مرا یوں تو غم و درد سے فتن ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہو منہ پر رونق  
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہی

ان کے ہاتھوں سے کسی کو بھی نہیں پہنچا فیض دین و ایماں کے یہ شبنم ہیں تو پھر کیا فیض  
بندگی کر کے بھی دیکھا تو نہ پایا با فیض دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض

اک برہن تے کہا ہی کہ یہ سال اچھا ہی

فن ہو وہ چیز کہ فرہاد کی دی بات بنا در نہ شیریں سے کرے بات یہ ہیں کامنہ تھا

بس ہنریں تھی اُسے شوق وہ کام آہی کیا  
ہم سخن پیشے نے فرما دو شیریں سے کیا  
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہو

اصل محبوبے ای کاش ہمارا ہو جائے  
دور جلدی کہیں یہ پرندہ دوئی کا ہو جائے  
بزد ہو دامن کل ایک ہی لفتنا ہو جائے  
قطرہ دریا میں بول جائے تو دریا ہو جائے  
کام اچھا ہو وہ جس کا کہ مال اچھا ہو

کے دروازے سے چوچا ہے گدا ملتا ہو  
اور جو ملتا ہو تو باچون و چرا ملتا ہو  
در بدر بھیک اگر مانگیے کیا ملتا ہو  
بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہو  
وہ گدا جس کو نہ ہو خوشی سوال اچھا ہو

اُہاس کو خدا رکھے سر اس سر سبز  
اس چین میں ہے یہ شک صنوبر سر سبز  
بود اس کا چین زار مقدّر سر سبز  
خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سر سبز  
شام کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہو

کڑا ہے ہیں اسی امید میں مرزا کے بھی دن  
صرف اسی آسے پر ہو دل مضطرب ساکن  
پتھر جو نہ ہو کب ہو سکتی ممکن!  
ہم کو معلوم ہی جنت کی حقیقت لیکن  
دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہو

(۱۸۳)

ہم ہیں شاکِ ساقیِ گلجام کے      اہلِ محفل ہوں مُجتِ انعام کے  
حوصلے پورے ہوں خاصِ عام کے      غیرِ لیں محفل میں بوسے جام کے

ہم رہیں یوں تشنہ لبِ پیغام کے  
ظلم سے خالی ہو کوئی کہ نہ مہ      درپے ایذا ہیں اہلِ شہر و دہ  
تم سے کیوں پڑتی مرے دل میں گڑ      خشکی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ  
ہشکنڈے ہیں چرخِ نیلیِ فام کے

دل میں اس ناوکِ فتن کے ہو گرہ      یہ کمانِ اپنی کیے رہتا ہوزہ  
ناگ میں سب کی ہو کہ ہو یا کہ نہ      خشکی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ  
ہشکنڈے ہیں چرخِ نیلیِ فام کے

تم جوابِ خط ہمیں دو یا نہ دو      ہم کو حاصل ہو غرض ہو دل کی جو  
اس بہانے نام لکھا جائے تو      خط لکھینگے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو  
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

جوشِ مستی میں کیا طوفِ حرم      خشیتِ خم پر کی ادا رسمِ سلم  
زہد میں رندی سے بھی چوکنے ہم      راتِ پنی زمرم پہ ڈاڑھِ بعدم

وہوئے دھبے جامہٴ احرام کے  
 تھی بلا اپنے لیے اپنی نظر ہتکنڈوں کی اس کے تھی کس کو خبر  
 اپنے ہاتھوں خود آپس پہنچا ضرر دل کو آنکھوں نے پھنسا یا کیا مگر  
 یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دم کے  
 ہو چکا ظاہر دعاؤں کا اثر سب تھے مصر و فہ عاشق و دھر  
 شاہد پھرتے ہیں طیبہٴ چارہ گھر شاہ کے ہو غسل صحت کی خبر  
 دیکھیے کب دن پھریں حمام کے  
 پوچھ لو عذرا سے اپنا مشغلا شغل ہو سکتا ہو کیا بے کار کا  
 روگ ہی کچھ دل کو بیدار کیا عشق نے غالب بھگا کر دیا  
 ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

☆

بہر شجر نے نئی قبا پائی (۱۰۴) بوئے گل کو صبا اڑا لائی  
 گل نرگس نے پائی رعنائی پھر اس انداز سے ہمارائی  
 کہ ہوئے ہر وہ تماثائی  
 ہو صفائی سمیت تابہٴ خاک نظر آتے نہیں خس و خاشاک

ہر چین ہو غبار و گردے پاک دیکھو ایسا کائن خطہ خاک

اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

اؤں کی ہی بہار سبزے پر گل چمکتے ہیں صورت اختر  
کہیں بے ساختہ نہ پھر کیونکر کہ زمیں ہو گئی ہی سرتاسر  
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

ابرِ باران نے آبپاری کی قوتِ نامیدہ کو حرکت دی  
نظر آتی ہو شاخِ شلخِ ہری سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی

ہو گیا روئے آب پر کانی

سبزِ نعلِ بچھائی سبزے نے کھل کھلاتے ہیں ہر طرف غنچے  
پھول بھی شاخِ شلخِ پر پھولے سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے  
چشمِ نرگس ہوئی تماثانی

بزمِ عالم ہو مودے کی نظیر جھوم کر چھا گیا ہی ابرِ مطہر  
مست پھرتے ہیں سب صغیر و کبیر ہی ہوا میں شراب کی تاثیر

بانِ نوشی ہی بادِ پہچانی

شاد ہر نہا ہی ہر گھڑی غالب کہ دُعا کا رگر ہوئی غالب

عام ہی عیش و خرمی غالب کیوں نہ دنیا کو ہونو عشی غالب  
شاہ دیندار نے شفا پائی

۱۰۵

نہ چلی سحر بیا فی میری ہیچ نکلی ہمہ دانی میری  
بھول کر بات نہ مانی میری کب وہ سنا ہی کجانی میری  
اور پھر وہ بھی زبانی میری

دردِ دل ای ستم انگیز نہ پوچھ حال چشم غضب آئینہ نہ پوچھ  
زخمِ نوکِ مرثہ تیز نہ پوچھ خلشِ غمزہ خونریز نہ پوچھ  
دیکھ خوں نا بہ فشتانی میری

مجھ کو اپنا ہی نہیں مئے خیال دوستوں تک کہاں جائے خیال  
کس طرح ان کا مجھے آئے خیال ہوں زخوردہ فتنہ بیدائے خیال  
بھول جانا ہی نشانی میری

ہو حریت اپنا بھی کنتا بودا جھکو جس بزم میں پایا نہ جما  
میری ہر بات میں ضد ہو گیا مقابل ہی مقابل میرا  
رک گیا دیکھ روانی میری

جبکہ نظروں میں سبک ٹھہرا ہوں      کیوں ترے ٹل پہ گراں آتا ہوں  
 کیا حقیقت ہی مری ہیں کیا ہوں      قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں  
 سخت ارزاں ہی گرائی میری

کیوں نہ بے ساختہ چکر کھاؤں      گردشِ دہرے ہی حالِ زبوں  
 غیر ممکن ہی کہ ٹھہروں دم لوں      گردِ بادِ رہِ بے تابی ہوں  
 صرصرِ شوق ہی بانی میری

موشگافی کا مجھے دعویٰ تھا      عقدہٴ موسےٰ کمر ہی نہ کھلا  
 تھا غلطِ زعمِ ہمہ دانی کا      دہنِ اس کا جو نہ معلوم ہوا  
 کھل گئی پیچھا نی میری

خط جو لکھتا ہوں تو خاصہ طوفاً      بات کرتا ہوں تو دیوانہ وار  
 کیا مجھے یاد کریں گے غمِ خوار      کیا بیاں کر کے مرادِ دینگے بار  
 مگر آشفۃٴ بسیا نی میری

مثلِ مہرِ راہونی طاقتِ غالب      قلبِ بیدیں نہیں میں غالب  
 خاکِ حقِ نیست کا اپنی طالب      کردیا ضعف نے عاجزِ غالب  
 ننگِ پیری ہی جوانی میری



(۱۰۶)

رگِ رگِ ہری شترِ فساد کی بھوکی ہو جلدِ رواں تیغِ یہ حسرتِ ہو گلو کی  
راحت ہی جراحِ است کو روانی سے ہو کی جس زخم کی ہو سکتی ہو تہِ بیرِ رو کی

لکھو بچو یا رب اسے قدرت میں عذو کی

وہ دن گئے تھیں خون سے جب پنی گئیں پیر اور آنکھ سے تھا خون کے اشکوں کا قطر  
خونِ جگرِ دول تو ہوا رزقِ تفکر اچھا ہی سہرا نگشتِ منائی کا تصو

دل میں نظر آتی تو ہوا اک بوندِ لہو کی

ناعنِ ہی قیامت کا تمہیں خوف ابھی سے کچھ ظلم بھی کرتے ہو تو سہمے ہوئے جی سے  
کرنے دو اگر کرتے ہیں شکوہ یہ کسی سے کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے جوگی سے

یاں تو کوئی سُنا نہیں سنا دیا دوسو کی

جب رخ نہ کیا ہو ترے تیروں نے ادھر کو کاٹا نہ ہو شمشیر نے سودا بھرے سر کو  
کیا لطف ملے زبیت کا پھر ایسے بشر کو دشمن نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو

خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

ہر زائغِ مونیاسے رامِ موت کا طالب چاہا کہ کرے ترک کہیں جانِ یہ قالب  
ماصل ہوا مطلوب نہ برا سے مطالب صد جہت وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب

حسرت میں ہے ایک بتِ عربہ جو کی

(۱۰۷)

حسن ہی کا دل کو سودا چاہیے اشتیاقِ رشے زیبا چاہیے

رات دن شوقِ تمنا چاہیے چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے

یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

نشہ ہوتا ہی کب ان کو سن کر کچھ نہ ساقی کے سوا آئے نظر

لاکھ یہ پیتے رہیں آنکھوں پہر صحبتِ ندان سے جب ہی خد

جائے تو اپنے کو کھینچا چاہیے

پاکے شمرہ چاہ کا دلِ خجل ہو گیا ہی درِ دو غم سے مضمحل

اب تو یہ ہی اور درِ دو حال سل چاہنے کو یہ کیا سمجھا تھا دل

باکے باس سے بگی سمجھا چاہیے

مجرموں سے پردہ ہی دیوانگی یہ تنافر اور یہ ہم خانگی

ہم سے چھپنا ہی کوئی فرزانگی دوستی کا پرہ ہی بگائگی

منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

موت کا پانا ہوں جو یا غیر کو رشک نے میرے ڈبویا غیر کو

رات دن کا غم ہو گویا غیر کو دشمنی نے میری کھو یا غیر کو  
کس قدر دشمن ہو دیکھا چاہیئے

پند میں ناصح نے بھی کر لی ہوسنی قید سے یاروں نے کیا کم کی ہوسنی  
بارہا ہم نے بھی کر دیکھی ہوسنی اپنی ہوا میں کیا چلتی ہوسنی  
یار ہی ہو گا مہ آرا چاہیئے

کب ہی مایوسوں کو اُمید نہید گوش زد ہوان کے کیونکر نشید  
کچھ نہ پوچھو سرتوں کا اپنی بھید منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید  
نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیئے

پیرزن نادم تھی اپنے قصد سے منہ تھا کیا اُس کا کہ وہ یونکے  
آہی تھی ہر صدائے غیب سے غافل ان مہ طاعتوں کے واسطے  
چاہئے والا بھی اچھا چاہیئے

یہ ضعیفی اور تلاشِ خال و خد جستجوئے نازنینِ سرو قد  
اس جنوں کی بھی ہو ترا کوئی حد چاہتے ہیں غوبرویوں کو اسد  
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

(۱۰۸)

کس طرح طوہورہ عالم امکاں مجھ سے      میں تھکا ماندہ ہوں اور دور ہی جاناں مجھ سے  
 ذرہ ذرہ دم وحشت ہی گریزاں مجھ سے      ہر قدم دوری منزل ہو نمایاں مجھ سے  
 میری رفتار سے بھاگے ہی بیاباں مجھ سے  
 جبکہ دیباچہ سے کھٹکتے ہیں مضامین یکسر      پھر یہ فرصت ہی کسے پیٹھ کے دیکھے دفتر  
 اور ہی دام میں الجھی ہوئی ہی اپنی نظر      درس عنوان تماشا بہ تغافل خوشتر  
 ہونگہ رشتہ شیرازہ مرگیاں مجھ سے  
 کیا کہوں کیسے سبر ہوئی ہیں غم کی راتیں      میرے احباب بیاں کی مجھے تکلیف نہ دیں  
 بیکسی کامری اندازہ اسی سے کر لیں      وحشت آتش دل سے شب تنہائی ہیں  
 دود کی طرح رہا سا یہ گریزاں مجھ سے  
 میرے ماتم میں وہ جب آٹھ پہر ہی گریاں      پھر خود آرائی و زینت کا وہ سامان کیاں  
 مٹ گئی سرمہ کی تحریکہ ہیں ہنکے واں      غم عشاق نہ ہو سادگی آموز بتاں  
 کس قدر خانہ آئینہ ہی ویراں مجھ سے  
 چونکہ ہی دشت مرے پاؤں سے آغشتہ بخوں      ذرے ذرے کو یہ دعوے ہی کہ میں غمگن ہوں  
 کیوں چمکتے ہوئے چھالوں کو ہوا ہر نہ کہوں      اثر آبلہ سے جادہ صحرائے جنوں

صورتِ رشتہ گوہر ہی چراغاں مجھ سے

کاش ہر اک شبِ غم میں یہی بے ہوشی ہو      تا کچھ آرام سے یہ ہو شر باگزری تو  
اس نے تو خوب ہی پہچانی ہو راحتِ دل کو      بے خودی بسترِ تہید فراغت ہو جو

پڑا ہوا سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

منہ قفل پہ ہیں آنکھ کے ارماں سائے      لکے ستریزِ نظر ہو تو کروں نطائے  
یتیمِ گلگیر سے کم تھکوا نہیں ہو پیارے      شوقِ دیدار میں گرتو مجھے گردنِ مائے

ہو نگہِ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے

کیا شبِ تار نے ڈھائی ہو قیامت ہو ہو      چھوڑ دی سایہ نے بھی میری نفاقت ہو ہو  
کتنی پر خوف ہو منزلِ گہرِ فرقت ہو ہو      بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہو ہو

سایہ خورشیدِ قیامت میں ہو پنہاں مجھ سے

بادِ صحن سے غیروں کو تو یوں مست کرے      تشنہ لب رہیں دیدار کے جو طالب تھے  
خوب نصاف کیا ساتی ہو شوقِ تو نے      گردِ دشنِ ساغرِ صدمہ جلوہ رنگیں تجھ سے

آئینہ داری یک دیدِ حیراں مجھ سے

اگِ وہ سینہ ہر زائیں بھڑکتی ہو اسد      دیکھ کر برقِ جے دور سرکتی ہو اسد  
دل میں بھی آتشِ جاں سوز دہکتی ہو اسد      نگہِ گرم سے اک آگِ شپکتی ہو اسد

## ہو چہ راعاں خس و خاشاکِ گلستانِ محبے

(۱۰۹)

دل میں وہ درد کہ جو اس کو دکھائے نہ بنے      حال اپنا وہ زبوں جس کو چھپائے نہ بنے  
بارغم میں نہ گرائی کہ اٹھائے نہ بنے      نکتہ چیں ہی غم دل اس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

گو بظاہر نہیں کچھ اس کا بلانا مشکل      ڈر مگر یہ ہو کہ ہٹ میں ہو وہ اپنی کامل  
کہیں ہونا نہ پڑے اس کے نہ آنے سے نجل      میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر ای جذبہ دل

اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

لذت جو رو جفا کو کہیں وہ شوخ نہ پائے      ضد نہ چڑھ جائے کہیں ایسی کہ پھر دل دکھائے  
ہاتھ دانستہ کہیں ظلم سے ظالم نہ اٹھائے      کھیل سمجھا ہی کہیں چھوڑ دے بھول نہ جائے

کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

خود تو رسوائے جہاں ہی یہ بد ذات مگر      نیک نامی کو کہیں تیری نہ پہنچائے ضرر  
راز داری کسے کہتے ہیں اسے کیا ہی خبر      غیر پھرتا ہی لیے یوں ترے خط کو کہ اگر

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہو تو چھپائے نہ بنے

شاخ ہی تک ہو گل تر کا شگفتہ رہنا      ہاتھ گلچیں کا پڑا اور وہ پرمردہ ہوا

چشم بد و روہ نازک ہیں کہیں گل سے سوا اس نزاکت کا بُرا ہو وہ پھیلے ہیں تو کیا

ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

نور یہ مہر میں یہ مہ میں ضیا کیسی ہو کس کی بوہرگیں نو خاستہ میں مخفی ہو

ہر طرف طرفہ تماشائے نظر بست دی ہو کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہو

پروں چھوڑا ہو وہ اس نے کٹھائے نہ بنے

غم سے گھل کر جگر و دل مے اشکوں میں بہے میں نے اب تک تو سقم وعدہ خلافی کے سہے

منتظر کیوں ہوں تمہارا کوئی اب لکھ کہے موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ بہے

تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

ہیں بُرے پیچ میں تقدیر سے ہم آئے ہوئے بات بنتی نظر آتی نہیں تدبیروں سے

کر دیا ہی ہیں مجبور بہت قسمت نے بوجھ وہ سر سے گرا ہو کہ اٹھائے نہ اُٹھے

کام وہ آن پڑا ہو کہ بنائے نہ بنے

عشق کی خاک کے کوئی ستایش غالب الاہاں قہر ہو اس برق کی تابش غالب

بارہا کی ہو یہ ہر زمانے گزارش غالب عشق پر زور نہیں ہو یہ وہ آتش غالب

کہ لگائے نہ لگے اور چھبائے نہ بنے

آیا ہر زرا کو جسے دیکھتے ہی غش غالب تم نے دیکھا نہیں وہ شعلہ سرکش غالب

باب الفت میں عبث تم ہو مشغوش غالب عشق پر زور نہیں ہی یہ وہ آتش غالب  
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

\*

شبِ فراق میں راحت دے بے حساب تھے لگی ہو آگ جو سینہ میں اس کو آب تو دے  
نجات غم سے وہ پردہ نشیں شباب تو دے وہ آگے خواب میں تسکین اضطراب تو دے  
وے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

جواب غیظ و غضب سے ہر ایک کو دینا ہو ایک آن میں و نون جہاں سے کھوینا  
وہ بھر کے سانس جگر میں چھری چھو دینا کرے ہو قتل لگاؤ میں تیرا رو دینا  
تسری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

لگا کے منہ سے عطا کوئی جام کرہم کو اُمیدوار نہ یوں صبح و شام کرہم کو  
جواب تلخ ہی سے شا دکام کرہم کو دکھا کے جنبش لب ہی تمام کرہم کو  
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تھے

خیال چھوت سے بچنے کا ہو نہ عادت ہو نہ اجتناب کسی سے نہ کچھ عداوت ہو  
میں سے اک تجھے پرہیز اور کراہت ہو پلا دے ادکسا ساقی جو ہم سے نفرت ہو  
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تھے دے



شب اس کی بزم سے اغیار یوں بلول گئے کہ پاؤں اٹھ گئے اور چوڑھی وہ بھول گئے  
 قبول خدمتِ مرزا ہوئی وہ غول گئے اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں بھول گئے  
 کہا جو اس نے مے ہاتھ پاؤں داب توئے

۱۱۱

اُدھر ناگفتہ بہ حالے بون و خوارِ بستر ہو ادھر ہونے تن خود میرے حق میں غارِ بستر ہو  
 دل بے تاب مضطرب باعثِ آزارِ بستر ہو پیش سے میری وقف کشمکش ہر تارِ بستر ہو  
 مراسرہ شیخ بالمش ہے مرا تن بارِ بستر ہو

حقیقت اشک کی اور دل کی تم سے کیا ہیں ہو مگر ماں مختصر سن لو کہ وہ کیا شی ہو یہ کیا شی  
 ہمارے ناز پروردوں میں ہیں نونِ رجب ہر شرکِ سربہ صحرا دادہ نور لعین دہن ہو

دل بے دست و پا افتادہ بر خورِ دارِ بستر ہو  
 زہے قسمت کہ تم یوں بے بلائے میسے گھر آؤ مے بیت الحزن کے جاگ اٹھے میں نصیبِ بے تو  
 مرض کا اپنے بڑھ جانا مبارک ہو گیا مجھ کو خوشا اقبالِ بخوری عبادت کو تم آئے تو  
 فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہو

ہوا اندھیر گھر میں کیا بلا فرقت کی ات آئی دردِ دیوار پر ہو کس غضب کی تیرگی چھائی  
 گمراہ گھر نے بستر کی بدولت بخشی پائی بہ طوفاں گاہِ خوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی

شمارِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بسترِ  
 خدا کا شکر ہو تقدیر ہو جاگی ہوئی اپنی      پھر اس کے خواب میں آنے کی حسرتیں ہیں ہوتی  
 بتائیں کیا بھی گل ہی تو وصلِ یار کی شب تھی      ابھی آتی ہو بالشمس کی نلفت مشکلیں کی  
 ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بسترِ  
 ہوا ہو مبتلا مرزا عجب آزار میں غالب      رہا کچھ بھی نہ باقی اس کی جانِ زار میں غالب  
 نہیں ٹھننے کی بھی طاقت اب بن بچار میں غالب      کہوں کیا دل کی کیا حالت ہو ہجرِ بابر میں غالب  
 کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بسترِ غارِ بسترِ

(۱۱۲)

بنی ہو یا رتاب ہو کہیں ان بن نہ ہو جائے      محبت کی جگہ نفرت تجھے پرفتن نہ ہو جائے  
 ریا غرہ تو میرا نفس ہی رہن نہ ہو جائے      خطرِ ہیشتہ الفتِ برگِ گردن نہ ہو جائے  
 غرور و دقتی آفت ہو تو دشمن نہ ہو جائے  
 کمالِ فصلِ گل کہتے ہیں اس کو میرزا غالب      کہ ہو ہر شجر پہنچے ہوئے گل کی قبا غالب  
 سرگلبن کھلیں دو چار گل تو کیا مرزا غالب      سمجھ اس فصل میں کوتاہی نشو و نما غالب  
 اگر گل سرو کے قامت پہ پیرا ہن نہ ہو جائے

کیا جانے اصول ہو نہیں ہو آہنگ بھی کوئی طی نہیں ہو

باقاعدہ کوئی شی نہیں ہو فریاد کی کوئی لہ نہیں ہو

نالہ پابند فی نہیں ہو

گلشن کو غرض نہیں جوڑے کیا معنی ہیں پھر کدے مڑے

کشکول کا کام کیا نہ لیں گے کیوں بڑے ہیں باغبان تو بے

گر باغ گداے مڑ نہیں ہو

جلوہ تیرا ہی چارہ سو ہر ایک کو تیری جستجو ہو

تجھ سے ہی گلوں میں رنگ بڑے ہر چند ہر ایک شی میں تو ہو

پر تجھ سے تو کوئی شی نہیں ہو

بے جا ہو خودی و خود پرستی اک ہم و خیال ہو یہ بستی

لاشی ہو یہ اوج اور پستی ہاں کھائی موت فریب ہستی

ہر چند کہیں کہ ہو نہیں ہو

پروستہ ہر ایک شی ہو ضد سے ہوتی ہو نشاط بسد غم کے

خواہاں ہو اگر الم سے چھوٹے شادی سے گزر کہ غم نہ ہو دے

اردی جو نہ ہو تو دی نہیں ہے

کچھ وہم مگر تجھے ہی زاہد      انکار شراب سے ہی زاہد

ملتی یہ نشو کسے ہی زاہد      کیوں ردِ قرح کرے ہی زاہد

موی یہ مگس کی قوی نہیں ہے

مرزا ترا ہم قدم ہو غالب      دھیان اس کو یہ مہدم ہو غالب

دم کہتے ہیں جس کو دم ہو غالب      ہستی ہو نہ کچھ عدم ہو غالب

آخر تو کیا ہو ای نہیں ہے

\*

(۱۱۳)

کچھ رشک قیبوں ہی سے تنہا نہیں کرتے      اپنی بھی نظر سے انہیں دیکھا نہیں کرتے

جان آئے جو لب بھی تو پردہ انہیں کرتے      ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے

مرتے ہیں ولے اُن کی تنہا نہیں کرتے

وہ غیر جو کہتے ہیں یہ کہنا ہو زبانی      لیکن ہو قیبوں سے لگاؤ کی نشانی

ہم سے کوئی آسان ہو یوں بات بنانی      در پردہ انہیں غیر سے ہو ربط نہانی

ظاہر کا یہ پردہ ہی کہ پردہ انہیں کرتے

قابو نہ کسی شخص کا تم پر ہو نہ بس ہو      مانو تو یہ مرزا کی نصیحت تھیں بس ہو

باز آؤ اگر مہر و وفا سے تھیں مں ہی یہ باعثِ فویدہ ای ربابِ ہوس ہی  
غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

۱۱۵

مرے سبب سے یہ خستہ جگر ہی کیا کہیے غریب کشتہ تیغِ نظر ہی کیا کہیے  
فریبِ حسن سے یہ بے خبر ہی کیا کہیے دیا ہی دل اگر اس کو بشر ہی کیا کہیے  
ہو ارقیب تو ہونا نہ ہو نہ بر ہی کیا کہیے

بدن سے جان کسی طرح جائے بن نہ ہے فراقِ جسم کا صدمہ اٹھائے بن نہ ہے  
مگر میں تو یہ پھر بھی سستا ہے بن نہ ہے یہ عند کہ آج نہ آئے اور ہے بن نہ ہے  
قضا سے شکوہ ہیں کس قدر ہی کیا کہیے

ضرور ہی کوئی موجود گی کا اس کی سبب اسی کو گشت میں پایا وہاں گئے ہم جب  
کچھ اور شغل ہی اس کو نہیں ہی فرزندِ شب رہے ہی یوں گہر و بیکہ کہ کوئے دوست اب  
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہی کیا کہیے

ہمارے سر پہ تھا جب تاجِ شباب کا آسیب نہ راہِ عشق کا سوجھا کبھی فرزندِ فشیب  
اس اک گمان سے حامل ہو دل کو شک و شبہ نہ کہتے کہ یوں سے رکھا ہی ہم کو فریب  
کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہی کیا کہیے

ہمارے درد و الم کا ہوا کسبِ سن کو خیال بلا کے گھر بھی پونچھی نہ وجہ رنج و ملال  
وہ بے سچ نہیں یہ بھی ہو ایکسان کی چال سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں ہر سرشِ حال  
کہ یہ کہے کہ سرِ مردہ گزر رہی کیا کہیئے

مختارے افس و محبت کا ہو عجبِ حوال کہ بات بات میں ہو دوستوں سے رنج و ملال  
تھیں سے ہم بھی گروں تو ہو نباہ محال تمھیں نہیں ہو سرِ رشتہ وفا کا خیال  
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہو مگر ہو کیا کہیئے

کبھی کیا بھی جو کچھ عرض حال دلِ ہم نے تو مسکرائے کہا کیوں ہوئے ہو دیوانے  
فصول ہو جیئے ہر وقت دو بد و اُن سے آنکھیں سوال پڑے عم جنوں ہو کیوں لڑیئے  
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہو کیا کہیئے

کسی کو ہم سے اگر رشکِ فن ہو کیا کیجے حسد کی آگ گزشتہ زن ہو کیا کیجے  
جہان کی یہی رسم کہن ہو کیا کیجے حسدِ سزائے کمالِ سخن ہو کیا کیجے  
ستم بہائے متلع ہنر ہو کیا کہیئے

کٹے جہان میں ہر ایشِ شکل اُس کے دن ہزار عیب لگاتے ہیں اُس کو بد باطن  
بُرا بُرا اُسے کہتے ہیں سب جوان و مومن کہا ہو کس نے کہ غالب بُرا نہیں لیکن  
سوائے اس کے کہ آشفۃ سر ہو کیا کہیئے

جب تک زاد تھا کبھی پریشانی مجھے  
کھینچ کر زنداں میں لائی میری جولانی مجھے  
تھی عدم میں ہر طرح حاصل تن آسانی مجھے  
دیکھ کر دہریہ پر گرم دامن افشانی مجھے

کر گئی وابستہ تن میری عریانی مجھے  
یوں مرا سینہ دباے وہ مری قسمت کہاں  
اور گلے پر اس کے ہاتھوں ہو یوں خجروں  
اور کیا اس کے سوا ہی خوش نصیبی کا نشان  
بن گیا تیغِ گدا و یار کا سنگِ فساں  
مر جا میں کیا مبارک ہو گراں جانی مری

رات دن آتا ہو جب بس کا تصور پڑی پڑی  
ہوں اسی دھن میں یہی مجھ کو لگی رہتی ہو  
مجھ کو عرضِ حال میں مانع نہیں ہر کوئی تڑو  
کیوں نہ ہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہو

جاننا ہو مجھ پر سہناے پہنانی مجھے  
میری بربادی تو قدرتی تقدیر کی ہی تھی  
اس پتھر پہ ہوا گھر کی بلا سر پڑ گئی  
یہ ہوتی اچھی عنایت کا تب تقدیر کی  
میرے غم خانے کی قسمت جب تم ہونے لگی  
لکھ دیا منجملہ اسبابِ ویرانی مجھے

ملتی جلتی ہو فناں اس کی مری فریاد سے  
شوق سے سنتا ہوں اپنا ہم نوا پا کر سے  
ڈال رکھا ہو پریشانی میں اس کے ہم نے  
بدگماں ہوتا ہو وہ کافر نہ ہوتا کا مشکے

اس قدر ذوقِ نواسے مرغِ بستانی مجھے

چرخ کے ہاتھوں نہ پایا چین ہیں جب تک جیا      داؤں جب اس کا چلا کچھ ظلم ہی مجھ پر کیا

تنگ آکر زیست سے جامِ اجل آخر ہیا      واسے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا

لے گیا تھا گوریںِ وقِ تن آسانی مجھے

یہ قریبِ روسیہ یوں ہی اگر و سارے      جھوٹ پر رغبت دلائے گا کہ خود مبار ہو

منتظر رکھنا کسی کو یہ بھی کوئی ناز ہو      وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہو

تم نے کیوں سوچی ہو میرے گھر کی بھائی مجھے

چاہیے بھائی سے یوں بھائی کو ہر زاد و ستی      ہو جو اس کو خرمی تو خرمی ہو اس کو بھی

جس طرح غالب نے کی اس شعر میں ظاہر خوشی      دی مے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی

میرزا یوسف، غالب یوسف ثانی مجھے

\*

(۱۱۵)

خود فراموشی ہوئی وقتِ مسرت کب مجھے      دل ہی جب نالاں ہو چہ فرحت کیا مطلب مجھے

لب پر اس کا نام تھا کچھ در پہنچا جب مجھے      یاد ہو شادی میں بھی ہنگامہ یارب مجھے

سہ زابہ ہو اہی خندہ زیر لب مجھے

کہہ گیا دل رفیع دل سے ہو گیا رنج و عن      کر رہا ہی پریشاں احوال ہر غنچہ ہن



باتیں جاتی ہی ہوتا ہوں کوئی حرف نہیں  
ہو کشادہ خاطر وابستہ در رہن سخن

تھا طلسمِ قفلِ ایبہ خانہ مکتب مجھے

اک طرف چپکا پڑا تھا کینے زنداں میں تھے  
کیوں نہ آئیں یاد دہانہ کردہ دن آرام کے  
مہلت اب م بھر نہیں آوارگی دشت سے  
یارب اس آشفگی کی داد کس سے چاہیے  
رشتہ سائیش پہ ہوں زندانیوں کی اب مجھے

رات دن رہتی ہو آنکھوں سے رول ان کے خوں  
حال دل بھی ہو گیا ہو کثرتِ غم سے زبوں

عمر گزری ہو کہ میں اس فن کا نو کردہ ہوں  
طبع ہو مشاق لذتہائے حسرت کیا کروں

آرزو سے ہو شکستِ آرزو مطلب مجھے

مجھ سے فرماتے تھے طنز اکیوں تم ایسے ہو گئے  
کیا ہوا مرزا تجھیں دیوانے کس کے ہو گئے

اب تو حضرت کیلئے نمودوں یہ قہر سے ہو گئے  
دل لگا کر آپ بھی غالب تجھی سے ہو گئے

عشق سے آئے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

(۱۱۸)

کمالِ علم اہل انجمن کی آزمائش ہو  
ہنر کا امتحان ہوا ہل فن کی آزمائش ہو

ہر اک خوشن و مشاق کہن کی آزمائش ہو  
حضورِ شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہو

چمن میں خوشنویان چمن کی آزمائش ہو

محن میں ہر گرفتار محن کی آزمائش ہو      گداز و سوز میں شمع لگن کی آزمائش ہو  
 نفس کی قید میں مرغِ چین کی آزمائش ہو      قد و گیسو میں قیس کو بہن کی آزمائش ہو  
 جہاں ہم ہیں وہاں اور سن کی آزمائش ہو

ہائیں ایسا نہ ہو محنت ہو اس کی رائیگاں آئے      نہ جئے خوں ہو جئے شیر کے بدلے واں آخر  
 غم شیریں سہے گا کس طرح وہ نیم جاں آخر      کریں گے کو بہن کے حوصلے کا امتحاں آخر  
 ہنوز اس خستہ کے نیرے تن کی آزمائش ہو

سُنی ہو اس نے کب یعقوب کی آہِ سحر گاہی      سنگھا کر بوسے یوسف اس نے کب اُس کی غشی چاہی  
 ہوئی ہے اور ہی مطلبِ کنناں کی طرف راہی      نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی  
 اسے یوسف کی بوسے پیرین کی آزمائش ہو

یہ کیا کرتے ہو تم ضبط و تحمل کے غلط دعوے      یقیں جانو کہ ہوش اڑ جائیگے جب کس کو بھوکے  
 جسے دعوئے ہوا ہلِ بزم میں بے سنبھل بیٹھے      وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے  
 شکیب و صبرِ اہلِ انجن کی آزمائش ہو

نشانی دو ہیں جس کو بھی اُڑائے اس کا تیرا کر      تو پھر شکافِ راندازی میں اس کی کچھ کیکر  
 کہاں کو کھینچنا ہی اُس کا اکِ صانِ ہر ہم پر      ہے دل ہی میں تیرا چھا جگر کے پار ہو بہتر  
 غرض شستِ بُتِ ناوکِ نلگن کی آزمائش ہو

نظا ہر تو یہ دونوں ایک ہی بست ہیں سودائی مگر یہم پرستش مختلف دونوں نے ٹھیرائی  
 غبت گردن ہر اکے رشتہ الفت میں بندھوائی نہیں کچھ سجدہ زمار کے پھندے میں گیرائی  
 وفا داری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہو

نیچر ناشکیبائی کا آخر کیا ہوا غافل تر پنے سے کہیں آسان ہو سکتی ہو بہ مشکل  
 نہ ہو جائے کہیں تجھ پر کوئی تازہ بلاناازل پڑا رہا دل وابستہ بیابانی سے کیا حاصل  
 مگر پھر تاب زلف پر شکن کی آزمائش ہو

ہمارا قصہ تھا چکھیں کسی دن ہم بھی اس سم کو مرہ لینے نہ پائے خود بخود گھٹنے لگے ہم تو  
 نیاں کا ذکر کیا اس کا اثر آگے تو پڑھنے دو رگ پی میں جب تے نہ غم تب دیکھئے کیا ہو  
 ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہو

سنا تو ہو انھوں نے یہ ارادہ کر لیا غالب کہ وہ مرزا سے عہد و پیمان غالب  
 گلاب کیجئے یہ چرخ لائے رنگ کیا غالب وہ آئیں گے مے گھر وعدہ کیسا دیکھا غالب

نئے فتنوں میں اب چرخ کہن کی آزمائش ہو

۱۱۹

اگر وہ روٹھتا ہو کب منا یا جائے ہو مجھ سے سر رہل بھی جاتا ہو تو کنیا جائے ہو مجھ سے  
 غرض جتنا بناتا ہوں بگڑتا جائے ہو مجھ سے کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گڑتا ہے مجھ سے

بجائیں کر کے اپنی یاد شرم جائے ہو مجھ سے

نظر آتا ہو خوابِ صیل تو تبسیر الٹی ہو بگڑ جاتا ہو بن کر کام کیا تقدیر الٹی ہو

مرے سب کام اٹے ہیں مری تبسیر الٹی ہو خدا یا جذبہ دل کی مرے تاثیر الٹی ہو

کہ جتنا کھینچتا ہوں او کھینچتا جائے ہو مجھ سے

اُسے کیونکر سناؤں حالِ دل ہو سخت حیرانی پریشانی کا مضمون اور بیان میں ہو پریشانی

کھلائے دیکھئے کیا گل میرے قاصد کی دانی وہ بدخوا اور میری داستانِ عشق طولانی

عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہو مجھ سے

یہ میری سرگزشت ان کے لیے تھوٹی کہانی ہو انھیں سننے سے نفرت ہو یہاں طلی سنانی ہو

مجھے دشوار اپنے دل کی کیفیت سنانی ہو اُدھر وہ بدگمانی ہو ادھر یہ ناتوانی ہو

نہ پوچھا جائے ہو ان سے نہ بولا جائے ہو مجھ سے

ہمارے بہت اُمید و تصدیر کی بدولت ہو قضا کا سامنا ہو کیا بلا ضعفِ نفاہت ہو

خیالی زندگی ہو ورنہ کیا جینے کی صورت ہو سنبھلنے دے مجھے ایسا اُمید ہی کیا قیامت ہو

کہ دامنِ خیال یا رچھوٹا جائے ہو مجھ سے

گوارا دل کو یہ کب ہو کہ دیکھیں اس کو اس دہن تقاضا شک کا یہ ہو وہ آنکھوں میں ہے ساکن

وہ جب جلوہ نما ہوگا تو ہوگا عطر کا وہ دن تکلف برطرفِ نظارگی میں بھی ہو ہیسیکن

وہ دیکھا جائے کب ظلم دیکھا جائے ہو مجھ سے

سمجھ رکھا تھا میں نے عشق کو کٹ ل لگی دل کی کہاں کی دل لگی یہ تو مصیبت پر گئی مٹی

نہ کر کیا مجھ کو اس کی معرکہ آرائیوں کی بھٹی ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نہر عشق میں نہی

نہ بھاگا جائے ہو مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہو مجھ سے

مجھے آتا ہے یہ خوابے یاشاں کیا نظر غالب بنے گی دیکھئے کیسی دل بے تاب پر غالب

نہ کیوں اس شکست ہو خون مرزا کا جگر غالب قیامت ہو کہ ہوئے مدعی کا ہم سفر غالب

وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہو مجھ سے

❖

(۱۲۰)

روشن میں جو ہو گنبدِ خضر امرے آگے فانوسِ خیالی کا ہو نقشِ امرے آگے

وارض کو اک گیند کا رہتا امرے آگے بازیچہ اطفال ہی دنیا امرے آگے

ہوتا ہی شبِ روزِ تماشا امرے آگے

بالبلہ ہو گنبدِ گرداں مرے نزدیک فندے سے بھی کمتر ہی بیاباں مرے نزدیک

شعبہ نیرنگی و دوران مرے نزدیک اک کھیل ہی اورنگِ سلیمان مرے نزدیک

اک بات ہی اعجازِ مسیحا مرے آگے

ارض ہیں اوہام تو اجسام ہیں مستو ہی نام ہی نام ان کا حقیقت ہیں سب دور

ہر رنگ میں موجود ہی صرف نایک وہی نور جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور

جز وہم نہیں ہستی اشیاء مرے آگے

اُڑتا ہی بیابان کا خاکا مرے ہوتے اُٹھتا ہی بگولے پہ بگولا مرے ہوتے

اشکوں سے ہی سیلاب کا نقشہ مے بہتے ہوتا ہی نہاں گردیں صحرایہ مرے ہوتے

گھسٹتا ہی جہیں خاک پہ دریا مے آگے

دیکھے تو کوئی دل کا ٹپنا ترے پیچھے کیا کہیے گزر جاتی ہی کیا کیا ترے پیچھے

جینا مجھے دشوار ہی گویا ترے پیچھے مت پوچھ کہ کیا حال ہی میرا ترے پیچھے

تو دیکھ کہ کیا رنگ ہی تیرا مرے آگے

ہوتا ہوں میں جس وقت میرا بے ستر ہوا اُٹھتے ہیں حجابات عیاں ہوتے ہیں ستر

ہی نشہ سے وابستہ گہر ریزی افکار پھر دیکھیے اندازِ گل افشانی گفتار

رکھ دے کوئی پیما نہ و صہبایہ مرے آگے

رہتا تھا شب و روز اسی بات پہ جھگڑا ذکر اس کا کرے کوئی مجھ کب تھا گوارا

اب لاکھ کوئی ذکر کرے کچھ نہ کہوں گا نفرت کا گماں گزرے ہی بین شک سے گزرا

کیونکر کہوں لو نام نہ اس کا مرے آگے

اسلام ہو مانع جو مجھے دھڑکے لے کفر ہر خندِ عقیدت سے جگہ آنکھوں میں نے کفر

ماضر ہے خدمت کو کمر باندھ لئے کفر  
ایساں مجھے روکے ہو جو کھینچے ہو مجھے کفر  
کبہ مرے پیچھے ہو کیسا مرے آگے

یہ وہ ہوں کہ جس کام کو چاہا نہ کر کا کام  
اس شوخ کے آگے نہ چلا پر نہ چپ لا کام  
چرت ہو کہ کیوں اپنی تمنا میں ہوں نا کام  
عاشق ہوں مہشوق فریبی ہو مرا کام  
مجھوں کو برا کہتی ہو لیسی مرے آگے

وقت میں گزرتے تھے جو سوطح کے صدمے  
کرتا تھا دعاروح کہیں جسم سے نکلے  
اب ان سے جو ملتا ہوا دی جان خوشی سے  
خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے  
آئی شبِ ہجرال کی تمنا مرے آگے

موجود ہو جو سوزِ دروں کاش یہی ہو  
ہو جس قدر رنجِ جنوں کاش یہی ہو  
اب تک ہو جو کچھ حالِ نبوں کاش یہی ہو  
ہو موجزن اک قلزمِ غل کاش یہی ہو  
آتا ہو ابھی دیکھیے کیا مرے آگے

ظاہر ہو نزاع میں بھی دافعِ غم ہو  
اٹھو اتنے ہو کیوں پاس سے کیا یہ کوئی تم ہو  
غبرو کہ یہ ہر تاؤ دم مرگِ ستم ہو  
گو ہاتھ کو جنبش نہیں نکھوں میں تو دم ہو  
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

دلستہ اس ذات سے جو ناز ہو میرا  
اس امر میں ہر زانی ہم آواز ہو میرا

ہم کار ہی اور ہندم و دمساز ہی میرا ہم پیشہ وہم مشرب و ہمارا ہی میر  
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

(۲۲۱)

امید کیا ہے جو کچھ اپنا ماجرا کہیے ہماری بات کو کب آپنے سنا کہیے  
کروں جو شکوہ تو پھر کیا مری خطا کہیے کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے  
تھیں کہو کہ جو قسم یوں کہو تو کیا کہیے

اگرچہ حسن کے جو رجحان ہی یور ہیں حسین انھیں سے تو راستہ ہر سہی  
خدا نخواستہ کب یہ تمھارے جو ہر ہیں نہ کہیوں سے پھر تم کہ ہم ستم گویں  
مجھے تو خواہی کہ جو کچھ کہو بحال کہیے

جو آشنا ہو وہی آشنا کے گھر جائے نہ بڑھ سکے گا قدم کوئی غیر اگر جائے  
جھے جو جس سے تعلق وہ بے خطر جائے وہ نیست تر سہی پر دل میں جبکہ تر جائے  
نگاہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

ہزار سینے کو چھلنی بنائے زخم سناں کٹا دل میں مگر تیر کو جو دل کہاں  
کھلا ہوا ہو جو راحت ہے وہ راحت جاں نہیں فریہ راحت جو راحت پیکان  
وہ زخم تیغ ہی جس کو کہ دل کٹا کہیے



بشر کو چاہیے ہوصاف سینہ کہنے سے  
برا ہی ظلم و ستم کو ہو ظلم کے بدلے  
مرا تو یہ کہ بن جاؤ دوست دشمن کے  
جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے  
جو ناسنرا کہے اس کو نہ ناسنرا کہیے

کبھی جو میٹھ بھی جاتے ہیں ہم غزل لکھنے  
تو بار بار تقاضے یہ ہوتے ہیں دل کے  
کہ آج خوب ہی جی بھر کے ویسے دکھڑے  
کہیں حقیقتِ جاں کا ہی مرض لکھیے  
کہیں مصیبتِ ناسازی دوا کہیے

کبھی میانِ ملالِ دلِ نریں کیجے  
کبھی فغانِ جہاں سوز و آتش کیجے  
کبھی روایتِ ہجرِ بہت کیجے  
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے  
کبھی حکایتِ صبرِ گریزِ پا کہیے

نجاتِ غم ہے جو ہے اس کو اور کیا دیجے  
نثار کیجے دل کو یہی صلا دیجے  
جو سہرا اُسے تو جلاؤ کو وُعا دیجے  
رہے نہ جان تو قاتل کو خون بہا دیجے

کئے زبان تو خنجر کو مر حبا کہیے

جو بار پاس نہیں ہو خیالِ یار تو ہو  
تصور اس کا شبِ غم میں غمگسار تو ہو  
یہ اک فریقہ تسکینِ جانِ زار تو ہو  
نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہو

روانیِ روش و مستی ادا کہیے

جو فرش گل نہیں چلے تو سبزہ زار تو ہوا  
چمن نہیں تو مرا سینہ داغدار تو ہوا  
جگل نصیب میں پئے نہیں ہو خار تو ہوا  
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہوا  
طراوت چمن و خوبی ہوا کہیے

نجات غم سے نہ ہوگی یقین تھا غالب  
مقامِ شکر ہو میرے ٹلی بلا غالب  
بہی ہو مسکِ منزل بھی میرا غالب  
سینہ جبکہ کنارے پہ آگیا غالب  
خدا سے کیا ستم و جور نا خدا کہیے

(۱۲۲)

با آبرو تو خلق میں کیا خاک ہو گئے  
تھے غرقِ بحرِ شرم کہ پیراک ہو گئے  
مشہور اک زمانہ کے چالاک ہو گئے  
رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے  
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

تھی خوشی کی چاٹ بیڑب لگی ہوئی  
پینے میں ہم نے آٹھ پہر کچھ کسی نہ کی  
آخر کو رنگ لاکے رہی اپنی مفیسی  
صرف بہائے ہوئے آلاتِ خوشی  
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

لچھے نہیں ہو اب تو ذرا بھی کسی سے تم  
ہر اک سے پیش آنے لگے دل لگی سے تم  
جا جا کے اب تو تھے ہو ہر آدمی سے تم  
سوائے دہر کو ہوئے آوارگی سے تم

بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

جن کو نہیں ہو عاشقی و عشق کی خبر  
ادنے ہیں متعرض وہی تاثیر آہ پر  
گلشن میں دیکھئے اثر آہ افسردہ  
کہتا ہوں کون نالہ لبیل کو بے اثر

ہر دے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

دل میں وہ آگ کتنی کہ سراپا بجا دیا  
ہستی کو عاشقوں نے دیا خاک میں ملا  
پایا انھوں نے زندگی شمع کا مزا  
پوچھے ہو کیا وجود و عدم اہل شوق کا  
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرتے تھے جی ہی میں دردِ سرخ و غم گلہ  
تھا عالم خیال ہی میں دم بدم گلہ  
جرات جو پھر بڑھی تو ہوا ہم کو سم گلہ  
کرتے گئے تھے اس کے تغافل کا ہم گلہ

کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

مرزا جو دل تھا اس کے لیے جیسے بود و باش  
کرتے ہی قتل اس کو کیا پہلے پاش پاش  
ظالم نے خود ہی کرو یا پردہ ستم کا فاش  
اس رنگے اٹھانی کل اس نے ہند کی لاش  
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غم ناک ہو گئے

مجھ کو غم سے رہا کرے کوئی غم گساری ذرا کرے کوئی

لاکھ دعوے کیا کرے کوئی ابن مریم ہوا کرے کوئی

میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

حلقہ زلفِ جلتہ زنجیر دونوں ابرو ہیں خنجر و شمشیر

جلوہ حسن وہ کہ برقِ نظیر چال جیسی کڑی کمان کا تیر

دل میں ایسے کے جا کے کوئی

میرا قاتل وہی نگار سہی دو جہاں میں قصور وار سہی

خوں بہا اس کے سر ہزار سہی شرع و آئین پر مدار سہی

ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

اس کی محفل تمام گونگی ہو کچھ کہے کس کو تاب اتنی ہو

لب ہلائے مجال کس کی ہو بات پرواں زبان کشتی ہو

وہ کہیں اور شنا کرے کوئی

ذکر ہوتا ہو جا بجا کیا کچھ غور کرتے ہیں آشنا کیا کچھ

کہہ گیا دل کا ہر عا کیا کچھ بسا ہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

جو لڑے اس سے تم لڑو نہ کبھی رکھو آزاد زندگی اپنی

کیا ضرورت جواب دینے کی نہ سنا کر بُرا کہے کوئی

نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

کوئی تم کو جو دے اذیت بھی درپڑا انتقام ہو نہ کبھی

رہنمائیِ خلقت ہو اچھی روک لو گر غلط چلے کوئی

بخش دو گر خطا کرے کوئی

جو بظاہر ہیں خرم و خورند وہ ہیں ناشاد تم سے بھی نہ چند

ہو دیرِ احتیاج کس پر بند کون ہو جو نہیں ہو حاجتمند

کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیوں نہ شکوہ کریں تقدیر سے کھینچ لایا ہو دشت میں گھر سے

رکھیں اُسی رخاک رہبر سے کیا کیا خضر نے سکندر سے

اب کسے رہنا کرے کوئی

ان سے جب تانک میٹھی غالب شکوہ سنجی کی تو رہی غالب

عش ہو مرزا کی خامشی غالب جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب

کیا کسی سے گلہ کرے کوئی

(۱۲۳)

فلک کے جوڑے غم کیا ہی اور ہم کیا ہی      یہ میری تاک میں اور رہی ستم کیا ہی  
جو موی کھ ہو سلامت تو پھر الم کیا ہی      بہت ہی غم گیتی شراب کم کیا ہی  
غلام ساتھی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہی

تھارے قول ہیں کیا چیز اور قسم کیا ہی      مال اس کا ستم ہی تو یہ کرم کیا ہی  
ذلیل ہو گا کسی دن اُسے بھرم کیا ہی      تمھاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہی  
رقیب پر ہی اگر لطف تو ستم کیا ہی

بچو میوں کے خیالات خام ہیں بے سود      نہ سعد و نحس نہ ان کے شکنجے کا وجود  
کسی پہ کھل نہیں سکتی مشیتِ مسبود      لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود  
کسے خبر ہی کہ واں جنبشِ ستم کیا ہی

کرے حلف سے بھی وہ بہت جو ترکِ روجھا      مجھے یقین نہ آیا نہ آئے گا اصلا  
خدا سے منحرف اور منکر جزا و سزا      نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا  
خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہی

ہوئی ہو ہر سیماں کی عدل سے محکم      دکھائی دیتا تھا عالم یہ جام پر تھا بھرم  
انہیں صفات سے دونوں کا ہو جو و عدم      وہ داد و دید گر انما یہ شرط ہی ہمدم

وگر نہ مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہی  
 بلا کسی نے کہا ہی کسی نے دام اُسے  
 کسی نے دی اُسے تشبیہ نیشِ عقرب سے  
 کھلے نہ جب تو معما اُسے نہ کیوں کہیے  
 کٹے تو رات جو کاٹے تو سانپ کہلائے  
 کوئی بتاے کہ وہ زلفِ خمِ بخم کیا ہی  
 جدِ پطرس کا اردو زبان میں بانی  
 وہ فارسی کہ جسے سن کے دنگ ایرانی  
 سخن وروں میں ہی ترزا وہ فردا ثانی  
 سخن میں خامہ غالب کی آتش افشانی  
 یقین ہی ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہی

(۱۲۵)

ہوں کیونکر خوشی نکلی نہ دل سے بچ و غم نکلتے  
 یہ سب نکلے مگر افسوس کیونکر یہ اطم نکلتے  
 پوری حسرتیں نکلیں نہ ارمان یک قلم نکلتے  
 ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پدم نکلتے  
 بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلتے  
 ہوا جلا دکو کیا وہم رو کا کس لیے خیر  
 بہت کشتِ غول قاتل کے سروغول ہا کیونکر  
 نہیں تپا ہوا باتی کہ خیر لب ہی کر لے تر  
 ڈسے کیوں میرا قاتل کیا ہے گاں گی دن پر  
 وہ غول جو پھر ترسے عمر بھر یوں دم بدم نکلتے

نوٹ: اس غزل کے اندر شروابِ حشر و عذاب کا اشارہ ہے۔ ہندوؤں نے منگل کو اولیٰ میں اچھال کر سو مہرِ نارا علی راہ پرانہ غزل کا  
 بیان میں درج ہے۔

بکھی ہم بھی تھے تیرے سایہ دیو میں ساکن  
رسائی پر ہماری شک کے تھے سبب ان جن  
ہیں جب نے اٹھوایا دے سے یا دیو وہ دن  
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن  
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ترے گیسوے پیچاک کے مقابل کبے اقد تھا  
زمانہ نے مگر اک فتنہ محشر اُسے سمجھا  
غنیمت ہو کہ اس پیچیدگی نے رکھ لیا پردا  
بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی ورازی کا  
اگر اس طرہ پر ہیچ و خم کا ہیچ و خم نکلے

عجیب کیا ہو ہمارا خط اگر اُس کو پسند آئے  
پھڑک جائے عبارت کچھ کر اور قدر فرمائے  
نہ پہنچیں ہم تو کیا تحریر ہی اپنی پہنچ جائے  
مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط تو ہم سے لکھوائے  
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی ہر رنگ میں جب پیر پوچھا نہ کونا کامی  
نہ دور جام سے حاصل ہوا کچھ غیر بدنامی  
نظر جھپٹائی خوشیوں کے طرف میں غامی  
ہوئی اس ور میں منسوب مجھ سے یادہ آشنائی

پھرا یا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے  
کریں کیا خاک جرات حالِ رد و غم سنانے کی  
کہاں ہے بہت کسی کو اپنے زخم دل دکھانے کی  
کریں کیا شکوہ کچھ حالت ہی ابتر اوزمانے کی  
ہوئی جن سے توقع خوشی کی داو پانے کی  
وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغ الم نکلے



اگر ہم شمع سوزاں ہیں تو وہ آتش کا پر کالہ جلانا خاصہ اس کا ہماری زندگی جلنا  
 اسی کا پر توہ ہے اپنا سامان بھاگویا محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا  
 اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کا فر پہ دم نکلے  
 ہر منہ کیا کرتا تو ہی می کا بسیار واعظ بیان حرمت می میں ہی مشہور جہاں واعظ  
 ہی حیرت ہے مرزا کو بھی کیوں پہنچا وہاں اعظ کہاں بیخانہ کا دروازہ غالب و کہاں اعظ  
 پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

(۱۲۶)

ساقی سیاہ مست ہے تو لطف خاک ہے قصہ ہی پھر تو پینے پرانے کا پاک ہے  
 ساقی کی آنکھ پر بٹ صہبا کی تاک ہے مستی بہ ذوق غفلت ساقی ہلاک ہے  
 موج شراب یک مرزہ خوابناک ہے  
 رہتی ہے اس کو خنجر و پیکاں کی جستجو آنکھوں پہر ہو ذوق جراحت کی گفتگو  
 ہر دم سنان و تیر کا نقشہ ہے روبرو جز زخم تیغ ناز نہیں دل میں آرزو  
 جیسا خیال بھی ترے اکتوں سے چاک ہے

وادی تنگ بے ہیں بھاتا نہیں اسد نظروں میں اپنی دشت سہانا نہیں اسد  
 مرزا بھی ماہ چارہ بتاتا نہیں اسد جوش جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد

صحرا ہماری آنکھ میں اک مشت خاک ہے

\*

(۱۲۵)

اُس کی ہوا میں ہر گلِ تر دلِ نگار ہے      رخ کا پسینہ روکشِ عطر بہا رہی  
بوسے بدن سے باوصبا مشکبار ہے      جس جانشیم شانہ کش زلفِ یار ہے  
نافہ دماغ آہوئے مشکِ تیار ہے

دلِ جلیتے جی اٹھائے گیا سر پہ باڑق      ہم خاک میں ملے تو ہوا انتشارِ شوق  
کیونکر ضنائے دشت نہ ہو آبِ شکارِ شوق      ہی ذرہ ذرہ تنگی جاسے غبارِ شوق

گردام یہ ہی وسعتِ صحرا شکار ہے  
آنکھوں سے کون پرورشِ ہی چھپا ہوا      کس کے خیالِ دید میں سکنہ سا ہو گیا  
کیوں اس طرح کیا ہی تہیہِ تلاش کا      کس کا سراغِ جلوہ ہی جہت کو یا خدا  
آئینہ فرسشِ ششِ جہتِ انتظار ہے

ہی بس کہ شوخ چشمِ بڑا مدعا علیہ      تسلیم کیوں کرے گا خطا مدعا علیہ  
دے گا جواب دیکھیے کیا مدعا علیہ      دلِ مدعی و دینِ بنا مدعا علیہ  
نظارہ کا مقدمہ پھر رو بکا رہی

تیارِ سفر میں ہی غنچوں کو بیچ و تاب      پادرِ رکاب ہیں یہ گلوں کو ہوا اضطراب

پتے اُتر کے شلخ سے کرتے ہیں پاتر اب چڑھ کے ہو شبنم آئینہ برگ گل پر آب

ای عند لیب وقت و دایع بہار ہو

ہو کیوں نہ انتظار سے دل بنگلی مجھے تسکین اس خیال ہی سے ہو ٹری مجھے

ایفا کی گونہیں ہو کچھ امید بھی مجھے بیچ آپڑی ہو وعدہ دلدار کی مجھے

وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہو

اب تک تو ہر کی بھی نہ تجھ پر پڑی نظر ذرتوں کی آنکھیں دیکھ کہیں ہیں نہ پردہ ہو

لیلیٰ نہ پھرنا چاہیے بیباک اس قدر بے پردہ سوئے اوی جھٹوں گزرنہ کر

ہر ذرہ کے نقاب میں دل بے قرار ہو

بے کار ہو مرقع دل واہ کیا کہی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو ہوا سے آگئی

ہو پاس ایسا آئینہ اور پھر یہ مگر ہی دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی

ای سید ماغ آئینہ تمثال دار ہو

اُٹھنے کو ہی جہن سے عملداری نیراں تنکا بھی پھر نہ آئے گا تجھ کو نظر بہاں

غافل یہ کثرتِ خس و خاشاک پھر کہاں ای عند لیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں

لموت ان آمد آفصل بہار ہو

مرزا کی طرح کچھ بھی نہیں س کو حقیقۃً یہ ننگہ اور اس میں یہ فرحت یہ انبساط

یہ جوشِ حرص اور قوی میں یہ انحطاط غفلتِ کفیلِ عمر و اسدِ ضامنِ نشاط  
ای مرگِ ناگہاں تجھے کیسا انتظار ہو

❖

(۱۲۸)

تو وہ حسین ہو کہ خود آرا کہیں جسے شاہانِ حسن تاجِ سرا پہنا کہیں جسے  
ہو اور کون حسن میں یکتا کہیں جسے آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے  
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حیران ہو جو الفتِ حسن و جمال میں اک انقلاب ہو دلِ خستہ کے حال میں  
سکتہ ہوا تصویرِ ذوقِ وصال میں حسرت نے لارِ کھانری بزمِ خیال میں  
گلدستہ نگاہِ سویدا کہیں جسے

دل کو کیا ہو عشق نے کس غم میں مبتلا کرتے ہیں اس کو بہم ورجا رات دن فنا  
آنکھوں کو کس نے شوقِ فطر کا لگا دیا پھونکا ہو کس نے گوشِ محبت میں خود  
افسونِ انتظارِ تمت کہیں جسے

کیونکر جنون و جوشِ وحشت کو ٹالیے وحشی کو کس طرح دیمِ غبتِ تنہائیے  
دل کا غبار اور تو کیونکر بٹا لے سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے  
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحر ا کہیں جسے

انکھوں میں ہو سمایا ہوا بحر ہیکراں اس زور کا ہی مدّ و تلاطم کہ الاماں  
 دنیا کا حال کیا ہو اگر اشکِ ہواں ہی چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں  
 شوقِ عناں گنہگار دریا کہیں جسے

بھلی ہوئی ہو چاندنی یا تیرہ ابر ہو دونوں ہیں بے طرح متقاضی کہ محو پیو  
 ہوتی نہیں بسرِ جو شبِ غم شراب دو در کا رہی شگفتن گلہائے عیش کو  
 صبح بہارِ پنبہ مینا کہیں جسے

جس کے بُرائی دل میں ہو اچھا وہ کیا کہے کچھ بھی گلہ نہیں ہی اگر ناسزا کہے  
 مرزا سے صبر سیکھ کہ دنیا بھلا کہے غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے  
 ایسا بھی کوئی ہی کہ سب چھا کہیں جسے

(۱۲۹)

سا مانِ مرگ پہلے مہیا کرے کوئی پھر تجھ سے گفتگو کی تمنا کرے کوئی  
 بیٹھا خاموش یوں تجھے دیکھا کسے کوئی جب تاتِ ہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی  
 مشکل کہ تجھ سے راہِ سخنِ اکرے کوئی

کیونکر ہو خاکِ عاشقِ جانبار سے مفر اس کو ہوا لیے ہوئے پھرتی ہو دوش پہ  
 وادیِ نجد پر ہی نہیں صرف منحصر عالمِ غبارِ وحشتِ مجنوں ہی سرسبز

کب تک خیالِ طرہ لیلیٰ کرے کوئی

پڑ مر دہل میں فقی جو تنائے التفات  
آخر وہ آج کمتے ہوئے آئے التفات  
لیکن یہ جان لیں ہی وولے التفات  
افسردگی نہیں بل فراسے التفات

ہاں دردِ بن کے دل میں مگر جا کے کوئی

کٹتے ہیں صبر و ضبط میں آٹھوں پہر مجھے  
دل کھول کر نہا پے دے اب شکستے مجھے  
چھوڑاں نصیحتوں کو نہ ٹھونٹاں قدر مجھے  
رونے سے ای ندیم ملامت نہ کر مجھے

آخر کبھی تو عقدہ دل واکرے کوئی

دخستگی ہزار طرح رو نما ہوئی  
با اینہما بغض نہ توجہ ذرا ہوئی  
میں نے قبا جو چاک کی کیا خطا ہوئی  
چاکِ جگر سے جب پریشاں ہوئی

کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

واوی کے سامنے ہی چین کا چرغ گل  
بادِ بہار کا نفسِ سرود سے ہی غل  
کیونکہ نہ رشکِ گلشنِ جنت ہو دستِ گل  
نخستِ جگر سے ہی رگ ہر خارِ شلِ گل

تا چند باغبانی صحرا کرے کوئی

تیری شعلِ حسن ہواک تیر حشیم دوز  
مطالع نہیں ہی آنکھ کو تابِ نظرِ منور  
ہم دیکھیں کس طرح بٹھے اسی مہرِ نیم روز  
ناکامی نگاہ ہی برقِ نظارہ سوز

تو وہ نہیں کہ تجھ کو متاثر کرے کوئی

وحشتِ دوں کو کیا خیرِ فرقِ پاؤ دستِ اطفالِ گم و سرہن ہیں اپنی منہست  
سہرچہ پٹنے کا مفت میں ہوتا ہی بند و بست ہر سنگِ خوشت ہی صدفِ گوہرِ شکست

نقصانِ نہین جن سے جو سودا کرے کوئی

ہم چاہتے ضرور کچھ اپنے خدا سے عمر بڑھ جاتی شاید اور دعا و دوسے عمر  
تنگ آگئی مگر ترے عہد و وفا سے عمر سربر ہوئی نہ وعدہ صبر آتا سے عمر

فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

آوارگی وشت ہی وحشت دے کا شغل حسرت کشی ہو ضعف کے مارے ہوئے کا شغل  
دامانِ جیب کھٹا پڑا بھی ہو مرنے کا شغل بیکاری جنوں کو ہی سرپیٹنے کا شغل

جب تک ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

بیکار ہی سخن سے طبیعت کا خنز و میز انشاؤا اختراع سے بے جا نہیں گمیز  
بے سود ہو نتیجہ افکارِ طبع تیز ہو وحشتِ طبیعت ایجادِ داس خنز

یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

روشن کلام دہر سے کا نور ہی اسد گویا چراغِ مرن و بے نور ہی اسد  
مرزا بھی اب یہ کہنے پہ مجبور ہی اسد حسنِ فروغِ شمع سخنِ دودہر ہی اسد

## پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

\*

(۱۲۰)

یہ داغ دکھا کر جو گلستاں میں ہنسا ہو      عشاقِ دل افکار کے نزدیک خطا ہو  
 نادم ہو کہ غرقِ عرقِ شرم ہوا ہو      شبنم بہ گل لالہ نہ خالی ز ادا ہو  
 داغِ دل پڑ در و نظر گاہِ حیا ہو

ہو بوسے حنا سے یہ آنکھیں مستی بسیار      مطلق نہیں حالِ دلِ غمگیں سے خبردار  
 فرصت ہی نہیں ہاتھوں کے نظارے زہار      دلِ خوشدہ کشمکشِ حسرتِ دیدار  
 آنسو بدستِ بت بدستِ حنا ہو

کلم آتشِ سوزناں سے نہیں حسرتِ دل بھی      جلتا ہی اپنا ہو تو مٹ جائے گی ہستی  
 سینے میں تمنا نے عجب آگ لگا دی      شعلے سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی  
 جی کس قدر افسردگیِ دل پہ چلا ہو

تصویر کی کیا قدر کریں غیر ہیں بد ذوق      ہم محو ہیں اس درجہ کہ رکھتا نہیں جہِ ذوق  
 جاسکتا نہیں آنسو سے تابہِ ابدِ ذوق      مثال میں تیری ہو وہ شوخی کہ بصدِ ذوق  
 آئینہ بہ اندازِ گلِ آغوشِ کشا ہو

قری کی صداؤں سے ہو ہر سروِ سہیِ دنگ      ببل کے اس انداز سے ہر غنچہ ہو دلِ تنگ



دونوں میں رخِ راسخ و تیش پہنایا کہ نہیں فرسنگ  
فری کین خاکسترو بلبلی قفسِ رنگ

ای نالہ نشانِ جگر سوختہ کب ہو

عادت نے تری ہست کیا ہستِ دل کو  
مجبور بدلتا ہی پڑا حالتِ دل کو  
بڑھنے نہ دیا ولولہ و جراتِ دل کو  
خونے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو  
مشتوقی و بے وصلگی طُرفِ بلا ہو

وہ لاکھ جفا ہیں کرے دے لاکھ اذیت  
دُشوار ہو آسان نہیں ترکِ محبت  
کچھ پاسِ باں ہو ہمیں کچھ پاسِ مرگ  
مجبوری و دعوائے گرفتاری اُلفت  
دستِ تہہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہو

ہی قابلِ عشاق پریشانِ گزشتہ  
باقی ہو ابھی اس میں وہی شانِ گزشتہ  
کبھی ہو عیاں قتل کے سامانِ گزشتہ  
معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ  
تینِ ستم آئینہ تصویرِ نسا ہو

نظروں میں شبِ تار سے بدتر ہو چربی  
شائقِ ترے انوار کا دل بھی ہو جگر بھی  
روشن ہیں ترے نور سے دیوار بھی در بھی  
ای پر تو خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی  
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہو

تقدیر ہی قدرت نے یہیں ہی ہو کچھ ایسی  
ہم پر نہ پڑی ہو نہ پڑے تیری تجلی

محروم بجز میرے نہیں جلوے سے کوئی      اوی پر تو غور شبید جہاں تاب ادھر بھی  
 سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہو  
 جاتا تو ہوں دنیا سے مگر بادلِ ناشاد      کیا کیجئے بے وقت پڑی موت کی افاد  
 ارمان بھرے دل کی بھی ہو تجھ سے ہی فواد      ناکر گناہوں کی بھی حسرت کی طے داد  
 یارب اگر ان کروں گناہوں کی سزا ہو  
 تو اہل زمانہ پہ جو مایل نہ ہو غالب      یہ حسرت و حراماں کبھی حاصل نہ ہو غالب  
 ہرگز اے سوا غیر کا تامل نہ ہو غالب      بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالب  
 کوئی نہیں تیرا تو مری جان حسدا ہو

(۱۳۱)

غلمان کی نیکل نہ صورت ہو عور کی      سمجھے گا اس کو کیا کوئی ہو بات دور کی  
 اک بہر امتحاں تھی ضیا کوہِ طور کی      منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی  
 قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی  
 بہر نظارہ اہل جہاں کے جماؤ ہیں      انداز ہوا داہی کرشمے ہیں چاؤ ہیں  
 پھولوں کی بھیاں ہیں بدن پر جو گھاؤ ہیں      اکٹوں چکاں کفن میں ہزاروں بھاؤ ہیں  
 پڑتی ہو آنکھ تیرے شہیدوں پہ عور کی

وہ مہکباں کی جس سے نہ لذت اٹھا سکو دیکھو نہ جس کو خود نہ کسی کو دکھ سکو  
خود جاسکو جہاں میں نہ گھر بیٹھے پاسکو واعظ نہ تم دیو نہ کسی کو پلاسکو

کیا بات ہو تمھاری شراب طہور کی

پھر ہو رہا ہے مجھ کو قیامت کا سامنا ہو دغذغہ وہی جو کبھی زندگی میں تھا  
یہ جان کر کہ آج ہو دن عدل و داد کا لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا

گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

پھرتی ہو باغ باغ نہ غم ہو نہ کوئی رنج گانے لگی ترانہ نوبے رباب و صنح  
گویا ملے گا اس کو زنگل سے کوئی گنج آمد بہار کی ہے جو ٹہلے ہو نغمہ سنح

اڑتی سی اک خبر ہو زبانی طہور کی

مانا کہ یہ نگاہ سے ڈلے ہوئے تو ہیں عزت کو لیکن اپنی سنبھالے ہوئے تو ہیں  
اُم القریٰ کی گود کے پالے ہوئے تو ہیں گویا نہیں پروا کے نکالے ہوئے تو ہیں

کب سے ان بتوں کو بھی نسبت ہو دور کی

بڑے ہی تھے ملا ہو جنہیں یوں کھلا جواب دیکھیں تو دیتے ہیں نہیں پردے سے کیا جواب  
خطرہ نہیں کسی کو اگر مل گیا جواب کیا فرض ہو کہ سب کو ملے ایک سا جواب

آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

مِثْلِ زَبَانِ شمعِ زباں میں ہو وہ اثر پھونکا اُسے کسی سے ہوئے ہم سخن اگر  
پر کالہ آگ کا بھیس کست ہو ہر بشر گرمی اسی کلام میں لیکن نہ اس قدر  
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

مُرزا یہ شوقِ جج کا ہو جس طرح اب ہیں اُس وقت تھیں نہیں لی غالب جس پریش  
آخر یہ بات کہہ گیا وہ آکے جوش میں غالب گراس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں  
جج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

\*

(۱۳۲)

اس کو جو غم گردش ایام بہت ہو اس واسطے جو یاے می و جام بہت ہو  
مُوخاری و زندگی میں یہ بدنام بہت ہو غم کھانے میں بودا دل کام بہت ہو  
یہ رنج کہ کم ہو مئے گلفام بہت ہو

مجھ رندِ بلا فوش کو چسکا ہو یہ محو کا ہو بانِ سر جوش ہی اس کی نہیں پروا  
میں شوق سے لے لو گنا جو تلچٹ بھی وہ مئے گا کہتے ہوئے ساقی سے جیا آتی ہو ورنہ  
ہو یوں کہ مجھے دُرِ تہِ جام بہت ہو

پنہاں نہیں لبِ دِامِ گلستاں کی نہیں میں خطرہ ہی نہیں کوئی دلِ گوشہ گزیں میں  
پچھتے نہیں لبِ خارِ المِ قلبِ حزن میں فی تیر کہاں میں ہو نہ صیا و کیس میں

گوشہ میں نفس کے مجھے آرام بہت ہی

لاہج سے جو تکلیف عبادت کی اُٹھائی اس عابد ناداں نے عبرت عمر گنوائی

کیا فائدہ اعمال میں جب ہو نہ صفائی کیا زہد کو مانوں وہ نہ ہو گرچہ ریائی

پاداشِ عمل کی طبعِ خام بہت ہی

آزادہ روی شیوہ بتائے ہیں انسان سلوم نہیں سمجھے ہیں کیا جی میں نہ ناداں

آزاد تو ہو ہی نہیں سکتے کسی عنوان میں اہلِ خرد کس روشِ خاص پنازاں

پابستگی رسمِ ورہِ عام بہت ہی

پینے میں لگے باغِ گلِ فام کے دھبے ان سے غل آجائے نہ ارکانِ میراج کے

فرصت میں نہ راہِ چھ کے دھولان نہیں پہلے زعفران ہی پہ چھوٹو مجھے کیا طوفِ حرم سے

آلودہ بہ موحامہ احرام بہت ہی

تردید نہ کی اس کی کبھی میں نے کہا جو مجھ پر وہ عنایت کی نظر رکھتے ہیں سب تو

حیرت ہو یہ برتاؤ ہوا درِ وصل نہ پھر ہو ہی قہر گرا سبھی نے بنے بات کہ ان کو

انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہی

میں یہ نہیں کہتا مجھے مرنا نہیں اور مرگ بیج جاؤں تو کچھ حرج بھی تیرا نہیں اور مرگ

حاشا کہ مجھے جان کی پروا نہیں اور مرگ غل ہو کے جگر آکھ سے ٹپکا نہیں اور مرگ

رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہی  
 کیا دل کش و دھپسپ ہیں مزا کے ترانے      بخشی ہی عجب طبع رسا اُس کو خدا نے  
 مانا ہی اسے راہنما سب شعرا نے      ہو گا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے  
 شاعر تو وہ اچھا ہی پہ بدنام بہت ہی

(۱۳۳)

کیا کیجیے کہ دل ہی پریشاں کیے ہوئے      آئینہ دار ہی مجھے حیراں کیے ہوئے  
 ہو انتظار آمد جاناں کیے ہوئے      مدت ہوئی ہی بار کو مہماں کیے ہوئے  
 بوش قبح سے بزم چراغاں کیے ہوئے  
 دل کو تو چشم تر نے دیا اشکِ نگوں میں کھو      کیا خاک مجھ سے کوئی نیا انتظام ہو  
 کردوں گا پیش کش ہی حاضر ہو گھر میں جو      کرتا ہوں جمع پھر بگر نخت نخت کو  
 عرصہ ہوا ہی دعوتِ مرگاں کیے ہوئے  
 مدت کے بعد جوشِ جنوں نے کیا کرم      تاب سکون و صبر گئی دل سے یک قلم  
 وحشت کی لکڑی دکھام نہ اب کر سکیں گے ہم      پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہی دم  
 برسوں ہوئے ہیں چپک گریباں کیے ہوئے  
 سینے میں پھر وہ آگ بھڑکنے لگی کہ بس      پھر جل کے خاک ہو گا تن زار مثلِ خس

پھر ضبط آہ پر نہ رہا دل کو دسترس پھر گرم نا لہاے شریر بارہو نفس  
مذت ہوئی ناو سیر چراغاں کیے ہوئے

کیا پوچھتے ہو کیا ہو غضب ہو بلا ہے عشق سر سے ملے گا نہ اب تاں ٹلا ہو عشق  
دل کیا کہ اب تو در پئے جاں بر ملا ہو عشق پھر پریش جرات دل کو چلا ہو عشق  
سامان صد ہزار نکداں کیے ہوئے

پھر دل میں شوق دیدے ہو درد جاگل پھر شک خوں بھاؤں گا آنکھوں سے متصل  
دکھلاؤں گا وہ رنگ کہ مانی ہو متصل پھر بھر رہا ہوں خامہ مڑکاں بخون دل  
ساز چین طرازی داماں کیے ہوئے

پیش آ رہا ہو عشق میں اک واقعہ عجیب بیٹھے بٹھائے پھنس گئے آفت میں وغریب  
کیا دور ہو کہ دونوں میں پھر جانے عنقریب باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر قریب  
نظارہ و خیال کا ساں کیے ہوئے

وحشت میں بڑھ رہی ہو رسوا بیوں کی دُ ذلت کے محلے کو کیا چاہتا ہو طو  
کھل کھیلنے کے بتو تھامنے ہیں پڑ بہ پڑ پھر دل طواف کوئے ملا مت کو جلتے ہو

پندار کا صنم کن ویراں کیے ہوئے  
پھر ہو مرین عشق کو تیار کی طلب پھر اس دل غیب کو ہی غمخوار کی طلب

الفت کو پھر نہ گری بازار کی طلب      پھر شوق کر رہا ہوں سریدار کی طلب  
 عرض متاع عقل و دل و جاں کیئے ہوئے  
 ہونگے یسے گل کا جو پیش نظر خیال      گاشن میں جا کے مست ہو پھر سرسبز خیال  
 گلگشت میں جما ہوا ہو پھر اُدھر خیال      دوڑے ہو پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال  
 صد گلستاں نگاہ کا سا ماں کیئے ہوئے  
 سمرنامہ اس کے خط کا ہو اس رجب دل بیا      جس کے ہر ایک حرف پہ ہیں جان و دل فدا  
 مضمون شوق دیکھئے لاتا ہو رنگ کیا      پھر چاہتا ہوں نامہ و لہار کھولنا  
 جان نذر دل فریبی عنوان کیئے ہوئے  
 تسکین سیرِ باغ سے کیا ہوگی ہم نفس      بے یار ہیں نظر میں گل تر بھی خار خوش  
 بے چین ہو رہا ہوں کہ دل پر نہیں ہوں      مانگے ہو پھر کسی کو لبِ بام پر ہوں  
 زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے  
 بے وجہ تو نہیں ہوں میں آوارہ کو بکو      پھر تا ہوں تیغ زن کے تحس میں چارو  
 تیغ نگاہ کی ہو ان آنکھوں کو بستجو      چاہے ہو پھر کسی کو مقابل میں آرزو  
 سرمہ سے تیز دشنہ شکر کاں کیئے ہوئے  
 مرغوب چشم شوق نہیں روئے مہر و ماہ      اس گل کی برہم پیش کی دل ڈھونڈتا ہوا



کب سامنے ہو دیکھیے سانی کی جلوہ گاہ اک نو بہارِ ناز کوتاہ کے ہی پھر نگاہ

چہرہ فروغِ موسے گلستاں کیسے ہوئے

تا چند انتظار کا کوکھ جھیسکتے رہیں کب تک رہیں چارہ احباب کے رہیں

تا چند یوں جدا در و در سے رہیں پھر جی میں ہو کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں

سرنہ پیر بار منت دریاں کیسے ہوئے

طاقت نہ وہ خیال میں باقی نہ اب ہن وہ دن گئے کہ چین نہ پڑتا تھا یا رہن!

رہتے تھے اس کی یاد میں و دل مٹھان جی ڈھونڈتا ہو پھر وہی توصیف کا ان دن

بیٹھے رہیں تصویرِ جاناں کیسے ہوئے

کیا سہل بات تھی کہ یہ سیلاب رک سکے روکا یہ جوش جس نے وہ حرزا ہیں تو تھے

اب بھی ہیں اپنی آنکھوں میں رہا بھرے ہوئے غالب! ہیں نہ چھیر کہ پھر جوشِ اشک سے

بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفاں کیسے ہوئے

\*

(۱۲۳)

جھاسے یا رتسلی ہی اک جہاں کے لیے خبر خوشی کی ہی آزادی و اماں کیسے لے

ہوئی ہو وجہ تسلی دل تپاں کے لیے نوید امن ہی پیدا دوست جہاں کے لیے

رہے نہ طرزِ ستم کوئی اس جہاں کے لیے

غذائے غم تو دل بے قرار و محزون ہو جگر کی تاک میں وہ دیدہ پرافسوں ہو  
پڑی وہ لُٹ کہ حالت مری دگرگوں ہو بلا سے گر مژدہ یار تشنہ خوں ہو

رکھوں کچھ اپنی بھی مرگاہِ خو پچکاں کے لیے

خطا معاف یہ ہوا التماسِ خلقِ اے خضر تھیں نہیں ہو ذرا بھی تو پاسِ خلقِ اے خضر  
چھپے ہو تم پچھیں ہو ہر اسِ خلقِ اے خضر وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلقِ اے خضر

نہ تم کہ چورہٹے غمِ جاوداں کے لیے

یہاں تک مے دل میں تھی ہو کثرتِ رشک کہ بات بات ظاہر و اب علامتِ رشک  
کسی کو غیر کی راحت پہ ہوگی عادتِ رشک رہا بلا میں بھی میں مبتلا سے آفتِ رشک

بلا سے جاں ہوا داتیری اک جہاں کیلئے

یہ کشتی کہ جو قاتل سے اتان ہیں قریب انھیں کو اس سے جدا کر کہ ہو مجھے تسکین  
کبھی تو دُور سے ہو آزمائش ان کی کہیں فلکست دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں

دراز دستی قاتل کے امتحاں کے لیے

پڑا ہوا تو ہوں زنداں میں بستہ زنجیر قرینہ یہ تھا کہ کرتا نجات کی تدبیر  
مگر مجھے تو یہ دُھن ہو کہ گھر کوں تعمیر مثال یہ مری کوشش کی ہو کہ مرغِ اسیر

کرتے نفس میں فراہمِ خسِ اشیاء کے لیے

پڑا ہوا تھا میں ہونی اس آستان پہ رمائے اس آرزو میں کہ دربان کو ترس آجائے  
اسے بھی کوئی خصومت نہ تھی کہ مجھ کو اٹھائے گدا سمجھ کے وہ چپ تھامری جوشامت آئے  
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

سخن میں چاہیے کوئی جدید طرزِ عمل کہ طبع تیز کا کچھ حوصلہ تو جائے غل  
نہ کیوں ہو حد تغزل میں ہ کے جی بے گل بقدر شوق نہیں ظن تنگناے غزل  
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے

ملا ہی جو طرب و عیش اس کو قسمت سے بھلا وہ اس کے سوا ہی نصیب اور کسے  
مٹا دیا حد و رشک کو بھی قدرت نے دیا ہی خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے  
بنا ہی عیشِ تھل حسین خاں کے لیئے

یہ ذکرِ غیر مرے لب پر آگیا کس کا بھرا سرور سے دل اور جگر ہوا ٹھنڈا  
مجھے بیان پر اپنے ہی وجد کیوں اتنا نیاں پہ بار بندایا یہ کس کا نام آیا  
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

ای کی شان کے شایاں ہو شانِ شوکتِ ملک اسی کے واسطے موزوں ہی جاہ و شہرتِ ملک  
رہے ہمیشہ ہوں ہی برقرارِ ثروت و ملک نصیرِ دولتِ فردیں اور معینِ ملت و ملک  
بنا ہی چرخِ بریں جس کے آستان کے لیئے

ہر اک بشر کے لیے عیش کی ہو افزایش خدا کے فضل سے آیا ہو دور آسائش  
 نئے طریق سے ہر شے کی ہوگی زیبائش زمانہ عہد میں اس کے ہو جو آرائش  
 بنیں گے اور ستارے اپنی سماں کیلئے

دیکھی تو مچ کی تہید و استراہی ہو نہ مچ لکھی گئی ہو نہ میں نے لکھی ہو  
 ابھی کہاں مری طبع رسا نے بس کی ہو ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہو  
 سفینہ چاہیئے اس بحر بے کراں کے لیے

عجیب صنگ نکالا ہو مدح گوئی کا غزل سی شو میں دکھا یا ہو اس نے رنگ نیا  
 طبیعت اس کی ہو جذبات پسند از مرزا اداسے خاص سے غالب ہوا ہو نکتہ سرا  
 صلا سے عام ہو یا ران نکتہ واں کے لیے



(۱۳۵)

کم ہو غیروں سے اگر مہر و وفا اور سہی کوئی بہتا و مروت کا نیا اور سہی  
 میری ایذا سے جو دل خوش نہ ہو اور سہی میں ہوں مشتاق جفا چھ پہ جفا اور سہی  
 تم ہو بیاد سے خوش اس سے سوا اور سہی

رات دن گریہ ہو اور آٹھ پہر نالہ و آہ سوگ تم نے تو کچھ اس درجہ منایا کہ پناہ  
 مری جانے دو اگر مری گیا ہو گمراہ غیر کی مرگ کا غم کس لیے ای غیرت ماہ

ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی

کبر و نخوت کی مانے میں دہائی کیوں ہو      دل میں ناحق ہوس خام پکائی کیوں ہو  
خود نما کیوں ہو غودی سر میں سمائی کیوں ہو      تم ہو بہت پتھریں پندارِ خدائی کیوں ہو

تم خداوند سہی کس بلاؤ خدا اور سہی

یہ تو مانا کہ حسینوں کی نہیں کوئی کمی      آن بان ایسی کسی میں کبھی دیکھی نہ مٹنی  
منہ حسینانِ ارم آکے ملائیں تو سہی      حُسن میں آپ بڑھ کر نہیں ہونے کی کبھی

حور کا شیوہ اندازِ واد اور سہی

کیا قیام اور قعود اور تو سجدہ کیسا      سرمرا جھک نہیں سکتا تو بے در کے سوا  
ٹھا جو بے چین تو بہر پھر کے ادھر ہی پہونچا      تیرے کوچے کا ہو مالِ دل مضطر میرا

کعبہ اک اور سہی قبلہ نما اور سہی

کیا انوکھا چین حسلہ بریں ہو واعظ      باغ دیکھے ہی نہیں تو نے یقیں ہو واعظ  
تیری باتوں کا ٹھکانا بھی کہیں ہو واعظ      کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہو واعظ

خلد بھی باغ ہو خیر آب دہوا اور سہی

یاں تو دل کھول کے ارمان نکالیں یارب      تنگی دہر کی کچھ واد تو پالیں یارب  
سیر کا لطف تو جی بھر کے اٹھالیں یارب      کیوں نہ فردوس میں دوزخ بھی ملا لیں یارب

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

کر دیا ہو غم ہجراں نے مرا حال زبوں      بڑھتے بڑھتے خفان پہنچی ہو نوبت بہ جنوں  
دیر مرنے میں لگے گی جو کھلائی انبیوں      مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں

زہر کچھ اور سہی آبِ بہتا اور سہی

طبع دیوان سے جو غالب نے فراغت پائی      یار و احباب نے مرزا نئی آفت ڈھائی  
کی غزل نظم تو یوں لب پہ شکایت آئی      مجھ سے غالب یہ علای نے غزل لکھوائی  
ایک بیدار گر رنج فرزا اور سہی

(۱۳۷)

شکوہ درد بھی اک گو نہ خطا ہو تو سہی      نالہ و آہ سے اظہار جنا ہو تو سہی  
صبر میں اُفت بھی منافی رضا ہو تو سہی      آپ نے مسکنی الضحیٰ کہا ہو تو سہی  
یہ بھی یا حضرت ایوب گلا ہو تو سہی

ہمنشیوں کو ہو کیا میری مصیبت کی خبر      کرتے ہیں صبر کی تقلید مجھے آٹھ پہر  
دل ہی تو ہر مے سینے میں نہ کوئی پتھر      بچ طاقت سے سوا ہو تو نہ پیٹوں کیونکر

لے غزل نمبر ۱۳۵۔ دیوان مطبوعہ میں نہیں ہوا۔ دسے مسئلے احمد اول تو موسومہ نواب بن المین احمد خاں صاحب ہیں برج ہو ۱۲

ذہن میں خوبی تسلیم درضا ہو تو سہی

آس باقی ہو تو برسوں ہمیں بہلائے گی عمر  
سبز باغ آٹھ پہن کر میں دکھلائے گی عمر  
داد ملنے کے لیے گو پونہنی تڑپائے گی عمر  
ہر غنیمت کہ یہ اُمید گزر جائے گی عمر

نہ ملے داد مگر دوزخ بنا ہو تو سہی

کس کا چارہ فقط الزام سے ہتے ہیں بری  
کون اٹھاتا ہو رضوں کے لیے دوسری  
منہ نہ کھلواؤ کہ احباب کی ہو ہر وہ درسی  
دوست ہی کوئی نہیں ہو جو کرے چارہ گری

نہ سہی ایک متناسے دوا ہو تو سہی

ہم سے برتاؤ ہو جو کچھ اسی قابل ہم تھے  
کہئے بد عہد و جفا کا رُسے کس منہ سے  
بے مروت ہو وہ کیونکر کوئی انصاف کرے  
غیر سے دیکھیے کیا خوب نبا ہی اس نے

نہ سہی ہم سے پر اس بت میں وفا ہو تو سہی

گو کہ واقف نہیں تقدیر کے احوال سے ہیں  
خطِ قسمت نہیں پڑھ سکتا کسی حال سے ہیں  
یوں لگاتا ہوں پتہ اپنے ہی افعال سے ہیں  
نقل کرتا ہوں اُسے نامہ اعمال سے ہیں

کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہو تو سہی

جس طرح صبر سے ہر ڈانے گزار سی غالب  
زندگی کا ٹوا سی طرح سے تم بھی غالب  
جان دتے ہی کسی روز بنے گی غالب  
کبھی چل جائے گی کیوں کرتے ہو جلدی غالب

روح کلام غالب

۲۵۲

شہرہ تیزی شمشیر قصا ہو تو سہی

نوٹ: یہ غزل<sup>۱۳۶</sup> نواب احمد سعید خاں صاحبہ طالب رئیس دہلی کا عطیہ ہو فرماتے تھے کہ میں ہر وقت پھوپھا جان (غالب) کی خدمت میں حاضر باش تھا نیا کلام اپنی یادداشت میں لکھتا تھا اور مجلسہ یہ غزل ہو۔

## قطعہ تالیف تکمیل وراق ہوا

ظاہر ہوئے معانی حل ہو گئے مطالب  
بولا سروش غیبی روح کلام غالب  
۱۳

کی شرح نظم غالب تفہیم میں جو مرزا  
جی میں خیال آیا تا رخ اس کی لکھیے

تمام شد  
مطبوعہ نظامی پریس ہاپون  
(محمد اجدالدین پرنٹر)

LIBRARY

UNIVERSITY





# روح کلام غالب

غزلیات غالب  
ہم کی شعری تشریح

مصنف

مرتب و اشاعی

سید افتخار حسین زریں      غالب ثانی مرا عزیز بیگ ہمارا مزاج و مرام

شائع کنندہ: نشریات ادب ایکڈمی

بازار نمنا سہارن پور یو پی



# تعارف

غزالیاب کی تصانیف میں ان کے دیوان اردو کو ہر زمانہ میں ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے اور آج بھی مرزا کا درجہ سخنوری ہر طرح کی توصیف و تعارف سے بے نیاز ہے، یہی وجہ ہے کہ ۱۸۴۱ء سے اب تک مرزا کے دیوان کے لاتعداد اچھے اور برے، سادہ و مہرکار نسخے شائع ہوتے رہے ہیں، اور یہ سلسلہ یہیں پر بس نہیں ہو جاتا بلکہ شارحین و اہل قلم نے غالبیات کو ایک مخصوص ادبی موضوع بنالیا ہے۔ مختلف ادوار اور محققین نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کلام غالب کو نئے نئے انداز سے پیش کیا ہے اور آج کلام غالب پر گرانمایہ کتابیں وجود میں آگئی ہیں!

روز روشن کی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ کلام غالب پر جو کتابیں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں ان میں مولانا حالی کی ”مادگار غالب“ اور مولانا محمد حسین آزاد کی ”ابحیات“ کلام غالب کی قدر و منزلت کے عالیشان قصر کی سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں اسی سلسلہ کی ایک کڑی جناب مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا سہا پنپوری کی شاہکار کتاب ”روح کلام غالب“ بھی ہے۔

”روح کلام غالب“ کے فاضل مصنف نے اس کتاب میں غالب کی تمام غزلوں کی تفہیم کچھ اس انداز سے کی ہے جیسے غالب کے کلام کی روح کھینچ کر صغہ قرطاس پر منتشر کر دی ہو۔ یہ کتاب غالب کے کلام کی زبان شعری مکمل شرح ہے جس سے غالب کے اشعار کا مفہوم غالب کے ذہن میں کیا تھا بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا نے ۱۹۲۳ء میں یہ کتاب مکمل کر دی تھی لیکن جس طرح

مرزا غالب اپنی حیات میں خود اپنا دیوان شائع نہ کر سکے بالکل اسی طرح مرزا سہارن پوری بھی ”روح کلام غالب“ اپنی حیات میں زیور طبع سے آراستہ نہیں کر سکے بہر حال کتاب شائع ہونی تھی اور ہوئی مگر مرزا صاحب کی وفات کے بعد ۱۹۲۵ء میں ”روح کلام غالب“ زیور طبع سے آراستہ ہو کر کچھ ہی دنوں میں نایاب ہو گئی اور شائقین اس کے مطالعہ کیلئے تڑپتے رہے۔

اب جناب مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا مرحوم کے وارثان کی کرم فرمائی سے نشریات ادب اکیڈمی سہانپور کو اس نادر و نایاب شاہکار کو دوبارہ شائع کرنیکی سعادت نصیب ہوئی۔ ارباب اکیڈمی جناب مرزا حمید بیگ صاحب حمید اور جناب مرزا سلطان بیگ صاحب وارثان مرزا سہانپور کے انتہائی شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کے شائع کرنیکی اجازت مرحمت فرمائی۔

”روح کلام غالب“ میں کچھ دلچسپ اور ضروری حاشیوں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے وہ یہ کہ جن اشعار کی مرزا غالب نے خود تشریح کی ہے دسج کر دی گئی ہے اور اکثر مشکل اشعار کے مطالب بھی تحریر کر دیئے گئے اسکے علاوہ ایک ضمیمہ بھی شامل کیا گیا ہے جس میں مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا مرحوم کی وہ تفسیریں جو انھوں نے مولانا جامی، میر وحید مکنوی اور مفتی حبیب الدین سوزاں کے کلام پر کی ہیں اور غیر مطبوعہ بھی ہیں شائع کر دی گئی ہیں۔

میں ان ارباب ادب کا نہایت ممنون ہوں جن کی ادبی کاوشوں کے نتیجے ترتیب خواشی میں میرے زیر مطالعہ رہے ہیں ان میں جناب پرتھوی چند رمولف، مرقع غالب، کا نام نامی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

سید افتخار حسین زیدی

۱۵ جنوری ۱۹۶۸ء

## مقدمہ طبع دوم

(حکیم مشرف مظاہری سہارنپوری)

غالب کا یہ اپنا خیال نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ جسے آدمی بجائے خود اک عمر خیال اور اسی بنا پر وہ فطرت کو بھی انجمن سمجھتا اور بنا لیتا ہے لیکن کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی پہلو دار خصوصیات اور حیرت طراز فطرت کی بدولت بجائے خود ایک انجمن ہوتی ہیں۔ انھیں لوگوں میں غالب بھی ہیں جن کی نظم نما منشور اور گونا گوں کمالات میں محصور شخصیت فرد واحد کی نہیں بلکہ ایک وسیع ادارے اور قابضہ ایکٹیویٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسد اللہ خاں غالب کے اشعار الہامی قسم کے ہوں یا اہمالی۔ طرز بیان ہو یا تشبیہات و استعارات۔ فصائد ہوں یا خطوط۔ فلسفہ ہو یا تصوف۔ مذہبی مسائل ہوں یا اخلاقی قدریں سب میں انفرادی شانِ صحت مند حیرت۔ دل کش آن بان اور آزاد روی ہے اور بلاشبہ اردو شاعری و نثر نگاری کے طویل و عریض میدان میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ ————— عرفان غالب کے سلسلے میں مولانا حالی اور ان کے بعد اکثر قدما و اصحابِ علم نے بہت کچھ لکھا ہے مگر گزشتہ نصف صدی کے دوران جس تسلسل۔ قرینہ۔ محنت۔ علوم اور لگن کے ساتھ کام ہوا ہے وہ کافی حوصلہ افزا اور لائقِ مدحِ تحسین ہے۔ اور یہ اہم سلسلہ قاضی عبدالودود۔ مولانا اقبال علیٰ رحمٰنی۔ مولانا غلام رسول قہر ز آل احمد سرور۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔ خواجہ احمد فاروقی۔

مالک رام ایم اے۔ پروفیسر حمید احمد خاں۔ مولوی ہمیش پرشاد عبادت بریلوی۔  
 رشید احمد صدیقی۔ شوکت بزرگوری۔ ظا انصاری۔ پرتھوی چندر اور کوثر جہان پوری  
 وغیرہ حضرات کے طفیل جاری و ساری ہے۔ اس کا نتیجہ نہ صرف یہ کہ غالبؔ غالبیات  
 سے متعلق نہایت اہم سرمایہ معلومات جمع ہو گیا ہے بلکہ ضمناً شاعری۔ فلسفہ حیات  
 نفسیات انسانی اور فن تنقید کے تحت اردو ادب میں معتد بہ افادی مواد کا اضافہ  
 ہوا ہے اور ان دونوں امور کا ثمرہ تازہ اور مسرت آگس پہلو یہ ہے کہ اب دوسری  
 زبانوں اور دوسرے ممالک کے محققین و اہل قلم بھی مطالعہ غالب اور اردو ادب و  
 شاعری میں دل چسپی و انہماک سے حصہ لے رہے ہیں۔

**تضمین کلام غالب**۔ رباعی کی طرح تضمین بھی اپنے تقاضوں کے  
 لحاظ سے مشکل ترین صنف ہے خصوصاً کسی دوسرے شاعر کے کلام کو تضمین کرنا۔  
 کیوں کہ اس میں اصلی شعر کے اقدار کو برقرار ہی نہیں رکھنا پڑتا بلکہ کہیں ردیف اور  
 کہیں ردیف و قافیہ دونوں کا پابندی کرنا پڑتا ہے۔ یہ صنف کتنی مشکل ہے اس کا محکم  
 مقصود کلام کو نئے انداز سے نکھارا جاتا اور بیان کو زیادہ موثر بنانے کے لئے مزید  
 دلائل و تشبیہات سے وسعت دی جاتی ہے۔ یہ صنف کتنی مشکل ہے اس کا محکم  
 جواب اور قاطع ثبوت میر بہری فخر جی ایسے قادر الکلام و باصلاحیت شاعر اور  
 غالب کو تضمین کرنے کا بیڑا اٹھایا لیکن چند کام چلنے کے بعد ہی انھوں نے محسوس  
 کر لیا کہ اس کوہ کئی میں غم قدم قدم پر مرے نفس پر امتحان ہیں۔ نیز اس

تضمین کلام غالب کے لئے یہ موضوعات کام

عرصے میں انھوں نے جو کوشش کی تھی اس کے نتیجے پر جب ناقدانہ نظر ڈالی تو اس کو کسی درجے میں بھی اہم قرار نہ دے سکے اور خیال کیا کہ اگر فکر و تیشہ فرما دے کلام کو یہ جوئے شیر مکمل بھی کر لی تب بھی وہ شیریں کے حصول کا خامن کامیابی ذریعہ ثابت نہ ہو سکے گی۔ لہذا یہ سوچ کر کہ قمر مر دے از غیب بروں آید و کارے بکندہ“

اس معرکہ عظیم کو برسر کرنے کا خیال ترک کر دیا۔ اس نا کافی عزم اور شکستِ بہت کو ہم میر جرج کی باصلاحیت شخصیت کی نقیص پر دال نہیں سمجھے کیونکہ بلاشبہ وہ اس کلام کے اہل بھی تھے۔ ان کا ارادہ نیک بھی تھا اور کلام غالب کی شرح کے لئے ان کی نگاہ انتخاب نے موزوں ترین راہ بھی اختیار کی تھی مگر قدرت اس کارنامے کا سہرا کسی اور ہی کیلئے مقدر کر چکی تھی اس لئے میر جرج کا خواب شرمندہ تعمیر نہ ہو سکا۔

**روح کلام غالب** :- میر جرج کے بعد غالب کے وسیع حلقہ شاگردان میں نہ جانے کتنے اصحاب کے دلوں میں اس آرزو نے طوفان بپا کیا ہو گا مگر یہ قرۃِ فال غالب کے پوتا شاگرد مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا سہارنپوری (تلمیذ حضرت سوزاں) کے نام نکل چکا تھا اور حق یہ ہے کہ انھوں نے بصورتِ احسن یہ حق ادا کیا۔ کلام غالب کی تشریح و توضیح میں غالب کے توانا طرزِ فکر اور حسن ادا کو ایک چابکدست مصور اور دقیقہ رس فنکار کی حیثیت سے مزید دلاؤ و نیری و نگینی عطا کی اور ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جس کی اردو، فارسی اور ہندی شاعری کی طویل تاریخ اب تک نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے اور جس پر اردو شاعری اور غالب نواز حلقہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔



رکھیں غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف، جس وسیع پیمانے پر اور بالغ نظری سے غالب و غالبیات پر اہل قلم حق تنقید و تحقیق ادا کر رہے ہیں اور غالب سے متعلق معمولی سے معمولی واقعے کو منظر عام پر لا رہے ہیں اس اعتبار سے یہ امر انتہائی حیرت زار اور باعث افسوس ہے کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم کی ”روح کلام غالب“ کو بجائے اسکے کہ اسکی کا حق قدر افزائی ہوتی اس کے ساتھ بے اعتنائی و بے نیازی کا وہ مظاہرہ کیا گیا ہے کہ غالبیات کا مطالعہ کرنے والے طبقے میں چند فیصد بھی اس سے واقف نہیں اور اس بے رحمانہ عدم التفات کے طفیل یہ پیکر خوبی ج

آفتاب لیکن اثر سحر نازد

حرف آخر۔ نظامی صاحب کے مقدمے میں آپ میر محمد روح اور رضا ”روح کلام غالب“ کی تقسیموں کا موازنہ ملاحظہ فرمائیں گے اسلئے میں اس سے صرف نظر کر کے اس سلسلے کی سب اہم کڑی اور تقسیم کا ایک نایاب نمونہ پیش کرتا ہوں۔ یہ تقسیم مرزا غالب نے شاہ ظفر کی غزل پر کی ہے جو ۱۸۵۷ء اپریل ۱۸ء کے ”اردو اخبار دہلی“ میں شائع ہوئی تھی اس تقسیم سے بخوبی واضح ہو جائیگا کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم کی تمام تقسیموں کا معیار و وزن کیا ہے؟ اور کیا ”روح کلام غالب“ اردو ادب میں مقام رفیع پانے کی مستحق نہیں؟ اور کیا یہ تصنیف نادرہ ماضی کی طرح اب بھی گمنامی و بے اعتنائی کی نذر ہو جائے گی۔

## غزلِ ظفرِ تضمینِ غالبؔ

گھستے گھستے پاؤں میں زنجیرِ ادھی رہ گئی      مرگے پر قبر کی تعمیرِ ادھی رہ گئی  
سب ہی پڑھنا کاش کیوں بکیرِ ادھی رہ گئی      کھینکے قاتل جب تری شمشیرِ ادھی رہ گئی  
غم سے جانِ عاشق دگرِ ادھی رہ گئی

بیٹھ رہتا ایسے چشمِ پرِ غم اس کے روبرو      کیوں کہا تو نے کہ کہہ کا غم اس کے روبرو  
بات کرنے میں نکلتا ہے دم اس کے روبرو      کہہ سکے ساری حقیقت ہم نہ اس کے روبرو  
ہم نشیں ادھی ہوئی تقریرِ ادھی رہ گئی

تو نے دیکھا مچھپے کیسی بن گئی اے رازدار      خوابِ بیلاری پر کب ہو ادھی کو اختیار  
مثلِ زخمِ آنکھوں کو سی دیتا جو ہوتا ہوشیار      کھینچتا تھا رات کو میں خواب میں تصویرِ یار  
جاگ اٹھا جو کھینچنی تصویرِ ادھی رہ گئی

غمنے جب گھیرا تو جاہا بننے یوں دلنواز      مستی چشم سیرہ چل کے ہوئیں چارہ ساز  
تو صدائے پاس جاگتا تھا جو نحو خواب ناز      دیکھتے ہی اے سنگت تیری چشم نیم باز  
کی تھی پوری ہم نے جو تندریدھی رہ گئی

اس بت مغرور کو کیا ہو کسی پر التفات      جسکے حسن روز افزون کی لکڑی دنے ہر بات  
ماہِ نوکلے پر گزری ہونگی راتیں پان سات      اس رخِ روشن کے آگے ماہِ یک سہستہ کی رات  
تابشِ خورشید پر تنویرِ ادھی رہ گئی

تا بچ بچاے کاش بخت بے بگھات میں      ہاں فراوانی اگر کچھ ہو تو ہے آفات میں  
جرمِ وِج وِلم گھاٹے ہر اک بات میں      کم نصیبی اسکو کہتے ہیں کہیے بات میں  
آتے ہی خاصیت اکسیرِ ادھی رہ گئی

سب بیگو شہ کنڈے ہر گلے لگ جاوے      آدمی کو کیوں پکائے ہر گلے لگ جاوے  
کسے گر چادر اتارے ہر گلے لگ جاوے      مانگ کیا بیٹھا سنوئے ہر گلے لگ جاوے  
وصل کی شب لے بت بے پیرِ ادھی رہ گئی

میں یہ کیا جانوں کہ وہ کس واسطے ہوں پھر گئے      پر نصیب اپنا انھیں جانا سنا ہوں پھر گئے  
 دیکھنا قسمت وہ آئے اور پھر یوں پھر گئے      آگے آدمی دور میرے گھر سے وہ کیوں پھر گئے  
 کیا کشش میں دکی اب تصویر آدمی رہ گئی

ناگہاں یاد آگئی ہر جھکویا رب کب کی بات      کچھ نہیں کہتا کسی دین ہا ہوں سبکی بات  
 کسلے تجھ کو چپاؤں ہا وہ پر سوشکی بات      نامہ بر جلدی میں تیری وہ جوتی مطلب کی بات  
 خط میں آدمی ہو کی تحریر آدمی رہ گئی

ہو تجلی برق کی صورت میں ہر مہر بھی غضب      ہاں کچھ گھنٹے کی ہوتی فرصت عیش و طرب  
 شام سوائے تو کیا اچھی گزرتی رات سب      پاس میرے وہ جو آئے بھی تو بعد از نصف شب  
 نکلی آدمی حسرت لے تقدیر آدمی رہ گئی

تم جو فوٹے ہو دیکھ لے غالب آشفتمہ سر      ہم نہ جھکوں گے کرتے تھو گی کیوں اسکے گھر؟  
 جان کی پاؤں ماں باتیں سپہ ہیں مگر      دل نے کی ساری خرابی لیگیا مجھ کو ظفر  
 واں کے جانے میں مری تو قیر آدمی رہ گئی

محبِ مکرم جناب سید افتخار حسین صاحب زیدی ناظم نشریات  
 ادب اکیڈمی اور سید عزیز حسن نسیم مدیر دیر و حرم سہارنپور لائقِ صد  
 مبارکباد ہیں کہ اس دورِ ابتلا و گمراہی میں روحِ کلام غالب کو حیاتِ  
 نو سے بہرور کرنے اور علمِ دوست اصحاب تک پہنچانے کے نیک  
 جذبے سے اس کی طبعِ دوم کے لئے کمر بستہ باندھی۔ ع  
 ”خدا نصیب کرے انکو عشرتِ منزل“  
 آمین

## مقدمہ

(از مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی بدایونی)

میرے دوست مرزا محمد ظفر بیگ صاحب جی کے حسن سعی سے ”روح کلام غالب“ طبع ہو کر آج شائقین کے پیش نظر ہے۔ مجھ سے مصر ہوئے کریں اس کا مقدمہ کمبوں غالباً ان کا یہ اصرار اس بنا پر تھا کہ مجھے کلام غالب سے دلی لگاؤ رہا ہے اور اس کے فدائی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ میری گونا گوں مصروفیتیں کچھ عرصہ تک مرزا صاحب کی تعمیل ارشاد میں مانع رہیں۔ جب تقاضا صبر سے بڑھا تو کچھ وقت اس کے لئے بھی نکالا۔ میں نے اس مقدمہ میں اختصار کو مد نظر رکھا ہے تاکہ ناظرین آسانی سے اس کے مطالعہ کے لئے وقت دے سکیں ورنہ کلام غالب کا موضوع اسی قدر دل چسپ اور وسیع ہے کہ اس پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ غالب غزل کا بادشاہ تھا اس نے اس صنف سخن کی مابہیت کو خوب سمجھا ہے۔ غزل کی تعریف مختصراً یہ ہے کہ اس میں جتنے مضامین ہوں وہ داخل ہوں اور ان کا درجہ اس قدر بلند ہو کہ ان سے انسان کی فطرت اور اس کی عظمت ہو پیدا ہو سکے اور اس کی وسعت اور اک کا پتہ چل سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ جہلاً صناف سخن میں غزل گوئی جتنی آسان ہے اتنی ہی دشوار ہے اگر غزل غزل ہو تو اس کو بوستان نظم کا ایسا قطعہ کہنا چاہیے جسکی روشنی سے غلاب معبود جنگ مرزا صاحب بی۔ اے آکسن کی تحریک سے سب سے پہلے ۱۹۱۵ء میں میں نے اردو دیوان غالب معری اشارات املانی کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے (باقی آئندہ)

غیر مسلسل اور نامرابط ہونے کے باوجود بے حد دل کش اور روح افزا ہیں۔ جس طرح آسمان پر چمکنے والے تاروں کی بے ترتیبی ان کی خزاں فریبوں کو جلا دے دیتی ہے اسی طرح ایک بہترین غزل کے منتشر شعرا اس کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں اور بایں ہمہ نامرابطی طبعی ”گل جلد پیدا لکڑیڈ“ کا مصداق بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سر شعر نئی تخیل کا حامل ہوتا ہے اور ہر تخیل میں نئی نکتہ آفرینیاں ہوتی ہیں۔ کہیں فلسفہ اخلاف و تصوف کے گاماگوں رموز عالم حیرت استعجاب طاری کر دے ہیں تو کہیں جذبات حسن و محبت کی بولبولی مسحور و بے خود بنا دیتی ہے۔ غالب کے دیوان کو شروع سے آخر تک بڑھ جائے اس کا ایک ایک شعر اس معیار پر پورا اترے گا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ غالب کا کلام جب پڑھئے سنا لطف آتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کے کام میں اکثر اشعار نثری طلب ہیں۔ اسی لئے اس کی متعدد و شہرہ لکھی گئیں جن میں طرح طرح کی مونسگافیاں کی گئی ہیں یہ بحث ہمارے موضوع سخن سے خارج ہے کہ یہ نثر و جواہری اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ثابت ہوئے لیکن یہ امر مسلم ہے کہ غالب کے سوا زبان اردو کے کسی اور شاعر کے کلام کو یہ شہرت اور اہمیت اب تک نصیب نہیں ہوئی۔ اور نہ صرف اس لحاظ سے بلکہ دیگر خصوصیات شعری کی بنا پر آج ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہم دنیا کی دیگر مشہور زبانوں کے نامور اور عالمگیر شہرت رکھنے والے شعرا کے مد مقابل غالب کو پیش کر سکتے ہیں چنانچہ گزشتہ بہت سال زمانہ میں اس کے کلام کی خوبیوں کو جس بلند آہستگی کے ساتھ سراہا گیا ہے اور اس کی مدحت طرزی کی گئی ہے اس کے ثبوت کے لئے

گزشتہ سے پیوستہ، شائع کیا اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں سلسلہ آصفیہ کی پہلی کڑی کے طور پر شروع ایڈیشن شائع ہوا۔ میری یہ شرح تعلیم یافتہ طبقہ میں اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے پانچ ایڈیشن اس وقت تک نکل چکے ہیں۔ (نظامی)

ان ضخیم خرمنوں کے علاوہ ملک کے نامور مصور چغتائی کا دیدہ زیب ”مرقع“ اور دیگر قسم قسم کے خوبصورت اور نظر فریب ایڈیشن موجود ہیں۔

کلام غالب کی قدر و منزلت کی یہ عالی شان عمارت جس کا سنگ بنیاد مولانا حالی مرحوم نے انیسویں صدی کے آخر میں ”یادگار غالب“ لکھ کر رکھا تھا آج ”روح کلام غالب“ کی اشاعت سے پایہ تکمیل کو پہنچ رہی ہے کسی شاعر کے ۱۰۰ بات کچھ کم قابل فخر نہیں کہ دیگر شعراء اس کی دوچار چیدہ ۲۰۰۰ کے اسعار پر مصرعہ رئیس اور ان کی تضمین کر کے اپنے کلام میں شامل کر لیں لیکن اردو کیا فارسی میں بھی کوئی شہرہ نامہ شاعر غالباً ایسا نہیں ہوا جس کے پورے دیوان کی تضمین کی گئی ہو۔ کلام غالب کی قدر افزائی میں یہ ہی ایک کمی تھی جس کو ”روح کلام غالب“ (جو غالب کی تمام غزلوں کی تضمین ہے) بدرجہ اتم پورا کرے گی اور اس لحاظ سے غالب کے توصیفی لٹریچر میں اس کو ایک قابل قدر اور شاندار ادبی اضافہ شمار کیا جانا چاہیے۔

اردو ادب میں تضمین کا رواج دراصل فارسی کا اتباع ہے اردو میں فارسی غزلوں کی بھی تضمین کی جاتی ہے اکثر شعراء خود اپنی غزل کی بھی تضمین کرتے ہیں۔ یہ تضمین دو قسم کی ہوتی ہے مثلث اور مخمس۔ مثلث میں اول مصرعہ تضمین کا ہوتا ہے اور دو مصرعہ اصل نزل کے جس کی تضمین کی جائے۔ مخمس یا پنج مصرعوں سے مراد ہے جس میں تین مصرعہ تضمین کے ہوتے ہیں اور دو اصل نزل کے۔ اب زیادہ تر مخمس کا رواج ہے۔ مرزا عزیز بیگ مرحوم مصنف (روح کلام غالب) نے بھی مخمس ہی کو پسند کیا ہے یعنی غالب کے قصائد وغیرہ چھوڑ کر ہر غزل کے اشعار پر تین مصرعہ اپنے چسپاں کئے ہیں۔

تضمین کی صرف یہ ہی خوبی نہیں کہ اس کے مصرعے اصل مصرعوں سے دست



گوریاں ہو جائیں بلکہ ان سے اصل شعر کے معانی اور مطالب کو خواہ وہ کتنے ہی دقیق اور  
لائیل ہوں اس لطافت کے ساتھ نمایاں کر دیا جائے کہ پوری تفصیل ایک ہی دل و دماغ  
کی شاعرانہ کاوشوں کا نتیجہ معلوم ہو۔ روح کلام غالب میں یہ تمام محاسن پوری طور پر نظر  
آتے ہیں لیکن چونکہ اول سے آخر تک ہر غزل کی تفصیل کی گئی ہے اس لئے اگر کہیں کہیں  
یکساں روز قلم نسبتاً نہ پایا جائے تو انشاؤں کا لمعہ درم کی بنا پر نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔  
واقعہ یہ ہے کہ مصنف نے پورے دیوان کی تفصیل کرنے میں اپنی پوری قوت شاعرانہ

صرف کر کے کلام غالب کی حرا ب کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ اس کی ادنیٰ خصوصیت یہ ہے کہ  
مشکل ترین اشعار کے معانی اور مطالب اس درجہ واضح ہو جاتے ہیں کہ کسی شرح کو دیکھنے  
کی ضرورت باقی نہیں رہتی اس لحاظ سے روح کلام غالب کو دیوان غالب کی تمام شرحوں  
پر فوقیت حاصل ہے اور اس کا اندازہ صرف اتنی بات سے ہو سکتا ہے کہ غالب کے جن  
مشکل اشعار کی شرح میں دیگر شارحین نے نثر میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے ہیں ان کو  
مصنف روح کلام غالب نے نظم کے صرف تین مصرعوں میں اس فصاحت و بلاغت  
کے ساتھ لکھا دیا ہے کہ ہم اس کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور  
بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہے۔ ع

### آفتاب آمد دلیل آفتاب

غالب اس کی تہ جیہ یہ ہو سکتی ہے کہ غالب اور مرزا صاحب مرحوم دونوں فطری  
شاعر تھے۔ مرزا مرحوم خود بھی ایک درد مند دل رکھنے والے اور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے  
غالب کی سیرت اور ماحول کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ جو درد غالب کے کلام میں  
ہے اسی کی کسک مرزا کی طبیعت میں بھی موجود تھی خواہ حافظ نے خوب فرمایا ہے کہ

نال بلبل اگر بامنت سریرا رست      کہ مادو عاشق زاریم و کاہما زار رست  
جب دو در در سیدہ چوٹ کھائے ہوئے دل ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک  
دوسرے کو اپنی داستانِ غم سناتے تو سننے والوں پر ایک کیفیت کا عالم طاری ہوتا ہے  
یہی حالت اس تضمین کے مطالعہ سے ناظرین کے دلوں پیدا ہوتی ہے فرماتے ہیں :-

ذرا اس بے زباں دل کی صدا سن      کچھ اپنی قدر دانی کا گلشن  
یہ لعلِ بے بہا کہتا ہے کیا سن      سن اے غارت گر جنس و فائن  
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

اس اپی آرزو پر مر مٹا ہوں      کہ نصب العینِ چشمِ سرمہ سا ہوں  
ہم تن شوقِ نظارہ ہوا ہوں      لگاؤ بے محابا چاہتا ہوں  
تعا فلہائے تمکیں آزما کیا

ترا خیال و تصور جو دل کو ہے محبوب      اسی سے نامر نویسی کا شغل ہے مرغوب  
مجھے امیدِ کرم اور تجھ سے ہو کیا خوب      رہتا ہوں کہ تو اور یا سخن مکتوب  
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامِ فرس کا

کیا خوب شرح کی ہے

جنوں مانع ہو استاد کا احسانِ ٹھانے سے      فراغت پا چکا روزِ ازل پڑھنے پڑھانے سے  
رہا انکارِ عقل کل کو غیر لا بتانے سے      فنا تعلیمِ درسِ بین خودی ہوں اس زمانے سے  
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ بستان پر

ایک مقطع کی تضمین ملاحظہ ہو جس میں غالب نے بوڑھاپے کا رونا روایا ہے

کچے مرزا کا حال کیا غالب      بے طرح ضعف ہو گیا غالب  
ہے یہ پیری بھی کیا بلا غالب      مضمحل ہو گئے قوی غالب

وہ عناصر میں امتدال کہاں

غالب کے ایک شعر کی جس میں نوحید کا فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھر ہے نصیب کے  
تین مصرعوں میں ایسی شرح کی گئی ہے جس سے شاعر کا مافی الصمیم صاف سمجھ میں آ جاتا ہے  
لکھتے ہیں ۱۔

ہیں موصوفہ بخدا شرک ہر دل سے مفقود      ہم معبود ہیں نہ کعبے کے نہ کعبہ معبود  
رو بہ قبلہ میں تو صرف ایک جہب ہم مقصود      ہے پرے سرحد ادا کرتے اپنا مسجود  
قبلہ کو اہل نظر قبلہ مانتے ہیں

غالب نے ایک شعر میں معشوق کے وصال کا ذکر کر کے عاشق کی خوش نصیبی  
انوکھے طرز سے ثابت کی ہے جس میں زلفوں کی پریشانی کو شب وصال میں لطف  
کا سبب ظاہر کیا ہے اور اسی طرح رات کی اور زلفوں کی سیاہی کی مناسبت فروغ  
گئی ہے نصیب نگار نے اس میں چار فائدہ لگا دیئے ہیں کہتے ہیں۔

ہم میں جو ہمیشہ تیرا راتیں اسکی ہیں      صبح نظارہ میں کر دیتا ہے راتیں اسکی ہیں  
اس کو بھی وہ خوش نصیب ہے راتیں اسکی ہیں      نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہوا راتیں اسکی ہیں  
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشانی ہو گئیں

ایک شرح طلب شعر کی منظوم ترجمہ ذیل کی نصیب میں ملاحظہ ہو۔

ہنسی یاروں نے کیا کی اک نصیب مجھ کو فرمائی      نہ اب ہوش و حشر ہر طرف ناگھیبائی  
سکوں سا ہو گیا دل کو گیا سامان رسوائی      نکو ہوش مانع بے ربطی شور جنوں آئی

ہوا ہے خندہ اجاب بخیر و دامن میں

جب غالب دہلی سے کھنڈ کے سفر کے لئے اس امید پر نکلے کہ نواب اودھ کی بارگاہ سے کچھ امداد لے کر بخت اشرف اور حرم محترم کی زیارت سے بہرہ اندوز ہوں گے تو راستہ میں ایک غزل لکھ کر ان جذبات کا اظہار کیا اس غزل کے دو شعروں کی تضمین قابل ملاحظہ ہے کس خوبی سے واقعات کی تصویر کھینچی ہے۔

سقل حیران ہے کس وجہ سے چوڑی دہلی کچھ تو ہے جس لئے طے کی ہے مسافت اتنی  
یک ہیک چوڑی کیوں لغت راحت کھر کی نکھو آئے کا باعث نہیں کھلا یعنی

ہو بس بیروت تانتا سودہ کم ہے ہم کو

جب چلے گھر سے تو تھی دلی میں بہاؤ تو ہی ہر بیٹھ رہنا ہیں اور ترک سفر ہے اک قہر  
قصد ہے دور کا مانع عمر نہ ہو گردش دہر مقطع سنسائے شوق نہیں ہے ہر شہر

عزم سیر بخت و طوف حرم ہے ہم کو

غالب نے اکثر موقعوں پر اپنے دقیق مطالب کی طرف اشارہ کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں عوام اس کو نہیں سمجھتے اور ایران کی فہم کا تصور ہے۔ اس منسوب کے ایک شعری تضمین ملاحظہ ہو۔ کیا خوب کہا ہے۔

میری غمنوری پر عبث قیل وقال ہے مطلب کو میرے پائے کوئی کیا مجال ہے  
کہتا ہوں سب کچھ اور زباں میری لال ہے گر خامشی سے فائدہ اٹھائے حال ہے

خوش ہوں کہ میری بات سمجھی مجال ہے

غالب کے دیوان میں جہاں مشکل اشعار ہیں وہاں ایسے بھی شعر ہیں جو سہل متنوع کا حکم رکھتے ہیں ایسی غزل کے ایک شعری نظمیں نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو جس میں

تقصیم کی زبان بھی مرزا غالب کی زبان سے مل گئی ہے۔

ملاو آہ میں دھرا کیا ہے حاصلِ گریہ و بکا کیا ہے  
اس ترپنے سے مدعا کیا ہے دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درو کی دوا کیا ہے

سطور بالا میں تقریباً غالب کے ہر قسم کے اشعار کی تقصیم کے نمونے پیش کر دیئے  
ہیں تاکہ ناظرین ”روحِ کلامِ غالب“ کی خوبوں کا صحیح طور پر اندازہ کر سکیں اور ان کو معلوم  
ہو سکے کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم نے غزل کے تنگ میدان کو محض بنا کر وسعت دینے میں  
کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے اور غالب کی اس آرزو کو کہ ان کے بیاں کی وسعت  
کے لئے تنگنائے غزل سے زیادہ وسیع میدان درکار ہے کس حد تک پورا کیا غالب کے  
اسی مضمون کے شعر کی تقصیم میں نہایت موزوں اسلوب اختیار کیا ہے فرماتے ہیں :-  
سخن میں چاہیئے کوئی جدید طرزِ عمل کہ طبع تیز کا کچھ حوصلہ تو طبعِ نکل  
نہ کیوں ہو جد غزل میں رہے جی بیکل بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل  
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

مرزا مرحوم کی تقصیم کے متعلق اس قدر لکھنے کے بعد ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ دوسرے  
شاعروں نے جو غالب کی بعض غزلوں کے حصے کئے ہیں ان کے مقابلہ میں مرزا مرحوم کی  
تقصیم کا کیا درجہ ہے مثال کے طور پر میر تقی میر جبرج دہلوی کے حصوں کو جو غالب  
کے ارشد تلامذہ میں سے تھے مرزا مرحوم کے حصوں کے بالمقابل درج کرتے ہیں۔ مبصر اور  
ناقدا ان کو پڑھ کر خود رائے قائم کریں :-

## مرزا

یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا  
 کم مرض ہی مگر ذرا نہ ہوا  
 مجھ پر احساں طیب کا نہ ہوا  
 درد منت کشش دوا نہ ہوا  
 میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا  
 ہو گے رسوا تمھیں کہا مانو  
 بات بڑھ جائے گی بہت یوں تو  
 چل کے سن لو الگ جو سنتے ہو  
 جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو  
 اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا  
 اور تجھ ساحس کہاں سے لائیں  
 حسرت دل کی داد کس سے پائیں  
 کس کے ہاتھوں کو نیم دل پر کھائیں  
 ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں  
 تو ہی جب خیر آزمائے نہ ہوا  
 سخن تلخ کب ہے ان کے قریب  
 ان سے باتیں سننے یہ کس نصیب  
 ہے حلاوت ہی کچھ سخن میں عیب

## بحرِ جوح

کام نخواست سے کچھ روانہ ہوا  
 دیر حاجت کسی پہ وا نہ ہوا  
 کیا حقیقت کہوں کہ کیا نہ ہوا  
 درد منت کشش دوا نہ ہوا  
 میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہو  
 دے نہ راحم ان حبیبوں کو  
 کہ جلائیں نہ بد نصیبوں کو  
 رنج دیتے ہو ہم غریبوں کو  
 جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو  
 اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا  
 کیوں عبت جا کے ایسا سر ٹکرائیں  
 ناحق احسان کیوں کسی کا اٹھائیں  
 اس سے جب آرزوئے دل ہی نہ پائیں  
 ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں  
 تو ہی جب خیر آزمائے نہ ہوا  
 رکھنا لذت جو ہے دہان جیب  
 شہر مہری کو وہ کہاں ہے نصیب  
 کیا کہوں بات ہے عجیب غریب

## بحرِ حُج

کتنے شیریں ہیں تیرے لبِ کر قیب  
گالیاں کھا کے بے مزانہ ہوا  
ظہر کی قسمت آزمائے کی  
یعنی اس شوخ کو بٹائے کی  
یہ سنو بات دل حلائے کی  
ہے خبر گرم ان کے آنے کی  
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا  
جب سے عقل و تمیز آئی تھی  
تیرے ہی در پہ جہ سائی تھی  
دم بدم عاجزی فستائی تھی  
کیا وہ غمزدگی خدا کی تھی  
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا  
اس کی بخشش نے کی ذرا نہ کی  
کچھ تلافی پہ ہم سے ہونہ سکی  
کیا بڑی بات ہم نے کی ابھی  
جان دی دی ہوئی اسی کی تھی  
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا  
ان کے جب بحرِ فکر بہتے ہیں

## مزرا

کتنے شیریں ہیں تیرے لبِ کر قیب  
گالیاں کھا کے بے مزاد ہوا  
جب ہیں دم تھی ان کے لائے کی  
استطاعت تھی گھر سب لائے کی  
اب جو بدلی ہوا زمانے کی  
ہے خبر گرم ان کے آنے کی  
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا  
جان طاعت ہی میں کھپائی تھی  
کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی  
سرتقا سجدہ تھا جد سائی تھی  
کیا وہ غمزدگی خدا کی تھی  
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا  
قابلِ فخر کیا ہے بات اپنی  
عین احساں ہے اس کی خوشنودی  
ہم نے اس پر نثار کیا شے کی  
جان دی دی ہوئی اسی کی تھی  
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا  
مثلِ مزرا مصر وہ رہتے ہیں

## مُجْرُوح

ہم تو مجروح غرق رہتے ہیں  
آپ کیوں طعن خیز رہتے ہیں  
کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں  
آج عتاب غزل سرا نہ ہوا

## ایضاً

لا تقنطو نوید ہے ام اکتاب میں  
تراہد گماہ خلق میں وہاں کس حساب میں  
ہے عرض یہ جناب تقدس مآب میں  
کل کے لئے کہ آج رخت خراب میں  
یہ سوہن ہے ساقی کوثر کے باب میں  
گوارہ لئے دید میں بے قرار ہوں  
ہرگز وہ یاں نہ آئیں گے میں کو طلب کرو  
پر کچھ تو شغل چاہئے میرا کہیں نہ ہوں  
قاصر کے لئے آتے خط اک اور کہہ رکھوں  
میں جانتا ہوں جو وہ کہیں گے جواب میں  
شادی و غم کو عشق میں اک ارضیات ہے

## مرزا

جی میں گھٹ گھٹ کے پھوٹ پھتے ہیں  
سب غم انتظار رہتے ہیں  
کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں  
آج عتاب غزل سرا نہ ہوا

## ایضاً

جام سو کو رکھ نہ بچا کر حساب میں  
شامل نہ کر صہوچی کو شرب حساب میں  
وہاں کچھ کی نہیں کہ ہو تو ہر طرب میں  
کل کے لئے کہ آج رخت خراب میں  
یہ سوہن ہے ساقی کوثر کے باب میں  
لکھ تو دیا اہیں کہ مرا حال ہے زبوں  
ہے ان سے آرزوئے تسلی نرا جنوں  
آگاہ انہی عادت خصمت کو خوب ہوں  
قاصر کے لئے آتے خط اک اور کہہ رکھوں  
میں جانتا ہوں جو وہ کہیں گے جواب میں  
وہ آج میرے گھر چلے آئے مست سے

اے ارنیٹا کی طوالت سے بدل کر اس کو مستہ واردات اوسبات کا نام قافیہ کرنا مرزا کی غلطی ہے  
معلوم نہیں یہ غلطی کہاں سے شروع ہوئی ہے۔



## مخروج

اس میں کبھی حیات ہے گا ہے ممات ہے  
 ہے طرفہ حال اور نئی واردات ہے  
 میں اور خط و صل خدا ساز بات ہے  
 جان نذر دینی بھول گیا اضطراب  
 حکم خدا میں گو لب و جون و چرا ہے بند  
 مالک ہے وہ حقیر کرے خیراہ سر بلند  
 پردہ دل تو اس خیال سے رہنہ ہو فکر مند  
 ہیں آج کیوں ذلیل کو کل تک نہ تھی پسند  
 گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں  
 ہمدرد! قہر نے بتِ خازنِ خراب کے  
 اوسان کھو دیئے دل بے مروت اب کے  
 آثار ہم سمجھ گئے ان کے عتاب کے  
 ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے  
 ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں  
 اہل نظر سمجھتے ہیں عالم کا کیا وجود  
 ہے اس کی ذات پاک سے ہر چیز کی نمود  
 ہولیک کو نہیں خبرِ نیستی و ہود  
 ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

## مرا

شکر خدا کہ ہو گئے قہقہے تمام طے  
 جاتے ہوئے وصال کا وعدہ بھی کر گئے  
 میں اور خط و صل خدا ساز بات ہے  
 جان نذر دینی بھول گیا اضطراب میں  
 یا تو ملائکہ سے بھی تھا مرتبہ بلند  
 ہم سا نہیں ہے یا کوئی اب خوار و مستمند  
 پہونچا رہا ہے ہر متنفس ہمیں گزند  
 ہیں آج کیوں ذلیل کو کل تک نہ تھی پسند  
 گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں  
 بے پردہ کچھ اثر ہیں نمایاں عتاب کے  
 لیکن ہیں چپ خیال سے شرم و حجاب کے  
 آثار بات بات میں ہیں بچ و تاب کے  
 ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے  
 ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں  
 اشیاء کی ہے تصویر انبیاء سے سب نمود  
 دیکھا جو غور سے تو خیالی میں ربِّ جود  
 ہستی کے واہنے کی بدولت ہر دست و پد  
 ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

## مجنوح

میں خواب میں ہنوز جو جاگتیں خواب میں  
میں لکھ جاں سے اپنی خدا اس پہ ہوں مگر  
میری لذتوں سے خوشی ہے وہ فتنہ گر  
ہے بار میرا دشمن آرام کس قدر  
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر  
آئے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں  
رکھتے ہیں گونہاں وہ جمال نظاہ سوز  
سالم زب رہتا فراہم مگسے روز  
نکھ سکھ سے تادرس رہے روئے دلفروز  
آرایش جمال سے فارغ نہیں ہنوز  
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں  
تا ہوں اس کو میرے اٹھانے میں اہم  
مغل میں اس کی ہم نہ رکھا کسی کو کام  
یاں تو صیف نعال میں رکھا سرد مقام  
مجھ تک کب انکی بزم میں آتا تھا درجام  
ساقی نے کچھ ملانہ دیا سو خراب میں  
گر شوخیاں جتا کے ملانا نگاہ کا  
گر خرمناک ہو کے پھر نا نگاہ کا

## مزن

میں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں  
کیا کہنے ہوتی تھی شب غم کس طرح بھر  
اختر شمار یوں ہی میں ہو جاتی تھی سحر  
توڑا ستم یہ اور نیا چشم شوق پر  
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر  
آئے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں  
گو خود نما نہیں ہے وہ پر نقش ہنوز  
نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز  
ہے مجھ نا ز خود بھی وہ نا ز فر ہنوز  
آرایش جمال سے فارغ نہیں ہنوز  
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں  
رہتے تھے ہم پیار جہاں سے خالص غلام  
اٹھتا تھا ایسی بزم سے میں روز نشہ کام  
پینے میں آج مجھ کو نہ ہو کس طرح کلام  
مجھ تک کب انکی بزم میں آتا تھا درخام  
ساقی نے کچھ ملانہ دیا ہو شراب میں  
آتا ہے یوں تو ان کو لڑانا نگاہ کا  
نظریں بجا کے سب کی ملانا نگاہ کا

## مخروج

انداز دلبری سے جھکا نا نگاہ کا

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا

لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

جب تک کہ پھر خاص مقدر ہی کا نہ جائے

بنتا نہیں ہے کام کوئی لاکھ گر بنائے

اس بات کا یقین کوئی کس طرح سے لائے

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے

جس سحر سے سفینہ رواں ہو مراب میں

مقدر رنگ تو سہی میں یاں دست لپا ہائے

پر کیا کریں مراد ہی جب کوئی برز آئے

یہ حال ہو تو خاکِ نبت کا لطف آئے

وہ ناکہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے

جس نالہ سے تشگاف پڑے آفتاب میں

ملکِ عدم کے دیکھئے عازم پہ کیا بنے

اس رو میں ڈوبت ہیں سبب و فراز کے

یرخس میں بس ہی اپنا نہ ہو اس میں کیا کرے

رو میں ہے رخسِ عمر کہاں دیکھئے تھمے

لے ہاتھ باگ پر ہے نہ پاپے رکاب میں

## مزا

آفت ہے ان مگر نہ اٹھانا نگاہ کا

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا

لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

جادو وہ چیز ہے کہ جو اسکو عمل میں لائے

مشکل سے مشکل امر کو آسان کر دکھائے

لیکن مجھے ہی تو ہے افسوس ہائے ہائے

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے

جس سحر سے سفینہ رواں ہو مراب میں

وہ نالہ جو کہ عریض معلے کو بھی ہلائے

وہ نالہ جو زمین کو بھی زلزلے میں لائے

وہ نالہ اور کانِ نکلا ہی متوجہ کے بنائے

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے

جس نالہ سے تشگاف پڑے آفتاب میں

کہتے ہیں صاف صاف یہ اندازِ چال کے

لسا نہیں عدم سے ادھر دم کہیں اسے

بے اختیار ہوں کہیں مجھ کو گرا نہ دے

رو میں ہے رخسِ عمر کہاں دیکھئے تھمے

لے ہاتھ باگ پر ہے نہ پاپے رکاب میں

## مخروج

مخروج کو اس امر سے ہے خوب اُگھی  
اب وہ نہیں ہے بادہ پرستی جو پہلے تھی  
بالکل ہی ترک کرے ہو بہ ممکن نہیں ابھی  
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ ابرو شبِ ہتاب میں

## مرزا

تھے یار ہم پیالہ ہمارے سبھی کبھی  
دیکھنا ہم نے ہوش میں مرزا کو بھی کبھی  
وہ دن کہاں کہ مشغل سے فرصت تھی کبھی  
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ ابرو و شبِ ہتاب میں

**نوٹ:** جس مصنف کے کلام کا مطالعہ کیا جائے اس کے حالات زندگی کا جاننا بھی

خالی از دل چسپی نہیں ہوتا۔ مرزا محمد ظفر بیگ نے جو مصنف مرحوم کے عم زاد برادر ہیں مرزا  
کے ذاتی اور خانہ دانی صحیح حالات ہم پہنچائے ہیں۔ حالات بطور مہیمہ آمدہ صفحات  
میں پڑھیں۔

خاکسار نظامی بدایونی

۴ مارچ ۱۹۳۵ء

# حالات مصنف

(از مرزا ظفر بیگ صاحب سہا پوری)

**خاندانی حالات** | آپ کے جدا جدا مرزا اختیار مرحوم جیسا کہ مقام تہم علاقہ روسی ترکستان کے قدیم زمانہ سے تھے جیسی پشت میں آپ کا سلسلہ نسب مرزا فریدوں بقتائی سے جو عرب امیر تہمور صاحب قرآن گورگانی کے زانوہر جلیس تھے ملا ہے۔ مرزا اختیار مرحوم انھار میں سدھائی کے آخری میں اپنے چند خاندانی بنگروں سے پرست۔ سیکر دہلی اشرف آباد کے اس زمانہ میں شاہ عالم بادشاہ کی حکومت قائم تھی۔ ملک میں سر طرف قرب۔ آخر۔۔۔ مرہٹوں کے زور تھا اور حکومت بھی ہر ملک پران کے زیر اثر تھی۔ مرزا اختیار مرحوم شاہ عالم کے منور میں تینا ہوئے شاہ عالم نے مرزا مرحوم کے خاندانی حالات کی بنا بہت قدر دانی فرمائی اور ان کو اپنی خدمت میں معتمد خاص کے عہدہ برسر فرما فرمایا۔ لیکن مرزا چونکہ فن سپاہ گری میں کمال دستگاہ رکھے۔ تھے اس وجہ سے کچھ دنوں کے بعد مرزا مرحوم کو فوجی ننگ میں کسی معزز عہدہ پر تقرر کر دیا گیا۔ مرزا مرحوم نے اپنی سن لیاقت سے تھوڑے ہی عرصہ میں سپہ سالاری کا درجہ حاصل کر لیا۔ مرزا مرحوم کی اس ترقی کے باعث ایک مرتبہ فوجی افسر کو رشک پیدا ہو گیا اور دونوں کے باہم جھشک ہو گئی۔

اتفاقاً ایک روز مرزا مرحوم اور مرہٹہ سردار میں کچھ لفظی تکرار ہو گئی جس کی وجہ سے مرزا مرحوم کو اس قدر طیش آیا کہ فوراً تلوار نکال کر مرہٹہ سردار کا کام تمام کر دیا۔ مرہٹہ سردار کے قتل ہونے سے تمام مرہٹی فوج میں بیجان پیدا ہو گیا اور وہ سب کے سب مرزا مرحوم کے قتل کے دریغ ہو گئے۔ تندہ شدہ یہ معاملہ شاہ عالم بادشاہ کے روبرو پیش ہوا۔ مرہٹی فوج کے سرداروں نے مرزا کی شکایت کے دفتر کھول دیئے شاہ عالم بادشاہ نے مرہٹوں کے غصہ کو فرو کرنے کی غرض سے دفع الوقتی کے لئے مرزا مرحوم کو نظر بند کرنے کا حکم دیا اور اصل معاملہ کا فیصلہ کسی دوسرے وقت پر ملتوی فرمایا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ بادشاہ سلامت کی نیت یہ تھی کہ مرزا مرحوم کو کسی حیلہ سے ان کے وطن پہنچا دیا جائے۔ مگر مہمور ایام نظر بندی میں تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتے تھے اسی حالت میں تین ماہ کے بعد ایک روز علی الصبح نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ دفعۃً گلیچ میں دردمیدار ہوا اور دو تین گھنٹہ کے بعد مرزا مرحوم نے شاہی قید ہی سے نہیں بلکہ قید حیات سے بھی نجات پائی اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط۔ مرزا مرحوم کی وفات پر ان کا تمام اثاثہ البیت صبط کر لیا گیا۔ مرزا مرحوم کی اہلیہ و فرماں روا دو سفیر سن پچوں کریم مرزا اور رحیم مرزا کو لیکر سہانپور رستہ بٹلے آئیں چونکہ مرزا مرحوم کی اہلیہ نہایت تعلیم یافتہ خاتون تھیں اس لئے اہالیان سہانپور نے ان کی نہایت عزت کی اور انھوں نے ایک زمانہ مدرسہ قائم کیا جس میں علاوہ قرآن پاک کی تعلیم کے دیگر اخلاقی کتب ہائے فارسی کی بھی عمدہ تعلیم دی جاتی تھی یہ مدرسہ بہت عرصہ تک سہانپور میں جاری رہا۔ کچھ عرصہ کے بعد کریم مرزا اور رحیم مرزا بھی اپنی مکتبی تعلیم سے فارغ ہو کر جوان ہوئے۔ کریم مرزا محکمہ پولیس میں اور رحیم مرزا تحصیل سہانپور میں نائب ناظر

مقرر ہوئے۔ رحیم مرزا بیس سال کی عمر میں پانچ سال ملازمت کرنے کے بعد دفعۃً بحارِ صہ  
 بیفہ ۱۸۶۵ء میں لاوہ فوت ہوئے۔ کریم مرزا نے حکم پولیس میں خاطر خواہ ترقی کی  
 اور بہت عرصہ تک ضلع سہارنپور فتحپور اور بلند شہر میں معزز عہدوں پر کام کیا۔ ۱۸۵۶ء  
 میں بلند شہر سے چھ ماہ کی رخصت لیکر نثرلیف لائے اور اسی زمانہ میں آپ کا انتقال  
 سہارنپور میں ہو گیا۔ آپ نے اپنی وفات کے بعد تین لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی تھی  
 سب سے بڑے صاحبزادے مرزا محمد شفیع بیگ تھے جو عرصہ دراز تک ضلع سہارنپور کے  
 مختلف تعانوں میں کوتوال رہے ایام ملازمت میں تین جج کئے اور ۱۸۶۲ء میں ناظم دار  
 کے عہدہ سے پنشن پائی اور چھ سال تک پنشن پا کر ۱۸۶۷ء میں انتقال فرمایا۔ مرزا  
 حکیم بیگ صاحب منجھلے صاحبزادے تھے آپ نے ۱۸۶۳ء میں امتحان مختار کاری پاس  
 کیا آپ کا کام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر رہا اور بہت بڑے کامیاب مختار کار ثابت ہوئے  
 حکام ضلع آپ کی خاص طور پر عزت کرتے تھے آپ کا انتقال ۱۸۹۱ء میں ہوا۔ آپ  
 نے اپنی وفات کے بعد کافی جائیداد زرعی و سکنی چھوڑی جو اب تک آپ کے بیٹوں کے  
 کے پاس موجود ہے۔ مرزا وزیر بیگ صاحب سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ آپ  
 ۱۸۶۱ء میں حکم پولیس میں ملازم ہوئے اور بہت تھوڑے عرصہ میں ترقی پا کر تھانہ دار  
 کے عہدہ پر پہنچے تھے۔ بہت عرصہ تک ضلع سہارنپور میں مختلف مقامات پر تھانہ دار  
 رہے۔ آپ نہایت قوی اور جسم تھے اب تک ضلع سہارنپور میں آپ کی طاقت کے کرسٹے  
 بیان کئے جاتے ہیں آپ نے ۱۹۲۳ء میں انتقال فرمایا۔

مرزا عزیز بیگ کی تاریخ پیدائش | مرزا عزیز بیگ صاحب مختص  
 بہ مرزا سہانپوری مرزا وزیر بیگ

صاحب مرحوم کے غلط الرشید تھے۔ آپ ۱۸۶۶ء میں بمقام سہانپور پیدا ہوئے۔  
**تعلیم نامہ** | قرآن پاک وغیرہ کی تعلیم ختم ہونے پر آپ فنی مولوی حبیب الدین صاحب مرحوم المتخلص بسوزاں کے زیر تلامذہ میں داخل ہوئے فنی صاحب فن شاعری میں حضرت مرزا غالب مرحوم و مغفور کے خاص شاگرد تھے۔ ایک مدت دراز تک غالب مرحوم کی خدمت میں دہلی رہے۔ اور غالب مرحوم کے انتقال پر سہانپور تشریف لائے جیسا کہ سوزاں صاحب مرحوم نے ایک نعل کے مقطع میں فرمایا ہے ۔

غالب سے کام تھا سو وہ سوزاں گزر گئے

دہلی میں اب جناب کا کیا کام رہ گیا

مرزا عزیز بیگ صاحب کو اوائل عمری سے ہی شعر و سخن میں خاصی دل چسپی تھی اس پر قابل استاد کی توجہ ذہن کی رسائی تھوڑے ہی عرصہ میں فارسی اور اردو کی غزلیں تصنیف فرمانے لگے۔ فنی صاحب مرحوم اپنے ہونہار شاگرد کی تیری طبع دیکھ کر انکی تعلیم میں بے حد کوشش فرماتے تھے۔ چند ہی سال میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ آپ کو فارسی زبان میں کامل دستگاہ تھی۔ عربی میں بھی خاصی بیاقت پیدا کر لی۔

**شاعری** | مرزا مرحوم ایک اعلیٰ ادیب اور شاعر تھے آپ ایک ایسے مخصوص رنگ کے مالک تھے جو اکثر ان کے معاصر شعراء کی ابتدائی روش سے قطعاً جداگانہ

حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی شاعری آپ کی استادانہ حیثیت کی تین دلیل ہے ضلع سہانپور اور دیگر اضلاع میں آپ کے بہت شاگرد موجود ہیں۔ آپ کا طریق اصلاح قابل تحسین تھا۔ اپنے ہر شاگرد کے کلام میں اس کے مذاق اور علم کے موافق ایسی اصلاح فرماتے تھے



کے جس کا جواب مشکل ہے۔ ۱۹۱۵ء میں چند احباب کے اصرار سے حضرت مرزا غالب مرحوم و مغفور کے دیوان کی تفہیم لکھنی شروع کی۔ ماہ اپریل ۱۹۲۲ء میں اس اہم کام کو سن و جوہ اتمام کو پہنچا یا اسی عرصہ میں آپ کو دردِ دلخ کا دورہ پڑنے لگا اور اسی مرض میں چھ ماہ بعد ماہ اکتوبر ۱۹۲۲ء کے اخیر ہفتہ میں ۵۵ سال چھ ماہ کی عمر میں رحلت فرمائی۔ تاریخ وصال ۱۰ روبرج مرزا بہشت میں پہنچی اناللہ وانا علیہ راجعون آپ نے اپنی وفات پر دولہ کیاں چھوڑیں۔

آپ نے ۱۸۸۵ء میں امتحانِ محارک کی پاس کیا مگر شعرو سخن کا اسی درجہ

## ذریعہ معاش و طرز معاشرت

شوق تھا کہ کچھری کے کاروبار کو خاص ضرورتاً انجام دیا کرتے تھے اور نہ ہی صرف ایک دو مرتبہ کچھری تشریف لے جاتے اور جو کچھ وہاں سے یافت ہوتی اس کو اپنے صرف میں لاتے۔ جب تک وہ رویہ صرف نہ ہو جاتا اس وقت تک کچھری تشریف نہ لے جاتے۔ آپ کی قانونی قابلیت بھی قابلِ تعریف تھی۔ اکثر طلباء آپ سے قانون بھی پڑھتے تھے۔

مرزا کی شادی ۱۸۵۲ء میں آپ کے عم اکبر مرزا حکیم بیگ صاحب مرحوم کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ آپ کی اہلیہ محترمہ بھی علما و

## شادی

قرآنی تعلیم کے اردو اور فارسی میں کافی لیاقت رکھتی تھیں۔ امور فانداری اور حسن انتظام میں لائقِ تعریف تھیں اس وجہ سے شہر کے معزز رؤسا و غیوہ کی لڑکیاں بغرض حصولِ علم ان کے پاس آتیں۔ آپ کا انتقال ۱۹۰۹ء میں ہوا مرزا مرحوم اس حادثہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جلسہ شعرو سخن اور دیگر دنیوی مشاغل کو ترک کر دیا۔ ہر چند

اعزاء و اقربائے مرزا مرحوم کی توجہ عقد ثانی کی طرف دلائی مگر مرزا مرحوم نے ایک نہ سنی اور آخر دم تک اپنی اہلیہ مرحومہ کی یاد لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے اس زمانہ میں ایک نہایت یرد و غزل لکھی تھی جس کے مطلع سے دلی حزن و ملال کا اندازہ ہو سکتا ہے شعر

یاد ہیں وہ دن کہ ہم تھے اور زمانے کے مزے  
یاد آتے ہیں قفس میں آشیانے کے مزے

مرزا مرحوم براعتِ مذہب نہایت وسیع الخیالی تھے۔ اعتقادِ مذہب **مذہب** خفی کے پیرو اور صوم و صلوة کے پابند نہ تھے۔ اگرچہ آپ کے پاس با اوقات مختلف مذاہب کے اشخاص کا مجمع رہتا تھا مگر آج تک کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا کہ کسی صاحب کے مذہبی معاملات پر بحث یا گفتگو مرزا مرحوم نے کی ہو یا دوسرے مذاہب پر کبھی نقیضانہ زبان طعن کھولی ہو۔ ابتداءً مرزا کو اپنے اور شوقین طبع دوستوں کے اصرار پر محض رقص و سرود میں شریک ہونے سے انحراف نہ تھا مگر یہ سلسلہ ۱۹۰۴ء میں بالکل ترک کر دیا تھا اور سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت مولانا الحاج مولوی خلیل احمد صاحب جہا جری مدرس اول مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور سے بیعت کی چنانچہ اس واقعہ کو مرزا مرحوم نے اپنی ایک نعتِ غزل کے مقطع میں اس طرح پروا فتح کیا ہے شعر

بہت کچھ صحبت زنداں میں کھویا وقت لے مرزا  
بس اب تو کچھ دنوں خدمت کرو اللہ والو نکئی

**اخلاق** | آپ کا اخلاق نہایت وسیع تھا ہر خاص و عام سے نہایت خندہ

پیشانی اور تواضع سے پیش آتے تھے۔ آپ کی نشست گاہ میں احباب اور تلامذہ کا جلسہ رہتا تھا مگر ان کے جلسے میں کبھی کسی کی یہ مجال نہ ہونی تھی کہ کسی کی غیبت یا بدگوئی کرے۔ آپ نہایت کم سخن اور متین تھے بلا ضرورت کسی سے زیادہ شگلو نہیں کرتے تھے۔

## فہرست غزلیات تضمین شدہ

نمبر غزل	ردیف	مصرع اوّل ہر غزل	صفحہ
۱	الف	نقش فریادی ہے کس کی شونی تحریر کا	۱
۲	"	دل مرا سوزِ نہاں سے بے کما باہل گیا	۲
۳	"	شوق ہر رنگ رقیب سرو سامان نکلا	۳
۴	"	دھمکی میں مر گیا جو نہ باپ بردخا	۴
۵	"	دہر میں نقش وفا و حسرتی نہ ہوا	۵
۶	"	ستا کش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا	۶
۷	"	حرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا	۷
۸	"	جرم شاہنشاہ میں استعار کا دفتر کھلا	۸
۹	"	شب کہ برق سوزِ دل سے زہرہ ابر آہ تھا	۹
۱۰	"	نالہ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا	۱۰
۱۱	"	بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا	۱۱
۱۲	"	دوست غمخواری میں میری سستی فراموش گئی	۱۲
۱۳	"	یہ نہ بقی ہمارے قسمت کے وصال یار ہوتا	۱۳
۱۴	"	ہوس کو ہے نشاط کا کیا کیا	۱۴

نمبر غزل	ردیف	مصرع اول ہر غزل	صفحہ
۱۵	الف	در خورِ قبر و غصب جب کوئی ہم سانہ ہوا	۲۳
۱۶	"	پئے نذرِ کرمِ تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا	۲۶
۱۷	"	گردِ اندوہ شبِ فرقت بیان ہو جائے گا	۲۷
۱۸	"	دردِ منت کشِ دوانہ ہوا	۲۹
۱۹	"	گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا	۳۱
۲۰	"	جب بہت قریب سفر یار نے حمل باندھا	۳۲
۲۱	"	نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا	۳۳
۲۲	"	وہ مری ہیں جیسے سے غم یہاں سمجھا	۳۴
۲۳	"	پھر مجھے دیدہ تر یا د آیا	۳۶
۲۴	"	ہوئی تاثیر تو کچھ باعثِ تاثیر بھی تھا	۳۸
۲۵	"	تو دوست کسی کا بھی ستم گرد ہوا تھا	۴۰
۲۶	"	عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا	۴۲
۲۷	"	ذکر اس پر یوش کا اور پھر بیاں اپنا	۴۳
۲۸	"	جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا	۴۵
۲۹	"	عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا	۴۷
۳۰	"	کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا	۴۹
۳۱	ب	پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب	۵۰
۳۲	ت	آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست	۵۳
۳۳	۰	غیر یوں کرتا ہے پرش مجھ سے ان کے بھریں	۵۴
۳۴	د	حسنِ غم نے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد	۵۶
۳۵	ر	بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر درو دیوار	۵۸

صفحہ	مصرع اوّلے ہر غزل	ردیف	نمبر غزل
۶۰	گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر	ر	۳۵
۶۲	کیوں مل گیا نہ تاب رنج یار دیکھ کر	"	۳۶
۶۳	لور تاپے مراد دل ز حمت جہر و رنشاں پر	"	۳۷
۶۶	ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور	"	۳۸
۶۹	مازم تھا کر دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور	"	۳۹
۷۱	حریف مطلب مشکل نہیں فسوں نیاز	ز	۴۰
۷۲	کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز	.	۴۱
۷۳	نہ گل نغمہ ہوں نہ پردہ ساز	.	۴۲
۷۵	زخم پر چیر چیریں کہاں طفلان بے پروا، مک	ک	۴۳
۷۶	آد کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک	"	۴۴
۷۸	ہے کس قدر بلاک فریب و فائے گل	ا	۴۵
۸۰	وہ فراق اور وہ وصال کہاں	ر	۴۶
۸۲	ممکن نہیں کہ بھول کے کبھی آرمیدہ ہو	.	۴۷
۸۴	کی وفا ہم نے تو خیر اس کو جفا کہتے ہیں	.	۴۸
۸۶	آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں	.	۴۹
۹۸	ہم سے کھل جاؤ بوقت سے پرستی ایک دن	"	۵۰
۸۹	ہم پر جفا سے ترک وفا کا گناں نہیں	"	۵۱
۹۰	ہر چند جاں گزاری قہر و ستاب ہے	"	قطعہ
۹۱	مانع دشت نوردی کوئی تیرا میر نہیں	"	۵۲
۹۳	جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں	.	۵۳
۹۷	ملتی ہے خوشی یار سے نار انتہا تب میں	"	۵۴

نمبر غزل	ردیف	مصرع اول ہر غزل	صفحہ
۵۵	ن	کل کے لئے کرا آج نہ خست شراب میں	۹۷
۵۶	.	حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں بگر کو میں	۹۹
۵۷	"	ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں	۱۰۲
۵۸	"	مالہ جز حسن طلب اسے ستم ایجاد نہیں	۱۰۳
۵۹	.	نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتبار نہیں	۱۰۵
۶۰	.	تبرے تو سن کو صابا نہ دھتے ہیں	۱۰۶
۶۱	.	دام پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں	۱۰۸
۶۲	"	سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں	۱۱۰
۶۳	"	دیوانگی سے دوش یزدار بھی نہیں	۱۱۳
۶۴	.	نہیں ہے رزم کوئی بحیرہ کے درخور مرے تن میں	۱۱۶
۶۵	"	مرے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں	۱۱۷
۶۶	.	دل ہی تو ہے نہ سنگ و ست در سے کہ نہ آئے کیوں	۱۱۸
۶۷	.	غنجہ، ماشقہ کو دور سے مت دیکھا کہ لیوں	۱۲۰
۶۸	و	وارستا اس سے چہا کہ محبت ہی کیوں نہ ہو	۱۲۲
۶۹	.	قفص میں ہوں گر اچھا بھی۔ جانیں میرے شیون کو	۱۲۳
۷۰	.	دی سادگی سے جان پڑوں کوہ کن کے پانوں	۱۲۶
۷۱	.	واں پہونچکر جو غش آتا ہے ہم ہے ہم کہ	۱۲۷
۷۲	"	نم جانو تم کو غیر سے جو رزم و راہ ہو	۱۲۹
۷۳	"	گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو	۱۳۱
۷۴	"	کسی کو نے کے دل کوئی نوا سنچ فغاں کیوں ہو	۱۳۳
۷۵	ی	مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے	۱۳۶

نمبر غزل	ردیف	مصرع اوّل ہر غزل	صفحہ
۷۶	ی	بساطِ عجز میں بھا ایک دل ایک قطرہ فوں وہ بھی	۱۳۸
۷۷		غم دیا سے گر پائی بھی فرصت مراٹھانے کی	۱۳۹
۷۸	.	کیا تنگ ہم تم زدگاں کا جہان ہے	۱۴۱
۷۹	.	درد سے تم کو ہے میرے بے قراری ہائے ہائے	۱۴۲
۸۰	"	سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے	۱۴۴
۸۱	"	گر فاستی سے فائدہ اخلائے حال ہے	۱۴۶
۸۲	"	عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی	۱۴۷
۸۳	.	اس جرم میں مجھے نہیں بنتی حیا کے	۱۴۹
۸۴	"	رفتارِ عمر قطع رہ اضطراب ہے	۱۵۱
۸۵	"	دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پر رشک آجائے ہے	۱۵۲
۸۶	"	سادگی پر اس کی مر جائے کی حسرت دل میں ہے	۱۵۵
۱۷	.	دل سے تری نگاہِ جگر تک اتر گئی	۱۵۶
۸۸	.	تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر طے	۱۵۸
۸۹	"	کوئی دن گر زندہ کافی اور ہے	۱۵۹
۹۰	"	کوئی امید پر نہیں آتی	۱۶۱
۹۱	"	دلِ ناداں مجھے ہوا کیا ہے	۱۶۳
۹۲	.	کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ فالیدِ موائے	۱۶۵
۹۳	"	پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے	۱۶۷
۹۴	"	بے اعتماد لیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے	۱۶۹
۹۵	"	ظلمتِ کردہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے	۱۷۲
۹۶	"	نہ ہوئی گر مرے مرے سے تسلی نہ سہی	۱۷۳

نمبر غزل	روایف	مصرع اوّل ہر غزل	صفحہ
۹۷	ی	عجب نسا ط سے حلاؤ کے چلے ہیں ہم آگے	۱۷۶
۹۸	.	نگوہ کے نام سے بے مہر خا ہوتا ہے	۱۷۷
۹۹	"	ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے	۱۷۹
۱۰۰	"	اگر یہ ہی جان کو قرار نہیں ہے	۱۸۲
۱۰۱	"	ہجومِ غم سے یاں تک سرنگوئی مجھ کو حاصل ہے	۱۸۳
۱۰۲	.	حسن بزم سے تو ناز سے گفتا رہیں آوے	۱۸۴
۱۰۳	"	حسن درگرہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے	۱۸۶
۱۰۴	"	غیر بیس محفل میں بوسے جام کے	۱۸۸
۱۰۵	"	پھر اس انداز سے بہا سائی	۱۹
۱۰۶	.	کب وہ سنتا ہے کہانی میری	۱۹۳
۱۰۷	"	جس زخم کی ہوسکتی ہو زندہ میر رفوی	۱۹۴
۱۰۸	.	یہ ایسے اچھوں کو جتنا چاہیئے	۱۹۶
۱۰۹	"	ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے	۱۹۷
۱۱۰	"	نکندہ ہیں ہے غمِ دل اس کو سنا ہے نہ بے	۱۹۸
۱۱۱	"	وہ آکے خواب میں لشکین اضطراب تو دے	۲۰۰
۱۱۲	"	تپش سے میری وقف کش کش ہر تار بستر ہے	۲۰۲
۱۱۳	.	خطر ہے رشتہ الفت رگ گردن نہ ہو جائے	۲۰۳
۱۱۴	"	فریاد کی کوئی لے نہیں ہے	۲۰۳
۱۱۵	"	ہم رشک کو اسے بھی گوارا نہیں کرتے	۲۰۵
۱۱۶	"	دیا ہے دل اگر اس کو شہر ہے کیا کہیئے	۲۰۵
۱۱۷	"	دیکھ کر در پردہ گرم دامن افشانی مجھے	۲۰۵



صفحہ	مصرع اوٹے ہر غزل	ردیف	نمبر غزل
۲۰۹	یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یارب مجھے	ی	۱۱۸
۲۱	حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے	"	۱۱۹
۲۱۲	کبھی ٹکی بھی اس کے تخی میں گمراہ ہے مجھ سے	"	۱۲۰
۲۱۳	باز بچہ اطفال ہے دنیا میں آگے	"	۱۲۱
۲۱۶	کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کیے	"	۱۲۲
۲۱۸	روئے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے	"	۱۲۳
۲۲۰	ابن مریم ہوا کرے کوئی	"	۱۲۴
۲۲۲	بہت ہی غم گیتی شراب کم کیا ہے	"	۱۲۵
۲۲۳	ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نہکے	"	۱۲۶
۲۲۵	مستی بذوق مختلف ساقی ہلاک ہے	"	۱۲۷
۲۲۵	حسن جاسیم شانہ کش زلف بار ہے	"	۱۲۸
۲۲۷	آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے	"	۱۲۹
۲۲۹	چپ تنگ وہاں زخم نہ پیرا کرتے کوئی	"	۱۳۰
۲۳۱	بیتیم پر غش لارہ تلمی زاد اسے	"	۱۳۱
۲۳۳	منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی	"	۱۳۲
۲۳۵	غم کھاتے ہیں بودا دلی ناکام بہت ہے	"	۱۳۳
۲۳۷	مدت ہوئی ہے یار کو کہاں کئے ہوئے	"	۱۳۴
۲۴۰	نویرا من ہے پیرا دوست جاں کے لئے	"	۱۳۵
۲۴۳	میں ہوں مشتاق جفا مجھ پہ جفا اور بھی	"	۱۳۶
۲۴۵	آپ نے مستی الہی کہا ہے تو سہی	"	۱۳۷
۲۴۶	کی شرح نظم غالب تعین میں جو مرزا	"	قطبہ تاریخ
۲۴۷	تعمین برکلام مولانا جامی، میر تقی میر اور حبیب الدین سوزاں	"	ضمیمہ



کیا یہ منتا خفا از لب کاتب نقد میر کا  
ذره ذره ہو فنا اک روز پس تعمیر کا  
رنگ جھلکایے کیوں ہر چہیں تعمیر کا  
نقش فریادی ہے کس کی شونئی تحریر کا  
کاغذی ہے پر بن ہر ہیکر تصویر کا

درد و غم کرتے ہیں جو کچھ فرسائی پوچھ  
حسرتیں کرتی ہیں جو ہنگامہ رانی پوچھ  
توڑتی ہے دل کو کیونکر نا شکست بانی پوچھ  
کاؤ کا وسخت جانی ہائے تنہائی پوچھ  
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

آرزوئے قتل کو لب پر نہ لانا چاہیے  
ہاں مگر درد پر درد تیر و تقاضا چاہیے  
کھینچ کہ خود آئے اشرق قاتل پر اتنا چاہیے  
جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے  
سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

کوئی کم مایہ اگر برسوں طبیعت کٹائے  
غیر ممکن ہے کوئی نکتہ مے نکلتوں سے پائے

۱۵ بعض ستارہ میں نے اس شعر کو جب مسمیٰ قرار دیا ہے حالانکہ ایسا کہنا سراسر بے المعافی ہے ہر زاغہ غالب نے  
عبدالمہزاق شاکر کو اس شعر کی تشریح یوں لکھ کر بھیجی ہے : کہ "ایران میں رکھ ہے کہ دادخواہ کا غز  
کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جھلایا یا خون آلودہ کپڑا لباس پر لٹکا کر  
لے جاتا۔ بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس شونئی تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے  
اور اس کا پر بن کاغذی ہے یہی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہے موجب رنج و ملال  
و آزار ہے"

لاکھ سامع کان اپنے میری باتوں کو جائے  
 آگہی دامِ نسیب کجستہ چاہے بجائے  
 مدعا عتقا ہے اپنے عالمِ تفسیر کا  
 پھر ہے مزا سلسلہ بیکار قید و بند کا  
 جوش و خروش جب مجھے تھمے نہیں تیا ذرا  
 ہیں کسے نزدیک طوق و رین تو چیز کیا  
 بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتشِ ریزہ  
 موتِ آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا



کیا بتاؤں آتش الفت میں کیا کیا جل گیا  
 ساز و سامانِ ہستی کا سراپا جل گیا  
 جسم بالکل بچک گیا ہے اور کلہا جل گیا  
 دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا  
 آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا  
 مجھ کو دعویٰ ہے ہلا دیتی ترا دل ہر صدا  
 لیکن اب بے اثر ہے میں گجا اور تو گجا  
 ناد ہو سکتا ہے اپنی حدِ امکان تک سا  
 میں عدم سے بھی پرے ہوں نہ غافل باہا  
 میری آہِ آتشیں سے بالِ عتقا جل گیا  
 خیر مجھ کو آتشِ غم دل میں جھنک ہے نہاں  
 ورنہ پھر چھوڑ گئی کیا دنیا میں یہ برق تپاں  
 ذکر سے اسکے زبانِ شمع ہوتی ہے زباں  
 عرض کیجئے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں  
 کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرِ اجل گیا  
 دیکھنے کو اب بھی ہے سرد چہرہ افساں جسم زار  
 دل کی ہستی پر ہے لیکن داغ کا دار و مدار

اب تو اک ظلمت کدرہ سینہ ہے گوہِ دلفا  
دل نہیں تجھ کو دکھاتا اور نہ غفل کی ہمار  
اس چہرا غاں کا کروں کیا کار فرما بل گیا  
ہے فراق ہمنشیناں پر طبیعت مشتعل  
کرو دیا سوز و گداز دل نے منزلِ مضمحل  
کوئی دل بھی تو نظر آتا نہیں غےشِ غل  
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو مالکِ دل  
دیکھ کر طرزِ تپاکِ دل دنیا جل گیا

پنجرہ دیو جنوں دشمن داماں نکلا  
اس سے بکھر نہ کوئی تار گریباں نکلا  
ننگِ ملبوسِ تین عاشقِ حیراں نکلا  
شوقِ ہرزنگِ رقیبِ ہر و ساماں نکلا  
قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا  
دل میں ٹھہری نہ سنال کوئی گھڑی بھی یاز  
حسرتِ بوسہ سو فار نہ نکلی یارب  
زخمِ نہ داؤد دی تنگی دل کی یارب  
تیر بھی سینہ بسمل سے پرافتشاں نکلا

لے اس شعر کا مطلب مزاحیہ ہے۔ غزلِ رازِ شاکر کے خط میں اس طرح لکھا ہے "رقیب یعنی مخالف شوق  
مُراسماں کا دشمن ہے دلیل یہ ہے کہ قیس جو زندگی میں نگاہِ بڑا بہر تھا تصویر کے پردے میں بھی نگاہی رہا  
یہ ہے کہ محسن کی تصویرِ باطن عریاں کی گھنٹی ہے جہاں گھنٹی ہے ۲۔ اس شعر نے شوقِ مزاح کا سبب بنے  
شاکر کو لکھا ہے یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت نکالی ہے جیسا کہ اس شعر میں ہے۔ نہیں مذہبِ راحت  
حراحت پر کیاں وہ زخمِ تیغ ہے سکو دکھا کہے۔ یعنی زخمِ تیر کی توہین سبب ایک خند ہو گیا اور تو اس کے زخم  
کی تحسین سبب ایک طاق سا کھل جانے کے زخم نے داؤد دی تنگی دلی۔ یعنی نازل نہ کیا تنگی کو پرافتشاں۔ یعنی چتا  
اور لفظ تیر کے مناسب ہے یعنی یہ کہ تیر کی دل کی داد کیا دیتا وہ تو خود تین مقام ہے گہرا گہرافتشاں اور چہرہ

کون ہے جسکو ہے جمیبت خاطرِ حاصل      کوئی آشفۃ کوئی منشور میں داخل  
گھر ہے یا ہے کوئی شوریدہ سروں کی منزل      بوئے گلِ تالاولِ دود و چراغِ محفل  
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

خوب لڑنے میں مڑے دلیں جو حقِ نعمت درد      کسکی تقدیر کو یوں ہاتھ لگے دولت درد  
کیوں ہوتی مجھے ہر دم طلب کثرت درد      دل حسرت زدہ تھا مادہ لذت درد  
کام یاروں کا بقدر لب و دندان نکلا

مدتوں دل کو رہی لذت آزار پسند      متاثرگ جاں کو دمِ خنجرِ خونخوار پسند  
اب بقا پائی نہیں ہے ہمیں نہ ہمارے پسند      ہے نوا موزِ فنا ہمت دشوار پسند  
سخت مشکل ہے کر یہ کام بھی آسان نکلا

قطرہ اشک جو آنکھوں سے بہا یا غالب      رشکِ دریائے شر کا لینے بنایا غالب  
تارِ مژدے پہ چھڑکوں کا لگا یا غالب      دلیں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب  
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفان نکلا

کہتا ہے کون عشق میں فرادِ فرد تھا      ہاں تھا جو کچھ تو قیسِ سیاباں نور و تھا  
وہ کیا جو کچھ ضعیفہ کے حملے میں سرد تھا      دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا  
لے نہ پاؤں طرف اشارہ کرتے ہوئے دلتے ہیں کہ سنئے عرفِ عشق کی دھمکی میں ناگر پہاڑ کی طرح جاں نہیں دی سکریم  
تو مردانگی کیسا ہے عشق اور مصائبِ عشق کا مقابلہ تمام کر کرتے رہے۔

عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تنہا

کچھ وقفہ حیات جو مجھ کو عطا ہوا      تنہا اس میں بھی فنا کا تصور بندھا ہوا  
گویا وطن میں تنہا درِ غربت کھلا ہوا      تنہا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا

اڑنے سے پیشتر بھی مارنگ زرد تنہا

تحصیلِ درس صرفا کر چکا تھا میں      الفت کے امتحان سے فالغ ہوا تھا میں  
بلے ہری زمانہ سے نا آشنا تھا میں      تالیفِ نسخہائے وفا کر رہا تھا میں

مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تنہا

سیدہ کہ ایک تختہٴ مشق جنوں ہر اب      جو داغ ہے کز خم ہے وہ لالہ گوں ہر اب  
حالت ہر ایک عضو کی زار و زبوں ہر اب      دل تاجگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہر اب

اس رہ گزریں جلوہ گل آگے گرد تنہا

باروں نے دل لگانے کو سمجھا ہے دل لگی      حالانکہ آفتیں ہیں ہمیشہ نئی نئی  
مکن نہیں نجات ملے غم سے جیتنے جی      جاتی ہے کوئی کش مکش اندوہ عشق کی

دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تنہا

حاصلِ غرض ہوئی نہ مرے قید و بند سے      تھا مدعا کہ گھر میں یہ وحشی پڑا رہے  
چھوڑی نہ اپنی خود آوارہ گرد نے      احباب چارہ جوئی و حشت نہ کر سکے

زندوں میں بھی خیالِ بیا بیاں نورِ تنہا

مژا یہ رسم ظلم و ستم کیا یہاں کی ہے      مٹی خراب بلبلِ ہندوستان کی ہے  
شاکی جو اس زمانہٴ ناقدِ رواں کی ہے      یہ لاشِ بے کفن آئندہ خستہ جاں کی ہے

حقِ مغفرت کے عجب آزاد مرد تنہا

لے ماشیہ اگلے منہ پر

دعہ پورا کبھی اس شوخ کا کوئی نہ ہوا قصہ کوتاہ وفا عہد وفا بھی نہ ہوا  
فیض کچھ ہستی موبوم سے اس کی نہ ہوا دہریں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا  
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

سب غلط ہے کہ زبرد و ہی ہو گا اعلیٰ جس کا نظارہ کرے مارسیہ کو اندھا  
کس طرح کہتے کہ پتھر میں اثر یہ ہو گا بنزہ خط سے ترا کا کلی سرکش نہ دبا  
نہ زبرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

اس سے مایوس ہوا ہوں کہ جہاں چھوٹوں جیتے جی دام غم ہو نہ رہا سے چھوٹوں  
غیر ممکن ہے کہ میں رنج و بلا سے چھوٹوں میں نے چاہا تھا کہ اندوہ و فاسے چھوٹوں  
وہ ستم گر مرے مرنے پر بھی راضی نہ ہوا

ما شیعہ دستہ مسترد جاں کو حد بخشنے عجیب آزاد مرد تھا لاش کیلئے بھی پابند کف ہو گا اور اپنی آزادی  
مرکز ملی برقرار رکھی حضرت ذوق نے اپنی موت کے متعلق اسی قسم کا شعر کہا ہے  
کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گر گیا کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے  
فالب صاحب سانپ اور زمرہ کے متعلق چودھری عبدالغفور کو اس طرح لکھا ہے "قبول دعا وقت طلوع منجلد  
مضامین شعری ہے جیسے کتابوں کا پرتو ماہ میں پھٹ جانا اور زمرہ سے افعی کا اندھا ہو جانا"  
دام افعی۔ سانپ کی پھسکار۔ زمرہ سبز رنگ کا قیمتی پتھر جسکے دیکھنے سے سانپ اندھا ہو جاتا ہے۔  
آصف الدولہ ولی اودھ نے اس کا قہر کیا۔ سانپ کے سامنے زمرہ رکھا۔ لیکن سانپ اندھا نہ ہوا۔ فالب صاحب  
نفا کی تائید میں بنزہ خط کو زمرہ اور زلف کو سانپ سے تشبیہ دے کر میٹھون پیرا کیا ہے۔

ہم جو اس دم میں کمزریں تو کمزریں ہی کم ہیں نہاد سے زندوں کے برابر ہی ہیں  
 آئینہ اپنا مکدر ہے مکدر ہی سہی دل گزر گاہ خیال سے وسا غری سہی  
 مگر نفس جاوہ سر منزل تقویٰ نہ ہوا

ہو رہے تھے ترے لانے میں جو معترف ابھی مجھ کو ممنون بنائے کو تھے احباب سبھی  
 کھل گئی ان کی غرض تو نے بھی ٹالے نہ بھی ہوں تیرے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی  
 گوش منت کش گلپانگ تسلی نہ ہوا

کس سے دل کھول کے کچھ شکوہ کلفت کیجئے کون ہے کس سے بیان غم و حسرت کیجئے  
 کس دعا کے لئے امید اجابت کیجئے کس سے غرومی قسمت کی شکایت کیجئے  
 اُم نے چاہا تھا کہ مر جائیں ہو وہ بھی نہ ہوا

ذکر کرتا تھا مسیحا کا جو سب سے غالب تنگ مرزا تھا غم و رنج و تعب سے غالب  
 منتظر مرگ کا تھا دیکھئے کب سے غالب مر گیا صدرِ مریک جنبش لب سے غالب  
 ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا

نہ کچھ مرغوب نہ کھو نہ کوہِ نظارہ گلستاں کا نہ سوا سر میں ہر حسن و جمال جو رُخسار کا

۱۵۔ دم عیسیٰ عیسیٰ کی پھونک حضرت عیسیٰ ایک بزدست پیغمبر گزشتے ہیں اچھے ماننے والوں کو مسلمان کہتے ہیں مسلمان  
 بھی انکو پھر مانتے ہیں انکا یہ مجروح تھا کہ اپنی پھونک سے مروہ زندہ کر دیا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں سیکھانے والے حیات  
 دینے کیلئے لب ہلائے مگر میری ناتوانی کو جنبش لب بھی گل لگ کر رہی اور یہ صدمہ ہی بڑا سنت نہ کر سکا۔ (باقی مشہور)



ہمارا دل ہے وارفتہ بہارِ بزمِ جانان کا      ستائش کرے زاہدِ مستندِ حسنِ خانِ ضواں کا  
وہ اک گلِ سربہ ہے ہم بخود دیکھنے طاقِ نسیاں کا

لیا کرتا ہے کام ابرم سے ظالمِ سیخِ بڑاں کا      شمار آساں نہیں جود و جہانِ چشمِ فتاں کا  
مگر اس پر بھی دل تسبیحِ خواں ہے نہ جانان کا      بیاں کیا کیئے بیدار کاوشِ بہائے شرکاں کا  
کہ ہرک قطرہ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجان کا

بہت کچھ سعی و کوشش کی کہ کو کوئی لے نالو کو      لبوں تنگ بھی نہ آنے دیوں کبھی سینے سے نالوں کو  
مردودی صورت نے نہرسِ دندلاں نے نالوں کو      نہائی سُطوتِ قاتل بھی مانعِ مئے نالوں کو  
یہاں دانتوں میں جوتنکا ہوا ریشہِ بیتاں کا

خدا نا خواستہ داغِ جگر اپنا جو جل اٹھے      زبانِ شمع پیدا ہوا بھی ہر اک مبنِ موسے  
بھی دیکھئے کہاں ہیں تھے شعلے سوزِ باطن کے      دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرغتِ زمانے نے  
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے مگر پھر اغاں کا

نظر آنے لگے چاروں طرف اکھوں میں تجھ سے      درو دیو اتیرے عکسِ رخ سے جگمگا اٹھے  
ہوئے آثارِ ظاہر ہیکِ حدت میں کثرت کے      کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوئے نے  
کہے جو پر تو غورِ شیرِ عالمِ شہنشاہ کا

بظاہر کتنی حکمِ خانہِ تن کی بسا رکھی      مگر خود سعیِ صانعِ وجہ اسبابِ فنا نکلی  
بنے گی صاعقہ اک دن یہی صانع کی دل گری      مری تعمیر میں مضمحل صورتِ خرابی کی

گزشتہ سے پیوستہ جو جنبشِ لبِ زندگی بخشے والی تھی میرے لئے موت کا باعث بن گئی۔

ہیولے برقِ خرم کا ہے خونِ گرگ و ہنقا کا  
 دمِ ہیجانِ وحشتِ پاؤں میں ہوتا ہے اک چکر  
 مری اہولے بن بکر گو لے اٹھتے ہیں طن بھر  
 یہ نوبتِ صحن کی پہنچ کر چمک زن ہے محراب پر  
 اکا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر  
 ملار اب کھوٹے پر گھاس کبے میسے دریا کا

میرے جل بجھنے کی دنیا کو ناسحقِ جستجوئیں ہیں  
 جگر کی آگ کا اظہار کم ظفروں کی خوشی ہیں  
 نہ شکوے میں نہ بے پروا دل کی گفتگوئیں ہیں  
 خوشی میں نہال خود گشتہ لاکھوں از روی ہیں

چرخِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریبا کا  
 تصور میں جو وہ تصویرِ پُر انوار باقی ہے  
 یہ اک شکلِ تسلی بخش جانِ زار باقی ہے  
 ہونے ہم خاک اس کی گری بازار باقی ہے  
 دلِ افسردہ گویا جرہ ہے یوسف کے زندان کا

مری قسمتِ بری ہے آپ ہوتے ہمنشینِ رنہ  
 پسندایا ہے کرتے کیوں مجھے اندو گہیں رنہ  
 یہ وری دیدہ و دانستہ ہے بہتے قری ورنہ  
 بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں رنہ

سبب کیا خواب میں اگر تم بٹے نہاں کا  
 سبب تیری خوشی کا میں نے مٹانے کو بھاجا تھا  
 ترا غم دیکھ کر غم کو قلع ہے اپنے مرنے کا  
 یہ میری تعزیت اور سب مل ملکر تزارونا  
 نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا  
 قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیرے شرکا کا

کھلا ہے سامنے منظرِ عدم آباد کا غالب  
 سمجھتا ہے اسے مرزا سفر کا مہتا غالب

اسی میں منتشر ہوتے ہیں اور اوراقِ غالب  
نظر میں ہے ہماری جاوہ راہِ فنا غالب  
کر یہ شیرازہ ہے عالم کے اجڑا پریشاں کا



کیوں ہو رہا ہے خیفتر برط نواز کا      گرویدہ کس لئے ہے عراق و حجاز کا  
ہے ہرزباں پر راگ اسی بے نیاز کا      محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا  
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

خنداں جو میرے حال پر وہ ماہ پار ہے      جاگے نصیب اونچ پر اپنا ستار ہے  
پڑ مرگیا پیری خوشی کا اشارہ ہے      رنگ شکستہ صبح بہارِ نظارہ ہے  
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

ملتا بھی ہے جو مجھ سے تو آمادہ ستیز      دشمن کے ساتھ رام ہے مجھ سے رگ و گریز  
مجھ سے تنفر اور رقیبوں سے خیر و میز      تو اور سوئے غیرِ نظر ہائے تیز تیز!  
میں اور دکھ تری مژدہ ہائے دراز کا

بیتاب ہوں گا صورتِ برق و شمر نہ میں      نالہ کروں گا درد سے شام و سحر نہ میں  
خاموش ہوں جتاؤں گا دردِ گلہ نہ میں      حرف ہے ضبطِ آہ میں میرا و گرنہ میں  
ٹکے ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

سب کے ہیں انکی بزمِ میلِ رمل نکل ہے      آبِ بقا کے چشمہ ہیں گویا اُبل رہے

مستوں میں پہ پہے ہیں عجب دور چل ہے      ہیں بسر خوش بادہ سے خیشے اچیل ہے

ہر گونہ بساط ہے سر شیشہ باز کا

اُس کو ہے رات دن طلب تیر سینہ دوز      مطلوب اس کو شام و سحر سویر سینہ سوز

اس بواہوس کو چاہیے اک زخم تازہ روز      کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہنوز

ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا

مرزا کے دل کی پوچھتے ہو بات کیا اسد      صدقے میں عشق کے بیجر گھر اسد

بر باد مفت گنج جواہر گیا اسد      تاراج کاوش غم بجاں ہوا اسد

سینہ کہ تھا دھینہ گھر ہائے راز کا



ہو نوید اہل سخن کو خیر کا منظر کھلا      باب بندل وجود کو یا لکتہ سخنوں پر کھلا

اس یہاں سے گرداد و دہش کا در کھلا      بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا

رکھو یا رب یہ در گنجینہ لگو ہر کھلا

زینت بزم فلک کا حال جب بچہ پر کھلا      تب مسرت سے ذرا اپنا دل مضطر کھلا

شاہِ خاد چھپ گیا رونے میں انور کھلا      شب ہوئی پھر انجم نشندہ کا منظر کھلا

۱۵۔ ان مشاعروں کا حرف اشارہ ہے جو حضرت بہادر شاہ ظفر کے زیر پرست قلعہ علی میں ہوا کرتے تھے اور

جن میں مرزا صاحب بھی شرکت کیا کرتے تھے ۱۶۔ دوسرے شعر میں شاہ کی چہل پہل اور رونق کو بتکرار کے

حسن و جمال سے تشبیہ دے کر ایک لطیف بات پیدا کر دی ہے۔

اس تکلف سے کہ گویا بت کردہ کا در کھلا

چلیے مت اگر یاروں کے گنواؤں فریب      انہی ہر اک بات میں چاہوں تو دکھلاؤں فریب  
اعتبار انکے مجھے کیونکر ہو جب پاؤں فریب      گرم ہوں یوانہ پر کیوں وست کا کھاؤں فریب

آستیں میں دشنہ نہ پاں ہاتھ میں نشتر کھلا

بزم زمیں سے اس تراوی کی کب حتی امید      نشہ میں آئندہ مٹنے کی بھی دیتا ہے نوید  
اس خوشی میں ہے دل وارفتہ مگر غم نشید      گو نہ سمجھوں سکی باتیں گو نہ پاؤں اسکا بھید

پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پہنکر کھلا

عمر بھر دل میں رہا شاہد پرستی کا خیال      اب حقیقت کھل گئی اسکی کہ تھا اچھا خیال  
اس بہشتی رو کا آخر آج کام آیا خیال      بے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال

خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

واہ کیا ہنسنے کا زینت دہے حسن و نشیں      حسن کے پر تو سے ہو جاتا ہے زیور بھی حسین  
نور سے اس لئے تا ہاں کہے ہنسنے خورنہ چین      منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں

زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

گھر کی ظلمت دیکھ کر یہ فائدہ کہوں ہوں ملول      جو بلا نازل ہو سر پر بچکوبے دل سے قبول  
کیونکہ شب تیرہ کا شکوہ لب تک آنے دوں فصول      کیوں نہ چھری ہو شب غم ہے بلاؤں نزول

آج ادھر ہی کو ہے گا دیدہ اختر کھلا

جب کیا قصد سفر تو تھا طبیعت میں خیال      اپنے رنگانوں کی الفت چمکے دل سے نکال  
کر دیا ترک وطن ترک تعلق ہے محال      کیا رہوں بت میں خوشی جب خود ادا نکال

نامہ لا تا ہے وطن سے نامہ برا کتر کھلا

میں نے دل پر نقش کر لی حضرت مولا کی پند  
چاہلو سی اہل و دنیا کی نہیں مجھ کو پسند  
آستانِ غیر پر کمیوں جاؤں ہو کر مستمند  
اسکی امت میں ہوں میں میے زیں کمیوں کا رند  
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

۹

اسکی آمد کے تصور میں جو میں بے تاب تھا  
نیند کا آنکھوں میں ناک خیال خواب تھا  
اشکباری سے رواں اک سیلِ خونِ ناب تھا  
شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرِ ابراب تھا  
شعلہ جو الہ ہر اک حلقہ گر داب تھا  
کنجِ تنہائی میں میں تھا اور وہاں دربارِ عام  
وہ عدسے کے ساتھ ہنسنے تھے مجھے فونے کا  
میں بہا تا تھا یہاں نسو وہاں تھا دورِ جام  
گر یہ سے بیاں پینہ بالمش کفِ سیلاب تھا  
وہاں راستہ ہونے سے زلفونکے جال  
میں یہاں سنبل کی صورتِ غم سے تھا آشفہ جال  
عقی یہاں حیرت ہاں تھی آئینہ کی دیکھ جال  
اور وہاں راستہ ہونے سے زلفونکے جال  
وہاں خود آرائی کو تھا موتی پرٹنے کا خیال  
یاں ہجومِ اشک سے نارنگہ نایاب تھا

لے قطع میں قلاب ماسٹ سب معراج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں انکی امت میں ہوں جن کے لئے عرش  
پر جاتے وقت آسمان کے دروازے کھل گئے تھے پھر میرے کام کس طرح بندھ سکتے ہیں وہ بھی کھل جائیں گے۔  
معراج اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک رات حضرت محمدؐ کو دیگر انبیاء سے ان کا درجہ بلند کرنے  
کے لئے عرش پر بلایا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک خاص سواری (براق) پر سوار ہو کر آسمانوں کا فاصلہ طے کر کے  
اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچے تھے۔

وہ وہاں کرتے تھے ہاتھوں سے حلائی شست و شو  
 بہرہ تھا دل یہاں سینے میں ہو ہو کر اہو  
 چاند ناگلشن میں تھا ظلمت یہاں تھی پار سو  
 جلوہ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب ہو  
 یاں رواں شرکان چشم تر سے خون ناب تھا

سو گئے وہ سنتے سنتے قصہ خواں کی گفتگو  
 اور یہاں برسا کیا تا صبح آنکھوں سے اہو  
 فرش راحت پر وہ تھے اور ہم پریشاں کو کبھو  
 یاں مشورہ بیکہ خوابی سے تھا دیوار جو  
 واں وہ فوقِ نازخو باش کم خواب تھا

نقی یہاں کبھی کسی مونس وہاں مغل جمی  
 تھا یہاں دل صرف غمِ عشرت وہاں مسافر تھی  
 وہاں تھے شمع مغل نقی یہاں ک لٹو لگی  
 یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزمِ بخودی  
 جلوہ گل واں بساطِ محبت احباب تھا

عیش میں وہ ٹھوٹھے میں دردِ غم میں مبتلا  
 وہ وہاں سرشارِ بادہ میں یہاں لب نشہ تھا  
 یاں زمیں سے آسمان تک سوختن کا باب تھا  
 وہ وہاں خنداں و فغاں میں یہاں گرم بکا  
 فرش سے تاعش واں طوفانِ تما سچ رنگ کا

شوقِ جب سے زیادہ مجھ کو ٹپانے لگا  
 سببہ سوزاں میں میرے لگ بھڑکانے لگا  
 چپکے چپکے میں کچھ اپنے جی کو سمجھانے لگا  
 ناگہاں اس رنگ سے خونابر ٹپکانے لگا  
 دل کو ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذتِ یاب تھا

شوق میں مضطرب مثالِ ماہی ہے آب تھا      مضطرب ایسا کہ گویا برق تھا سیماب تھا  
اسکی حالت سے پریشیاں جلسہ ہوا تھا      نالہ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا  
تھا سپند بزم وصل غیر گو بیتاب تھا

راندن نالہ ہی اس سے گوش زد تھے مثل نے      یاد ہی اسکے سوا گویا نہ تھی کچھ اور لے  
جوشِ گریہ کے سوا بھاتی نہیں پڑ کوئی شے      مقدم سیلاب سے دل کی فاش طآہنگ ہے  
فائدہ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

اسکے ذرہ کی خاک کو طلس کہوں بیا کہوں      اس زمین کے فرش کو یا فرشِ نخل کا کہوں  
ہے بجا قائم سے نرمی میں اگر اگلے کہوں      نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں  
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

تھا اسی کے نور کا ہر چیز میں جلوہ عیاں      ہو گیا کچھ پردہ غفلت ہی عاملِ درمیاں  
حیف ہے یونہی گئی محرابِ نور دی رائیگاں      کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارمانے ورنہ یاں  
ذرہ ذرہ روشِ خورشید عالمِ تاب تھا

یاد ہے صیاد اپنا وہ زمانہ بھی تجھے      آب و دانہ کی ہمائے فکر رہتی تھی تجھے  
بیکسو کے حال سے غفلت نہ تھی اتنی تجھے      آج کیوں پروا نہیں اپنے اہیر و نکی تجھے  
کل تلک تیرا ہی دل نہرِ وفا کا باب تھا



آخر لے صیاد کیا ضد ہے تجھے کچھ تو بتا      دیکھ کر مجھ کو جو تونے دام اکٹھا کر لیا  
شوق سے یوں تیسے پھنڈیں کوئی آیا بھی تھا      یاد کرو وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا  
انتظار صید میں اک دیرہ بنے خواب تھا

ہونے والا تھا بیا طوفان اسکے انگ سے      پوچھتے کیا ہو کہ اک اک قطرے دریا ہے  
خیریت ہی ہو گئی مرزا کہ آنسو تم گئے      میں نے روکارات غالب کو گرنہ دیکھتے  
اسکے سیل گریں گریں گریں کف سیلاب تھا



ہم جو چاہیں کسی ذرے کا بیاباں ہونا      ہے عبث چارہ و تدبیر میں حیراں ہونا  
معتنع کا کبھی ممکن نہیں امکاں ہونا      بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا  
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ابرفرغاں نے جو ٹھہرائی ہے رسالے کی      نوبت آئے نہ کسی دن مے بہر جانے کی  
شکل ہونے لگی ہر گوشے میں برائے کی      گویہ چاہے ہے خرابی مرے کاشلے کی  
درو دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

بس جو دل پر پویر کچھ تو اسے روکوں تو      میں اس آواہ کا تا چند ہونگا دل جو  
اپنے انجام کو سوچوں یہ مجھے ہوش بھی ہو      وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو  
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

بخت آئینہ تیرے حسن سے کیا چمکا ہے      سامنے آنکھوں کے پردہ بخزینا ہے  
خود نمائی کا جو ہے شوق تو نبی کیا ہے      جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے  
جو ہر آئینہ بھی چاہے ہے مڑ گاں ہونا

حاصل آنکھوں کو ہے جو ذوق کئی مت پوچھ      انبساط دل سرگرم تماشا مت پوچھ  
حسرتیں آج نکلنے کو ہیں کیا کیا مت پوچھ      عشرتِ قتلِ گہر اہلِ تنامت پوچھ  
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عسریاں ہونا

یوں تو ہر دل میں ہے کس دل میں ہیں طغناٹا      ہاں جگہ دل میں ہمارے ہی نہ کی وائے نشاط  
جیتے جی مر میں رہی جوشِ سودائے نشاط      لگے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط  
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عشق نے ذوقِ ہر اک چیز کو بخشا ہے جدا      سینہ مشتاق سناں مرکو تبر کا سودا  
جان بیتاب کو ہے شوقِ فدا ہونے کا      عشرتِ پارہ دل زخمِ تمنا کھانا  
نزد ریش جگر غرقِ نسکداں ہونا

جیتے جی میرے نہ کی مکر و دغا سے تو بہ      نہ تم سے نہ کسی جرم و خطا سے تو بہ  
بھول کر بھی تو نہ کی خوفِ خدا سے تو بہ      کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے تو بہ  
ہائے اس زور و پشیمان کا پشیمان ہونا

ہوتی ہے حسرتِ مرزا کو جو وحشتِ غالب      پھر تو آجاتی ہے بلبوس کی شامتِ غالب  
جیبِ اس کی تو ہوتی ہے بُری گتِ غالب      جیفِ اس چارگرہ کپڑے کی قمیصِ غالب  
لے (ماٹھرا لے مٹوہ)

جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریہاں ہونا

۱۲

مجھ سے غم آشام کا احباب غم کھائیں گے کیا  
خوگر کلفت کو وہ آرام پہنچائیں گے کیا  
جوششِ وحشت کے ہوتے زخم سلوائیں گے کیا  
دوست غمخواری میں میری سخی فرمائیں گے کیا  
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھائیں گے کیا  
یہ جفاکاری روا رکھو گے ہم پر کب تلک  
اس طرح مالو گے قصہ سن سنا کر کب تلک  
ہوگی آخر حاجتِ عرض مکر کب تلک  
بے نیازی حد سے گذری بندہ پر کب تلک  
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا  
دوست کیوں پند نصیحت پیتے ہیں خواہ مخواہ  
مجھ کو کچھ دیوانہ سمجھا ہے کسی نے واہ واہ  
ہیں تحیر میں کہ آخر کیا ہوا مجھ سے گناہ  
حضرت نامح جو آئیں دیدہ و دل فرشتہ راہ  
کوئی مجھ کو یہ نہ سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا  
قتل گہر سے روز کو نا کامیاب آتا ہو گیا  
وقتِ عرضِ مددِ ماقابل سے شرماتا ہوں میں  
دیکھئے تو راہ پر کینہ مکر انھیں لاتا ہوں میں  
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں  
غدر میرے قتل کرنے میں وہ اب لاویں گے کیا

حاشیہ گذشتہ صفحہ کا: مرزا صاحب کو ایک دفعہ زندان میں لگی جلتا پڑا۔ رہائی کے دن جب وہ چلنے لگے اور  
باس تبدیل کوئے کا سر کھنک آیا تو گردن وہیں پھاڑ کر پہنکا اور یہ شعر پڑھا ہے  
حیف اس چار گریہ کپڑے کی قسمت غالب جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریہاں ہونا

چارہ سازوں نے جو نچروں باندھ لیا ہوں یہی ہے یہی بہانِ وحشت کا دوا یوں سہی  
ہو نہیں سکتا جو کوئی اور چارہ یوں سہی گر کیا نامح نے مجھ کو قید اچھایوں سہی

یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا  
ہتھکڑی اور طوق گردن گیر سے چاٹینگے کیوں خوگر ایذا میں ہم تعزیر سے بھاگیں گے کیوں  
اس مناسب چارہ وندیم سے بھاگیں گے کیوں خاندازِ زلف میں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں  
ہیں گرفتار و فائزِ نذاں سے گھبرائیں گے کیا

یوں تو ہے یہ شہر اک منزل گہہ عشرتِ اسد ہر طرف ہے عیش کے سامان کی کثرتِ اسد  
پیش ہے بایں ہمہ مرزا کو یہ دقتِ اسد ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفتِ اسد

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھاویں گے کیا

لے مرزا غالب نے یہ نہیں کہ یہ غول کہی ہوگی مگر مقطع کے مصرعہ ثانی کا مضمون مندرجہ تحت خط سے وابستہ نظر آتا ہے جب  
کہ وہ مصائب و فکد سستی کا شمار ہو کر دلی کو خیر باد کہے کا ارادہ کر چکے تھے فرماتے ہیں :-

”خوشی بجزِ تم میں مشترک ہے تنہے مجھے تنہیت دی تو مبارک و میں نے تمہیں تنہیت دی تو مناسب الحمد للہ الشکر  
بجائی پر تو یوں ہے کہ ان دنوں میں میرے پاس ٹکٹ نہیں اگر بزرگدہجوں تو کہاں رہا نہ اٹھ نہیں سکتا ڈاک گھونٹک جائے کوں؟  
اپنا مقصود تھا کہ والدہ ماجدہ سے اور تمہاری جدہ ماجدہ اور تمہارے غمِ عالی مقدس کے کہ چکا ہوں، خلاصہ یہ کہ میری بیوی اور  
بچوں کو کہ یہ پہلری قوم کے ہیں مجھ سے ملے لو میں اب اس وجہ کا تحمل نہیں ہو سکتا، معیوں نے بھی بشرطِ ان لوگوں کے دوبارہ  
جانے کے اس خواہش کو قبول کر لیا میرا مقصد سیاحت کا ہے، فیشن اگر کھل جائیگی تو وہ اپنے مرف میں لایا کروں گا جہاں ہی لگا  
وہاں رہ گیا۔ جہاں سے دل اکٹھ گیا چل دیا۔ مگر مرزا غالب صاحب نے اپنے خاندانی وقار کا پورا خیال خاطر رکھتے ہوئے دلی  
چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا اور وہ دلی سے ماہرنگے جیسا کہ ایک خطِ بنامِ حکیم غلام نجف خاں میں لکھے ہیں۔ بجائی میرا  
دکھ سنو، پٹیا لے جانے میں ایک سبکی اور ذلت تھی۔“

ہمیں اس کی بزم میں اگر اذن بار ہوتا      دل غم زدہ نہ غم سے کبھی رشتہ کار ہوتا  
شب و روز وقفِ حرواں یہ امیدوار ہوتا      یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا  
اگر اوجھٹے رہتے یہی انتظار ہوتا

ہمیں پیشتر عیاں تھا ترا وعدہ پر نہ آنا      بس ابل ورجھوٹ کہہ کر ہے بحثِ فقیرین لانا  
نہ کر اب یہ غدر بجا نہ تراش کچھ بہانا      ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان چھو جانا  
کہ خوشی سے مرنے جاتے اگر اعتبار ہوتا

یہ شکستِ عہدِ الفت ہے مقامِ حیرت افزا      کہ نہیں یہ کام ہرگز کسی تجھ سے نازنین کا  
مگر مستقدر تو کھولا مرے دل نے یہ معما      تری ناز کی سے جانا کہ بندھا تھا عہدِ بودا  
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

ترے ناکِ تم پر دل و جان فدا ہیں اب تو      کہ نہ کال دیں انھوں نے مری حسرتیں تھیں جو جو  
جو ملا ہے لطف کاوش وہ زبانِ گویا بیان ہو      کوئی میرے دل سے پوچھے کسے تیرے کش کو  
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ نقطہ مرا ہی دل تھا یہ میرا ہی تھا طبعِ بنا      ہزار صبر و تمکینِ سمعی آفتوں کو حبیبِ بنا  
کسی کو یہ میں کہاں ہے مرنے سوزِ غم کا یارا      رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمنا  
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شہار ہوتا

یہ عجیب بات کی ہے کہ بنے ہیں دوست نامح  
یہ انوکھی دل لگی ہے کہ بنے ہیں دوست نامح  
کوئی چال یہ نئی ہے کہ بنے ہیں دوست نامح  
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

ہوا ضبط چارہ گر کو کہ تو تم سے مشتعل ہے  
نہیں دل کا کوئی چارہ جو غم سے مضمحل ہے  
نہیں سہل غم سے چھٹنا یہ شریک اب گل ہے  
غم اگر چہ جانگسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے  
غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

نہیں شب ہی جھکو بجاری کہ دن اس بھی سولے  
وہ بلائے جانگسل ہے تو یہ دلوں جاں گزائے  
کبھی جاں لبوں پر لائی کبھی دم نکل گیا ہے  
کہوں کس سے میں کہ کیا شب غم بری بلے  
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہیں تھا جو شوق جلوہ تو قصور فہم کا تھا  
ہے مقام شکر لیکن کہ خدا نے پردہ رکھا  
رہی شرم اپنی ورنہ کسے تھا نظر کا یارا  
اے کون دیکھ سکتا کہ ریگانہ ہے وہ یکتا  
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہ کسی پر اپنا مرنا ہوا کھیل دوستوں کا  
کہ لگا دیا ہے سب نے سر قبر ایک میل  
لگے اپنی جان سے ہم انھیں ہو گیا تماشا  
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں غرق دریا  
نہ کبھی جنازہ اٹھنا نہ کہیں مزار ہوتا

ہوئی معرفت میں گویا جو تری زبان غالب  
تو سمجھ گیا ہے مزار جو ہے تیری شان غالب  
کوئی باب بھی تجھ سے کیونکر ہے بولگان غالب  
یہ مسائلِ نصوص یہ ترا بیان غالب  
لے ماشیہ اعلا صفر

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بارہ خوار ہوتا

۱۳

بشر کرتا ہے بیجا ادعا کیا یہ کر سکتا ہے ترک مدعا کیا  
اسے تو دھن ہے ہوگا کیا ہوا کیا ہوئیں کو بے نشاط کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو بھینے کا مزا کیا

نہیں سمجھے ہو اب تک ماجرا کیا کہا کیا ہم نے اور تم نے سنا کیا  
مآل آخر ہے استقام کا کیا تجاہل پیشگی سے مدعا کیا

کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

عدو پر لطف دونا دیکھتا ہوں روابط بھی زیادہ دیکھتا ہوں  
مدارا میں اضافہ دیکھتا ہوں نواز شہائے بیجا دیکھتا ہوں

شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا

بھنور ہیں نغمہ پردازانا لبحر عیاں موجوں سے آوازانا لبحر  
صبا بھر کو نازانا لبحر دل ہر قطرہ ہے سازانا لبحر

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ذرا اس بے زبان دل کی صدا سن کچھ اپنی قدر دانی کا گلہ سن

حاشیہ گزشتہ صفحہ کا: ظفر بادشاہ نے قطع سنا تو کہا کہ ہم تو اس وقت بھی نہ سمجھتے، قاتب نے کہا حضور تعالیٰ ہی لیا  
ہی سمجھتے ہیں یہ اسلئے ارشاد ہوا کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔ ۱۴

یہ محل بے بہا کہتا ہے کیا سن      سن بے غارت گر جنس وفا سن  
شکست قیمت دل کی صد کیا

ہوائے سنبل و سوسن نہیں ہے      طبیعت مائل گلشن نہیں ہے  
لسائیں کیا یہاں دامن نہیں ہے      دماغ عطسہ پیراہن نہیں ہے  
غم آوارگی ہائے صد کیا

کیا ہے کیوں جفا کاری کا دعویٰ      جتنا یا کیوں تم گاری کا دعویٰ  
تجھے کیوں ہے دل آزاری کا دعویٰ      کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ  
شکیب خاطر عاشق بھلا کیا

ابھی تک مئے کہاں ساقی نے دیا ہے      مگر حالت کمال نشہ کی ہے  
کسی کی چشم میگوں دیکھ لی ہے      نفس موج محیط بخودی ہے  
تفاطل ہائے ساقی کا گلہ کیا

عبث دشمن کو جلوسے کی ہوس ہے      کہ اس کو اک نگاہ گرم بس ہے  
اسے کیا سوزش پہاں سے مس ہے      فروغ شعلہ رخس یک نفس ہے  
ہوس کو پاس ناموس وفا کیا

کبھی تو جو ہر تیغ نظر دیکھ      پھر اپنے جاں نثاروں کے جگر دیکھ  
نہیں الزام تجھ پر بے خطر دیکھ      مابا کیا ہے میں ضامن احمق دیکھ  
شہیدان نگہ کا خوں بہا کیا



اس اپنی آرزو پر مرثا ہوں      کر نصب العین چشم سرمہ سا ہوں  
 ہم تن شوق نظر را ہوا ہوں      نگاہ بے جا با چاہتا ہوں  
 تغافل ہائے تمکین آزمایا

یہ ذکر جلوہ فردا کیا کیوں      ابھی سے کر دیا محشر پیا کیوں  
 تغافل اس قدر رکھا روا کیوں      یہ قاتل وعدہ صبر آزمایوں  
 یہ کافرستہ طاقت ربایا

کہے کیا کوئی اس کی بات پر بات      کہ ہے افسوں و جادو سرسربات  
 نہیں ہے کوئی مرزا بے اثر بات      بلائے جاں ہے غالب سگی ہر بات  
 عمارت کیا اشارت کیا ادا کیا

۱۵

کون کہتا ہے کوئی عاشق شیدا نہ ہوا      ہاں یہ دعویٰ ہے کہ ہم سا کوئی ہو گا نہ ہوا  
 اپنی یکتائی کا دعویٰ ہمیں بے جا نہ ہوا      درخور قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا  
 پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

ہم سے رکھیں نہ یہ امید کبھی اہل کرم      بند ہے در تو کریں طوف صدا دیں پیہم  
 زعم ہے غریب یاں فقر و غنا پر ہر دم      بندگی میں بھی وہ آزاد و خود ہیں کہ ہم  
 اگلے پھر آئے دیر کعبہ اگر وا نہ ہوا

حسن کا تیرے زمانے میں ہے سکہ ایسا      سلنے ماہ میں کوئی گھڑی جم دسکا  
ہ شرم سے ہر چہاں تاب بھی ہے رو بقفا      سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکنائی کا

رو برو کوئی بت آئی نہ سیمانہ ہوا

کب تری آنکھ کے بیمارے پہا ہا درماں      کب ہوا چارہ گروں سے دوا کا خواہاں  
چشم بد دور اسے ہے یہ مرض راحتِ جاں      کم نہیں نازش ہمنامی چشمِ خواہاں

تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

کیا فغاں ہے وہ فغاں جس سے کوئی دل نہ ہلا      کیا کہیں آہ پھر اس آہ کو جو ہونہ رسا  
ہے وہ فریادِ عبث جس سے کوئی گھر نہ جلا      سینے کا داغ ہے وہ نازک لب بنگ گیا

خاک کا زرق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

جھیلتا ہوں جو شب و روز غم و بچ و بلا      یہی مقصود تھا شاید کہ میری خلقت کا  
کوئی حرماں زدہ کیا روزِ ازل اور نہ تھا      نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا

کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ ہر پانہ ہوا

سن کے ذکر پیشِ قلب رہے صبر کی تاب      داستانِ شبِ غم اور نہ اڑے آنکھوں سے خواب  
سوز دل کا ہو بیاں اور گلبرہ ہونہ کباب      ہر تین سے دم ذکر نہ ٹپکے خوں ناب

جزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچانہ ہوا

جرمے میں نہ ہو جلوہ میمانہ و مل      ذرہ ذرہ میں نہ ہو سیرِ بیاباں و سبل  
غنیہ گل میں نہ آجائے نظر گلشن و گل      قطرہ میں دھلا دکھائی نہ دے اوڑھڑوں گل

کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہ بینا نہ ہوا  
مدتوں خط و کتابت رہی مگر اس سے تب کہیں قتل کا اقرار کیا تا تلے  
آج کچھ قتل کے سامان بھی قتل میں ہوئے تھی خبر گرم کر غالب کے اڑیں غمے پوزے  
دیکھنے ہم بھی گئے تھے یہ تماشا نہ ہوا

۱۶

بجا ہے تم کرو جو کچھ گلہ اپنے فدائی کا ادا اس سے نہ کچھ بھی ہو سکا حق آشنائی کا  
نہ پہونچا بزم تک تو غم ہے بید و پائی کا پئے نذرِ کرم تجھ ہے شرم نارسائی کا  
بچوں غلطیہ صدرنگ دعویٰ پارسائی کا

ابھی تک تو رہا پردہ تمہاری خوش دانی کا نہ ہو جائے کہیں دنیا میں شہرہ دلربائی کا  
کسی دن رنگ لائے گا یہ لپکا خود نمائی کا نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا یوفائی کا  
بہ مہر صدر نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

ترے نور و ضیاء سے فیض ہر وہ ماہ کو پہونچا مگر حسرت کش اک میں ہی رہا تیری تمکلی کا  
ترے در پر جو سائل اُگیا خالی نہیں جاتا زکوٰۃ حسن دے لئے پیش کش کر جہر آسا  
چراغ خانہ درویش ہو کا سہ گدائی کا

ہمیں تو یہ تمنا تھی کہ سر ہو اور ترا خنجر سرِ مقتل کہا کس نے کہ لے قاتل رعایت کر  
یقیناً تجھ سے ہو گی باز پرس اسکی سرِ مختار نہ مارا جان کر بے جرم غافل تیری گردن پر

رہا مانند خون بے گنہ حق آشنائی کا  
 ۱۔ محمد الشجب سے شیوہ طی سانی ہے      نہ قصہ درد کا بپرنہ کچھ غم کی کہانی ہے  
 خموشی میں بسر ہوتی ہے اجمی زندگانی ہے      تمنائے زباں محو سپاس بے زبانی ہے  
 شاجس سے تقاضا شکوہ بے دست و پائی کا  
 مرے زخموں کی صورت سے جو مٹی ہر طور گل ہے      اسی صورت کا صدقہ ہے کفر و قیمت گل ہے  
 مرے ہی خوں شدہ دل کا تصدق حمرت گل ہے      وہی اک بات ہے جو یافنس اں نکہت گل ہے  
 بچن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا  
 وفاداروں سے بھی تو نے جو بد عہدی کی ٹھہرائی      شکایت بے دہن لوگوں کے لب تک بھی تری آئی  
 حسینوں سے زبان طعن آخر تو نے کھلوائی      دہان ہر بت پیغارہ جو زنجیر رسوائی  
 عدم تک بیوفہ چاہے تیری بے وفائی کا  
 نہ ہو گا ختم نامہ یوں تو چاہے جس قدر رکھ دے      پڑھے گا کون تو دفتر کے دفتر بھی اگر رکھ دے  
 مناسب ہے کہ مرزا کی طرح مصرع تر رکھ دے      نہ دے نامہ کو اتنا طول غالب مختصر رکھ دے  
 کہ حسرت سبج ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا

چپ رہے تو اس کو راحت کا گناں ہو جائیگا      جو گلہ دل کو ہے دل ہی میں نہاں رہ جائیگا  
 جو بیاں سے مدعا ہے رائیگاں ہو جائیگا      گرد اندوہ وقت بیاں ہو جائے گا

بے تکلف داغِ مہرِ دہان ہو جائے گا  
 بہت غم ہے بیچ بول کو کربِ اضطراب  
 ہے شبِ مریں طبیعت کو بلا کا بیچ و تاب  
 رو مدد سکیں کہیں پیدا نہ کرے ماہِ تاب  
 زہرہ گرا سیسا ہی شامِ بحر میں ہوتا ہے آب  
 پر تو مہتابِ سیلِ خانماں ہو جائے گا

مراست میں ہے کس انداز سے وہ سبکبر  
 عاجبِ نیم ورجا میں ہوں یہ حالت کچھ فکر  
 سو رہا ہے مست مہیا ہے جوانی بے خبر  
 لے تولوں سوتے میں اسکے پاؤں کا بو نہ کر  
 ایسی باتوں سے وہ کافرِ دگماں ہو جائے گا

اگر دعویٰ ابتدا میں تھا بہت کچھ عشق کا  
 کچھ جب اس سے لڑی سب جو صلہ جاتا ہا  
 عمر بھر الفت نہا میں گے یہ اپنا قصد تھا  
 دل کو ہم صرف وفا تجھے تھے کیا معلوم تھا  
 یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

مری مرضی سے ہے وابستہ زمانے کی ضیا  
 نے چاہا جس کو مقبولِ دو عالم کر دیا  
 اس سے دنیا پھر گئی تو جس سونا خوش ہو گیا  
 سبک دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا  
 مجھ پہ گویا اک زمانہ چہرِ پاں ہو جائے گا

جو مجھ کو فرطِ غم میں لیں ہی خوں رنے کا خط  
 اور گھٹنے میں رہا یوں ہی جگر اور دل کو ربط  
 یں نہ ہو جائیگے دونوں کے دونوں و خط  
 گزر گاہ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط  
 شعلہ خس میں جیسے خوں لگ میں نہاں ہو جائے گا

کچھ کرنا لاں مجھے مرغِ چین میں نوہر گر  
 وچائیں چاک چاک سگم سرخسوں کے بگر  
 میری حالت پر کیفِ افسوس میں برگِ شجر  
 باغ میں مجھ کو نہ لے جاوے میرے حال پر  
 مگر تیرا کھشم خوں فشار ہو جائے گا

منتظر میں بھی ہوں فوائے قیامت لائے تو      اپنی اپنی دوا اسی دن پائیں گے انصاف جو  
 اک بڑی امید پر جمیلا ہے تیرے ظلم کو      وائے گر میرا ترا انصاف عشرت میں نہ ہو  
 اب تلک تو یہ توقع تھی کرواں ہو جائیگا  
 باد رکھ سننے کے قابل پذیر مرزا ہے اسد      ہوش میں آکیا ہوا دل کس کو دیتا ہر اسد  
 بتلا اک طفل پر ہونا کچھ اچھا ہے اسد      فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد  
 دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا

یوں تو میرا علاج کیسا نہ ہوا      کم مرض ہے مگر خرا نہ ہوا  
 مجھ پر احساں طیب کا نہ ہوا      درد منت کش دوا نہ ہوا  
 میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا  
 ہو گے رسوا تمہیں کہا مانو      بات بڑھ جائے گی بہت یوں تو  
 چل کے سن لو الگ جو سنتے ہو      جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو  
 اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

اس غزل کے متعلق مرزا غالب نے مرزا غلام علی قہر کو لکھا ہے :-

میرا کلام میسے پاس کبھی نہیں رہا، ضیاء الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے جو میں سے کہ انہوں نے  
 لکھ لیا، ان دونوں کے گھر لٹ گئے ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہوئے، اب میں اپنے کلام کو دیکھنے کو نرسا  
 ہوں، کئی دن ہوئے ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور غمر پر داز بھی ہے ایک غزل میری کہیں سے نکھو  
 لیا، اس نے وہ کافرو مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا، غزل تم کو بھیضا ہوں اور صد میں اس کے اس خط  
 کا جواب چاہتا ہوں، اور خط کے ساتھ مندرجہ بالا غزل بھیجی تھی ”درد منت کش دوا نہ ہوا، ۱۸“ ..

اور تجھ ساحسیں کہاں سے لائیں      حسرت دل کی دلوں سے پائیں  
کس کے ہاتھوں سے زخم دل کھائیں      ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں  
تو ہی جب خنجر آزمائے ہوا

سخن تلخ کب ہے ان کے قریب      ان سے باتیں سننے یہ کس کے نصیب  
ہے ملاوت ہی کچھ سخن میں عجیب      کتنے شیریں ہیں تیرے لب کے قریب  
گالیاں کھاکے بے مزا نہ ہوا

جب ہیں دھن تھی انکے لانے کی      استطاعت تھی گھر سجانے کی  
اب جو بدلی ہوا زمانے کی      ہے خبر گرم ان کے آنے کی  
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

جان طاعت ہی میں کھپائی تھی      کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی  
سر تھا سہمہ تھا جہ سائی تھی      کیا وہ نمرود کی خدائی تھی  
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

قابل فخر کیا ہے بات اپنی      عین احسان ہے اسکی خوشنودی  
ہم نے اس پر نثار کیا شئے کی      جان دی، دی ہوئی اسی کی مٹی  
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غم سے خالی نہ کوئی دم گذرا      کیا ٹھکانہ ہے کم نصیبی کا  
کچھ نہ کچھ سلسلہ لگا ہی رہا      زخم گر دب گیا ابھونہ تمنا

کام گرگز گیا روا نہ ہوا  
 ۱۰ دعوے دوستی زبانی ہے دل میں تو دشمنی کی ٹھانی ہے  
 قہر ہے یا یہ مہربانی ہے رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے  
 لے کے دل دستان روا نہ ہوا  
 مثل مرزا ممر وہ رہتے ہیں جی میں گھٹ گھٹ کے پھوٹتے ہیں  
 سب غم انتظار رہتے ہیں کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں  
 آج عنالرب غزل سرائے ہوا

یہی ہمیشہ نشیمن رہا تمنا کا رہا ہے درد اسی میں تمام دنیا کا  
 مگر ہے اب اسے درکار پہن صحرا کا گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا  
 گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا  
 ترا خیال و تصور جو دل کو ہے محبوب اسی سے نامہ نویسی کا شغل ہر مغرب  
 مجھے امید کرم اور تجھ سے ہو کیا خوب یہ جانتا ہوں کہ تو اور پانچ مکتوب  
 مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا  
 نہ ہونگے گل روش روزگار اگر کو یہی پسے گا زیر قدم سبزہ زار اگر ہے یہی  
 لٹے گا دہر کا نقش و نگار اگر ہے یہی خانے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی  
 دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا  
 ہنسی کا خاک بلیقہ نہیں کسی گل کو کہیں یہ سیر و تماشا نہ رخ افزا ہو



جمن کا قصد ہے یا رو تو مجھ کو ساتھ نہ لو غم فراق میں تکلیف میرا غنہ دو

مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے سبیا کا

مثال آئینہ حیرت زدہ سراپا ہوں امید وار تجسلی روح افزا ہوں

رہیں شوق ہوں سترتا ہوا تنہا ہوں ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں

کر رہے ہیں مو کا مچشم بینا کا

اب اور کیسے کہ انداز اس ستم گر کے دم نظارہ طلب گار جسے میں ہم سے

اشارہ جان کا ہو گا تو یہ بھی روٹ دینگے دل اسکو پہلے ہی ناز واداسے دے بیٹھے

ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

مے سرشک کا انداز سخت مشکل ہے کہ قطرہ قطرہ میں پوشیدہ بحرِ کامل ہے

حساب کا کوئی دعویٰ کیسے تو باطل ہے نہ کہہ کر گریہ بر انداز حسرتِ دل ہے

مری نگاہ میں ہے جمع خرچ دریا کا

ستم جو اسکے اٹھاتا ہوں لہرِ شاد آسند نہیں کسی سے طلب گارِ عدل داد آسند

نہ مجھ سے اس کو نہ مرزا سے غدا آسند فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اسکو یاد آسند

جفا میں اس کی ہے انداز کار فرما کا

اس نے جبِ خست پے رقعہ منازل باندھا چھیرے ناو مے گھر کے مقابل باندھا

مے نے کھڑے ہونے سے کٹا باندھا جب بتوقیب سفہ یار نے محل باندھا

تپش شوق نے ہر ذرہ اک دل باندھا  
قتل کر دیے نہیں عشوہ تھا بڑا دست راز  
بانی قتل کرشمہ تھا نگہ تھی غماز  
دیکھ کر آئینہ مجب ہو گئے قتال انداز  
اہل بندیش نے ہجرت کدہ شوخی ناز  
جو ہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا

منہ ہی جس کا نہ کبھی عرض تمنائیں کھلا  
اس کو حیراں کے سوا اور یہاں کیا ملتا  
کام کچھ سہل نہیں تھا طلب مقصد کا  
یاس و امید نے یک عہدہ میلہ مانگا  
عجز ہمت نے ظلم دل سائل باندھا

اس بیاباں میں حیراں دل غروں غالب  
حال تیرا ہے جس میں دگرگوں غالب  
ہو گیا فکر مضامین میں جگرخوں غالب  
زہندے تشنگی ذوق کے سفھوں غالب  
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

اگر میں صورت قطرہ دریا سے جدا ہوتا  
تو کیوں درویشِ قصہ بحث ہست و کا ہوتا  
مگر ہاں نفی سے اثبات پیدا بر ملا ہوتا  
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا  
ڈر لویا مجھ کو ہونے نے نہ ہونے میں تو کیا ہوتا

دل بیمار تو فکر و فائیں گھل گیا اپنا  
جگر باقی رہا تھا اکو دردِ عشق نے کھایا  
جھا کا بارالم سے فرق یوں پہرہ نہیں ٹھنڈا  
ہو اجب غم سے محسوس تو غم کیا سرکھنے کا

نہ ہوتا اگر جداتن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

اسی کی یاد میں آٹھوں پہر دل تملتا ہے      تصور اس کا مزارات دن دگھو کھاتا ہے  
خیال اکا بھلا کب طرغٹگیں سے جاتا ہے      ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے  
وہ ہر اک بات کہنا کہیوں ہوتا تو کیا ہوتا

۲۲

کب کوئی باعث خونباری شرکاں سمجھا      کب کوئی علت آہ شرر افشاں سمجھا  
کوئی غم خوار نہ حال دل نالاں سمجھا      وہ مری چین جبین سے غم پنہاں سمجھا  
راز مکتوب بربے ربطی عنوان سمجھا  
لوث دنیا سے مکد ہے مرا سینہ ہنوز      دل میں باقی ہے ابھی کلفت دیر نہ ہنوز  
خاک بھی شکل صفائی نظر آئی نہ ہنوز      یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز  
چاک کرتا ہوں میں جب سے گر گیاں سمجھا

حاشیہ گذشتہ صفحہ کا: حس تخلیق عالم نہیں ہوئی تھی تب ہی خدا موجود تھا اور اگر کائنات پیدا نہ ہوتی تب بھی خدا ضرور ہر جگہ موجود ہوتا۔ اگر میں پیدا نہ کیا جاتا تو میرا وجود بھی خدا کے وجود میں غم ہوتا یعنی میری ہستی ہی میری بربادی کا باعث ہوتی۔ ”مستی ہی تھی تھی۔“ اس شعر کی شرح خود غالب صاحب ماسٹر پڑھائے لالہ شوبک ظفر اس طرح کی: پہلے یہ گھنا چاہیے کہ ”آئینہ عمارت فولاد کے آئینے سے ہے ورنہ جلجلی آئینوں میں جو مر کہاں اور انکو قتل کون کرتا ہے فولاد کی جس پیر کو قتل کر دے گا شہرہ پہلے ایک لکیر پڑے گی اسکو الف صیقل کہتے ہیں جب یہ مقدمہ معلوم ہوا تو اس میں غہوم کو سمجھنے معرغہ چاک کرتا ہوں میں جب کہ گر گیاں سمجھا“ یعنی ابتدائی سیرت سے مشتق جنون ہے رنگ کمال فن حاصل نہیں ہوا آئینہ تمام صاف نہیں ہو گیا اس ایک لکیر صقل کی جو ہے سب سے چاک کی صورت الف کی سی ہوتی ہے اور چاک حسب اثر جنوں میں سے ہے۔“

حزن و اندوہ میں ناچاری خاطر مت پوچھ      زیست سے باعث پیناری خاطر مت پوچھ  
 حال دشواری و بیماری خاطر مت پوچھ      شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ  
 اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

کب یہ منظور ہے وہ علوہ غاہو سرِ بام      کب گوارا ہے کہ وہ رخ ہو نظر گاہ عوام  
 چاہتا ہوں رہے مستور وہ شوخ خود کام      بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرم خرام  
 رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدہ حیراں سمجھا

چھپر کر غیر نے اس کو جو غضب ناک کیا      آگ ہو کر صفتِ شعلہ آتش بھڑکا  
 باعث طیش تو اعیار کا سفلہ بن تھا      تجر سے اپنے یہ جانا کہ وہ بد خو ہو گا  
 بنضِ خس سے پیشِ شعلہ سوزاں سمجھا

قطع منزل کے لئے میں نے کمر توہ باندھی      پر نقاہت سے اجازت پئے رفتار نہ دی  
 نوبت نہ آئی تھی دوا ایک قدم چلنے کی      سفر عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی  
 ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

کوئی پہلو بھی تو نہ بچنے کا نہیں تھا دم مرگ      نشتر آخر رگ جاں نے وہی کھایا دم مرگ  
 پیش آیا وہی تقدیر کا کھاد دم مرگ      تھا اگر یزداں مژدہ یار سے دل تادم مرگ  
 دفع پر کانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

یوں تو تم بھی اسے کہتے تھے جفا کا راستہ      پھر بھی مژدے تھا کیا تمہیں ہیشیا راستہ  
 کیوں ہوئے دیدہ و دانستہ گرفتار راستہ      دل دیا جان کے کیوں اسکو و فادلا راستہ

غلطی کی کرچو کا فر کو مسلمان سمجھا

۲۳

پھر مجھے یار کا در یاد آیا    اپنا پھوٹا ہوا سر یاد آیا  
پھر وہی خون جگر یاد آیا    پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا  
دل جگر تشنہ فر یاد آیا

تھا تراب کبر عذاب جہاں سوز    لفظ رخصت تھا سناں دلدوز  
پھر نصیبوں نے دکھایا یہ روز    دم یا تھا نہ قیامت نے ہنوز  
پھر ترا وقت سفر یاد آیا

جب ملا آنکھ پھر الی اپنی    نظرِ لطف کسی دن نہ ہوئی  
کی نہ اک روز تغافل میں کسی    سادگی ہائے تمنا یعنی  
پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا

کیوں نہ فر یاد مجھے ہو مشکل    آجے منہ میں ہیں سینہ گستاخ  
میں کہاں آہ و نغاں کے قابل    عذر و اماندگی اے حسرتِ دل  
نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

بستجو گر نہ تری کی جاتی    یہ مصیبت ہی نہ جھیلی جاتی  
جان کیوں مفت میں اپنی جاتی    زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی

کیوں ترا راہ گذر یاد آیا  
 ماننا ہوں وہ جگہ ہے اچھی ہیں وہاں عیش کے سامان سبھی  
 کیا کروں گا جو طبیعت نہ لگی کیسا ہی رضوان سے لڑائی ہوگی  
 گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

اب کہاں ضعف سے یالائے فغاں آہ کی تاب نہ تانوں کی توار  
 جی نذر تا ہے جو ہلنی ہے زباں آہ وہ جسراتِ فریاد کہاں  
 دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

دل میں رہ رہ کے جو آتا ہے خیال کیا بلا دیکھئے لاتبہ خیال  
 پھر مجھے غم میں پھنسا تا ہے خیال پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال  
 دل گم گشتہ مگر یاد آیا

قدر مسکن کی ابھی جانی ہے یہی اس میں بھی پریشانی ہے  
 یہ ہے بے مثل وہ لاشانی ہے کوئی ویرانی سی ویرانی ہے  
 دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

خاک ابھی میں نے کہاں چھانی ہے دل دھڑکتا ہے پریشانی ہے  
 فرط ہیبت سے جگر پانی ہے کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

۱۔ اسی مضمون کا ایک شعر تو میں نے بھی کہا ہے۔ جیس دشت میں سونے سحر اکبوں؟ کم ہیں ایسے گھر کی  
 ویرانی۔ اسی طرح کا ایک شعر قابل مطالعہ ہے۔

یاد آیا مجھے گھر دیکھ دشت دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا  
 قاتل اس کا ہے ہر افساں شاید کہ بدی کی ہے مکافات بھی بد  
 جرم ہوئے کو تھا مرزا سرزد میں نے مجنوں پر لڑکپن میں اسد  
 سنگ اٹھا یا تھا کہ سر یاد آیا

آپ کے ساتھ کوئی دشمن بے بیر بھی تھا  
 سست رفتار کوئی از رہ تزویر بھی تھا  
 دیر کرنے میں کوئی مائل تدبیر بھی تھا  
 ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا  
 آپ آتے تھے مگر کوئی عنایاں بھی تھا

تم نے جو کام کیا غیر مشیت نہ کیا  
 تھا مقدر جو مرے واسطے ہونا وہ ہوا  
 دوں جو تنہا نہیں الزام تو کہ ہم ہی خطا  
 تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا  
 اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا

شاہد حال ہے ہر چند مرا حال زبوں  
 سخت حیراں ہوں کہ کیوں کر تجھے آگاہ کروں  
 کچھ خبر بھی ہے کہ میں عاشق دیرینہ ہوں  
 تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں  
 کبھی فراق میں تیرے کوئی بچیر بھی تھا

مجھ سے کہتا ہے کہ تو کون ہے کیا بتلا دوں  
 عاشق زار ہوں کیا اسکے سوا بتلا دوں  
 نہ رہا ہوں جو تجھے یاد تو آ بتلا دوں  
 تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں

کبھی فراق میں تیرے کوئی پتھر بھی تھا

حد سے گزری ہوئی تھی چارہ گروں کی بیداد بھول کر بھی تو نہ لب پر کبھی لایا فریاد  
دل پریشانیوں میں بھی تو رہا خرم و شاد قید میں ہے تیرے وحشی کو وہی زلف کی یا

ہاں کچھ اک رنج گرا نباری رنج بھی تھا

محمل یار میں اللہ رے اس کا غزا حق تو یہ ہے کہ بڑے بول کا سہہ نیچ  
خوش ہوں اس سے کہ اثر کچھ تو ہوا اہول کا دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈ

نار کرتا تھا ولے طالب تاثیر بھی تھا

وصل شیریں سے وہ گوہر نہ سکا شیریں کا کر گیا کام تو ایسا کہ رہا نام مدا  
کہتے ہیں سنگ تراشی کو جو آپ ادنیٰ کام پیشے میں عیب نہیں رکھتے نہ فریاد کونا

ہم ہی آشفۃ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

سینہ زانو سے جو اس نے نہ دبایا نہ سہی خنجر تیز گلے پر نہ چلا یا نہ سہ  
ہاتھ شمشیر کا بڑھ کر نہ لگایا نہ سہی ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہ

آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

ہم پہ فائق جو سمجھتے تھے کبھی اپنا حق ان کو یہ خفیہ نویسی کا ملا کیسا  
ان کی تحریر کو کیوں ماننے سرتا پاختی بکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے نکھر پڑا

آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

رکھتے تھے دیدہ دیدار طلب شوق بہتا پھر تو دیکھا تو مجھے دید کا یار ہی نہ تھا



ہلوہ دیکھا بھی مگر دل کا نہ ارماں نکلا ۔ بھلی اک کو نہ گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہیں لب تشنہ تھر رہی تھا

دی جو تشبیہ اسے ہر درخشاں سے کبھی آگ غصے سے ہوا چہرے کی رنگت بدلی

اس کی تمثیل ہی گویا کوئی دنیا میں نہ تھی یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی

گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

انکساری سے تو جو چاہو وہ کہلو غالب تم پہ دیکھا نہیں مرنے کسی کو غالب

کوئی دعوے سے ذرا آگے کہے تو غالب ریت کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب

کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

۲۵

دنیا میں کبھی کیا کوئی دل بر نہ ہوا تھا بدکیش و جفا پیشہ و کافر نہ ہوا تھا

سفاک مگر تیرے برابر نہ ہوا تھا تو دوست کسی کا بھی ستم گرد نہ ہوا تھا

اور وہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

قدرت جو لگی اور حسینوں کو بنانے اس کا کوئی ہمتا ہو نہ چاہا یہ خدا نے

پائی نہ تھی تکمیل ابھی نور و ضیائے چھوڑا مرغش کی طرح دستِ قضا نے

لے مرغش بادہ مصنوعی پاند جسکو حکیم ابن عطا مشہور ابن مقفع نے ادویاتِ مرکب سے تیار کیا تھا وہ پاند چاہ

نخشب سے نکلتا تھا اسکی روشنی زیادہ دوڑیکٹ جاتی تھی وہ اہل پاند کے برابر روش نہ تھا آخر کار کچھ عرصہ بعد شق

ہو گیا کارکنانِ قضا و قدر نے آفتاب بنا کر شروع کیا ابھی اسکی روشنی تیرے حس و جمال کے برابر نہ ہوئی تھی کہ اسکا حال بگا

۱۳۰۱ء تحشیب کی طرح ہوا

خوشید ہنوز اس کے برابر ہوا تھا

۱ کم درمیں سے نہیں کچھ اشک ہمارے آنسو نہ ہوئے ہوتے تو گوہر ہی بنتے

ہے مادہ تو ایک ہی ایجاد میں ان کے توفیق باندازہ ہمت ہے ازل سے

آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

درو سے عیاں خیر خو خوار کا عالم مست آنکھ مگر فتنہ بیدار کا عالم

ہو جس سے پیا حشر وہ رفتار کا عالم جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدر کا عالم

میں معترف فتنہ فتنہ ہوا تھا

قسمت یہ کہاں تھی کہ کبیدہ اسے دیکھوں آنکھوں سے طوں پاؤں خوشامد کے لئے لوں

برسوں سے تنہا تھی کروٹے تو مناؤں میں سادہ دل آزدگی یار سے خوش ہوں

یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا

لکھنے میں فرشتوں نے سمندر کو کیا خشک اک لمحہ قلم کو کبھی ہوئے نہ دیا خشک

عامی ہوں میں ایسا کہ قدم رکھتے ہی تنہا خشک دریا، معاصی تنک آبی سے ہوا خشک

میرا مرد امن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کیا سوز نہاں پر کسی آتش کو توفیق حاصل جو اس سے فوائد تھے نہیں قابل تفصیل

۲ سینہ تقاریر درہم و دینار کی زنجیل جاری تھی اسد داغ جگر سے مری تحصیل

۳ اے مرزا غائب صاحب ایک خط میں خواجہ غلام غوث یخبر کو تحریر فرماتے ہیں: پروم شد! اخصا نہیں ہوا کرتے۔ یوں

سننا مجھے باور نہ آیا یہاں تک تو میں مورد عتاب نہیں ہو سکتا: اسی خط کے آغاز میں یہ شعر تحریر فرمایا ہے

میں سادہ دل آزدگی یار سے خوش ہوں یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا

## آتش کدہ جاگیر سمندر نہ ہوا تھا

۲۶

میں کب فدائے خجرت تل نہیں رہا      کب تیغ نازیار کا بسمل نہیں ہا  
لیکن وہ مضطرب مجھے حاصل نہیں رہا      عوض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا  
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

دل میں بھرے ہیں لاکھ غم اس کے لیے ہوئے      پوچھو نہ سرگزشت کہ لب میں بیسے ہوئے  
آیا تھا میں بقا کا تہیتہ کئے ہوئے      جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لئے ہوئے  
ہوں شمع کشتہ درخور محفل نہیں رہا

دشمن تھے اس کے سامنے سبب سپر کہ میں      پھرتے تھے ہاتھ پر وہ لئے اپنا سر کہ میں  
اب غیر ہیں کہ جن سے پھر ہی بے نظر کہ میں      مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کہ میں  
شایان دست و بازوئے قابل نہیں رہا

یکساں گدا و شاہ سے پاں ساز باز ہے      محمود غزنوی کے برابر ایاز ہے  
دل صاف ہے کسی سے نہیں احتراز ہے      بر روئے شمش جہت در آئینہ باز ہے

سہ مزا عاقبت مٹی نہیں تھیر کوٹھنے ہیں افسوس ہے کہ تم کو میرے حال کی خبر نہیں اگر دیکھو تو ماورج  
میں دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا کوئی دم ایسا نہیں کہ تجھ کو دم واپس کا خیال نہ ہو۔ ساتھ میں کا ہو چکا  
ہوں اب کہاں تک جیوں گا غزل، ربابی، فارسی اور دوسری ہزار بیت کہ چکا اب کہاں تک کہوں گا۔ زندگی بڑی  
بھلی جس طرح بنی گئی اب فکر یہ ہے کہ دیکھئے موت کیسی ہوتی ہے اور بعد موت کیا پیش آتا ہے پھر لکھے ہیں ا  
سے عمر بھر دیکھا کہ مرنے کی راہ نہ مرنے پھر دیکھئے دکھ لائیں کیا۔ ۱۲

یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا  
 جب سے کھلا ہوا ہے تصویر میں باب حسن      پیش نظر ہے آٹھ پہر آفتاب حسن  
 اٹھا ہے درمیان سے گویا حجاب حسن      واکر دیتے ہیں شوق نے بند نقاب حسن  
 غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا  
 تھا صبح و شام درپے کس چرخ کج مدار      تھا غم سے وقف درد و غلش سینہ تھا فگار  
 دل تھا ہزار کاوش حراں سے بے قرار      گو میں رہا رہن ستم ہائے روزگار  
 لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا  
 خوننا بہ جگر سے سدا مثل باغباں      ہم سینچتے رہے تین الفبتِ بستاں  
 دیکھا مال کو تو تردد تھا رائیگاں      دل سے ہوائے کشت و فضا گئی کواں  
 حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا  
 یہ تیغ آزمائے تو حاضر ہے سرا سدا      کہینچے یہ تیرا اگر تو ہے سینہ سپر اسدا  
 مرزا ہوں کیل جاؤں گا میں جان پر اسدا      پیدا و عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدا  
 جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جس کو ہم سمجھتے تھے یارِ جہاں اپنا      ہو گیا وہی دشمن آہ ناگہاں اپنا  
 ہم نے اپنے ہاتھوں سے کر لیا زیاں اپنا      ذکر اس پری و ش کا اور پھر بیاں اپنا

بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

ان کو قلعی ہو سنا کی گئی میں اتنی کب پیٹتے تھے جو میرے ساتھ کرتے محفوظ تر لب  
ضد ہی کچھ مریض ان کو چڑھ گئی بیڈھب سنے وہ کبوں بہت پیٹتے نرم غیر میں یارب

آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

حال اضطراب دل کچھ اسے دکھا سکتے نار کے ذریعہ سے دکھ اسے سنا سکتے  
لطف اس کے جلوے کا دمیدم اٹھا سکتے منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے

عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

بستر اسکے کوچے میں اک طرف جمالیں گے جو کڑی پڑے گی اب شوق سے اٹھالیں گے  
اب تو اس سے ملنے کی راہ کچھ نکالیں گے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے

بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

دل میں بے کرٹنے کی خود ہی ان سے ٹھہراؤں سلسلہ کتابت کا درمیاں سے اٹھواؤں  
نامہ برے کیا ہو گا خود ہی ان کو کچھاؤں دروڑ لکھوں کب تک جاؤں انکو دکھاؤں

انگلیاں فکار اپنی خام خوں چکاں اپنا

ہو گیا ہوں جب عادی آستانے بھڑوں کا پھر نمی تو ہیں آخر ہوں گامیں جہیں فرسا  
پے بپے جرات اور دن بھر میں یہاں کرتا گھستے گھستے مٹ جاتا اپنے عبت بدلا

ننگ سجدہ سے میرے سنگ آستان اپنا

لاکھ اس کی محفل میں غیر کی رسائی ہو اب کسی برائی میں لب ذرا ہلائے تو

اس کے منہ سے کھلایا ہم کو کہنا تھا جو جو تاکے دغا بازی کر یا ہے دشمن کو  
دوست کی شکایت میں ہم نے ہزباں اپنا  
روز کے ستارے سے کر دیا ہے تنگ اسے جسے اب تو اسے مرزا بڑھکے رسم اس کے  
کہتے ہیں عداوت ہے اسکو ہر زور سے ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے  
بے سبب ہوا غالب دشمن آسمان اپنا

ظلم پر وہ عذر و حجت لائیں کیا غیر تاویل غلط فرمائیں کیا  
چھوڑ کر ایذا دہی شرمائیں کیا جوڑے باز آئے پر باز آئیں کیا  
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھائیں کیا  
جو مقدر ہے وہ ہو گا بے گناں پھر ہوں کیوں مصروف سعی راہیگاں  
ہیں امیدیں بھی جو قائم ہے جہاں رات دن گردش میں ہیں سات آسمان  
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرا ئیں کیا

۱۔ مرزا غالب ایک خط میں قائم علی تہر کو یورو تقریر فرماتے ہیں "میں نے کتابیں چلا کر بیچیں پسندیں پارساں ارسال  
کیں اگرچہ پہنچنے کی خبر باقی ہے مگر نوید کیس سے نہیں آئی حالات دن گردش آئے۔ دیکھا بھائی اس غول کا مطلع  
کیا ہے۔ جوڑے باز آئے پر باز آئیں کیا کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھائیں کیا۔ ۲  
۳۔ مرزا غالب نے ایک خط بنام مرزا ترمیگ مصنف "سلاطین برہان" لکھا ہے جس سے مرزا صاحب کی دماغی صلاحیت  
علییت اور تحقیق کا پورا اظہار ہوتا ہے لکھتے ہیں "کہہ چکا ہوں کہ نہ تجھ کو مناظرے کا دماغ نہ نجوم امراض جسمانی و آلاء  
روحانی سے فراغ، ہر گز ہمت نہیں ہاری تھی اور غیب سے توقع مدد گاری تھی اھلایا یہ شعراء و مدیسے درد زبان اور پاس  
(باقی ص ۴۶ پر)

صاف یوں بھی تو نہیں کہتے کہ جاؤ اور نہ یہ فردہ سناتے ہیں کہ آؤ  
 و تو اس بے نیازی کی بتاؤ لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ  
 جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

جب چلاقا صد تو ہم تھے ساتھ ساتھ تا درِ جانا نہ پہونچے ساتھ ساتھ  
 کب گئے تھے اس سے پہلے ساتھ ساتھ ہوئے کیوں نامدبر کے ساتھ ساتھ  
 یارب اپنے خط کو ہم پہونچائیں کیا

اس کے در پر ہم جو ہیں بستر جائے قتل کے در پہے ہیں سب اپنے پرانے  
 جس کو ہمت ہوا اٹھالے کی وہ آئے مونخوں سر سے گز رہی کیوں نہ جائے  
 آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

شوق ہی میں ہو گئی رستی تباہ جیتے جی دیکھی نہ اس کی جلوہ گاہ  
 مرے ہم موت کی حسرت میں آہ عمر بھر دیکھا کے مرے کی راہ  
 مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

یا تو خط لکھتے تھے ہم کو پلے بپلے یا تعافل سے کیا قصہ ہی طے  
 ہے تجاہل ان کا مزاح فرمائے پہونچتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے

(بقیہ ۲۵) : ہمارے میں رمزِ مستحِ فضاں رہتا تھا

رات دن گردشِ میں ہیں تہا آسمان : ہو رہے گا مجھ نہ کچھ گھر اُس کیا  
 ۱۔ نواب انوار الدین و سید الدین : ان شوق کو لکھتے ہیں "زندہ اندر دیا سارا تیر کا ہوں ساحلِ نزدیک ہے۔ دو  
 ہاتھ لگاے اور بیڑا پالے .. تر ہر دیکھا ... ۱۱۔ پھر فرما صاحبِ حق کو ایسا ہی لکھا "زندگی بری معلوم طرح  
 میں لانی۔ اب بیکر ہے کہ کبیں موت کیسے ہوتی ہے اور بعد موت کے کیا ہوئی آتا ہے ج عمر بھر دیکھا ... ۱۲۔ ۱۱

## کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

۲۹

شرط ہے اس کا ذرا جلوہ نما ہو جانا      پھر تو آساں ہے مجھے مٹو لقا ہو جانا  
راحتِ جزو نہیں کل سے جدا ہو جانا      عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

یا تو تھا مجھ سے محبت میں کبھی عہد ابد      اب ہے کس تفرقہ انداز کے باعثِ دو کہ  
ہو گیا ایک ہی چٹکی میں محبت کا رد      تجھ سے قسمت میں مری صورتِ فعلِ ابجد

تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

ہوتی تھی اس کے لئے فکر ہی صبح و شام      نہ ہوئی واشدگی اور نہ ہوا کچھ آرام  
بسکہ دریاں مخالف سے فنا تھا انجام      دل ہوا کش مکش چارہ زہمت میں تمام

مٹ گیا گھسنے میں اس عقد کا واپس جانا

جب تک ہم سے تعلق تھا اور اک طرح کی راہ      چیڑا اٹھایا کئے اور ظلم کئے خواطر خواہ  
دفعۃً پھر گئے کیوں آپ بتائیں تو گناہ      اس جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ

اس قدر دشمنِ ارباب وفا ہو جانا

خونِ اک آتش سیال مرے دلیں تھا      پانی ہو کہ دم گریہ جو فزہ بہر آیا  
فاک بھی تن میں بجز عنصرِ فاک نہ رہا      ضعف سے گریہ بدل بد دم سرد ہوا



باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

جلوہ گران میں تصور سے تیری مثال      مردم چشم کا آنکھوں سے نکلنا ہے محال  
جی میں جو بات کبھی دیکھے کس طرح نکال      دل سے سناتری انگشت خانی کا محال

ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

اپنی ہستی کو سر بزم جو کرتی ہے فنا      شمع نے مجھ سے دم گریہ یہ گھلتا سیکھا  
بیچ کن ہے مرا گریہ ہی مری ہستی کا      ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا  
رو تے روتے غم وقت میں فنا ہو جانا

سبزہ رکھتا ہے ترے پاؤں کے بوسے کی ہوس      گل کو بازار میں لائی ترے جلوے کی ہوس  
تجھ تک کس کو نہیں اٹکے پہنچنے کی ہوس      گر نہیں نگہت گل کو ترے کو پچے کی ہوس

کیوں ہے گردِ جو لانا صبا ہو جانا

جن کو رہتی ہے صفائی کی تمنا ہر پل      خواہش تصفیہ قلب میں وہ ہیں بیکل  
کر کے پہتا ہے ہر اک رنگ میں شوقِ پناہ      تاکہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے صیقل

دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

قابل دید ہے ہر ذرہ یہاں کا غالب      کیوں نہ پھر کبھی نظارہ دنیا غالب  
متفق تم سے ہے اس قول میں مرزا غالب      بخش ہے جلوہ گل ذوق تماشا غالب  
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

پھر گلوں کا باغ میں منظر کھلا      بہن سبز اور اراق کا دفتر کھلا  
یہ بہار اور ظلم یہ مجھ پر کھلا      کچ میں بیٹھا، ہوں، یوں پر کھلا  
کا شے ہوتا قفس کا در کھلا

ہم ہیں اس دھن میں کہ وہ خود ہی بلائے      کون جا کر بے طلب خفت اٹھائے  
جائیں جاتے ہیں اگر اپنے پر اے      ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے  
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

ان کو ہے دشمن کی یاری پر گھمنڈ      دوستی پر جانثاری پر گھمنڈ  
اس کو اپنی ہوشیاری پر گھمنڈ      ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ  
دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا

داغ کھا کر دل ہوا تھا باغ باغ      تھا معطر اس گل ترے دماغ  
یہ اندھیرے گھر کا تھا روشن چراغ      واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ  
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

باز آیا ظلم سے کب وہ جواں      تازے اس کے ہے بسمل اک جہاں  
پھینک دی شرگاں نے کب اپنی ستاں      ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کہاں  
کب کمرے غمزے کی خنجر کھلا

و دہی جب پھرتا ہے یہ گمراہ سا      پھر کسی کا خاک ہو گا رہنما  
نیراب یہ ساتھ ہے تو حرج کیا      مفت کا کس کو برا ہے بدرقمہ

رہرہی میں پردہ رہبر کھلا

کب تک برسا کرے بارانِ اشک      چارہ کس کس کا کرے بارانِ اشک  
کیا جگر ٹھنڈا کرے بارانِ اشک      سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک

آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

ہو گیا جامِ مسرت جامِ مرگ      حور کا بازو بنی مصمصِ مرگ  
ننگی صبحِ زندگانی شامِ مرگ      نامہ کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ

رہ گیا خطِ میری چھاتی پر کھلا

اس سے بڑھ کر زند کیا ہو گا کوئی      ہو نہیں سکتا کبھی ایسا کوئی  
اس کو کیا چھوٹے گا اسے مرزا کوئی      دیکھو غائب سے گرا لجھا کوئی  
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

ردیف (ب)

(۳۱)

ہے مرے واسطے سامانِ بقا موجِ شراب      اس سے جینا ہوں کہے روحِ فزا موجِ شراب  
لے حاشہ شیر

ایک مدت سے نہ تھی جلوہ نما موحِ شراب      پھر ہوا وقت کہ ہو بالکشا موحِ شراب  
دے بٹے کو دل دوست ثنا موحِ شراب

بزمِ رندانِ قدحِ نوار بنابے گلشن      بادہ نوشوں کی طرح جھونٹے ہیں سرو و من  
بنجو دوست ہیں مرغانِ گلستانِ ہر تن      پوچھ مت وجہ سیہ مستی اربابِ چمن  
سایہ تک میں ہوتی ہے ہوا موحِ شراب

بے حسے مل گئی شاہانہ دماغ اس کا ہے      تخت شاہی کی پھر اس مست کو پڑا کیا ہے  
کون ہو اس کا شنوارِ عجب دریائے      جو ہوا غرقِ مے بختِ رسار کھتا ہے  
سرے گزے پر بھی ہے بالِ ہوا موحِ شراب

خشکِ اشجار کو بھی اس نے کیا بار آور      دور کیا ہے کہ لگیں سرو چرغاں میں ثمر  
ہوتی ہے اس کی ہوا بھی عجب اعجاز اثر      ہے یہ برسات وہ مہموم کہ عجب کیا ہو اگر  
موحِ ہستی کو کرے فیض ہوا موحِ شراب

بقرضہ - مراعات نے اپنے ولی ہونے کے سعلق اپنی ایک غزل کے مقطع میں بھی کہا ہے -

یہ مسائل تصوف یہ تیرایانِ غالب      تجھے ہم ولی بکھتے جو نہ خوار ہوتا

دیکھنے والوں      پر کیا شوقِ خدا انداز اختیار کیا ہے اور      میں غالب صاحب کسی ولی سے کم نہ  
تھے۔ جس کا پتہ ان کے اشعار کے الہامی کیفیت سے چلتا ہے - ۱۲

۱۵ ایران میں قاعدہ ہے کہ جب انگور پک جاتے ہیں تو سنگِ مرمر کے حوضوں میں بھر دیے جاتے ہیں۔ آفتاب کی تیزی  
سے دو چار دن بعد ان کا عرق نکلتا شروع ہوتا ہے اس وقت دھڑلے کے ان حوضوں میں انگر گوروں کو پاؤں سے  
روندتے ہیں اس کے بعد ان کی ہندو مزراحیاں حوضوں میں ڈال دی جاتی ہیں انہی مزراحیاں کو بٹے کہتے ہیں - ۱۲

موم گلے گلستاں میں کیا کیا جادو پھولے پڑتے ہیں مسرت سے گلستاں رو  
 موج میں پھرتی ہے مستاد گلوں کی خوشبو چار موج اٹھتی ہیں طوفانِ ہواسے ہر سو  
 موجِ گل موجِ شفقِ موجِ صبا موجِ شراب

مے کدے میں جو شربِ روز میں سرگرم نیاز ان سے پوچھے کوئی شادابی گلزار کا راز  
 ہے یہ باراں کی کرامت نہ ہوا کا اعجاز جس قدر روح بناتی ہے بگر نشہ ناز

دسے تسکینِ بدمِ آبِ بقا موجِ شراب  
 اپنی حرمت میں یہ نکلی گل تر سے برتر رنگ پر اس کے فدا دل پر تو صدقے ہو جگر  
 قوتِ نامیدہ نام اس کا نہ ہو اس کا اثر بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر  
 شہرِ رنگ سے ہے بالکشا موجِ شراب

جامِ جمشید کا ہمسرے مرا جامِ سفال سامنے ہیں مری نظروں کے جہاں کے احوال  
 کیوں نہ چل ہو مری فکرِ درخشاں کو کمال موجِ گل سے چراغاں ہے گزر گاہِ خیال  
 ہے تصویر میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

آنکھ مٹاتی ہے چڑھتی ہے بالائے دماغ موجِ زن دلیں ہے ہر وقت تنائے دماغ  
 ہے جو مرغوب اسے منزلِ زیبا ہے دماغ نشہ کے پردے میں ہے خود تماشائے دماغ  
 بسکہ رکھتی ہے ہر نشو و نما موجِ شراب

ہے عجب عالمِ نورانی کیفیتِ فصل کیفیت کوئی نہیں ثانی کیفیتِ فصل  
 کیونے کیوں نہ شاخوانی کیفیتِ فصل ایک عالم پہ ہے طوفانی کیفیتِ فصل

موجِ سبزہ نوخیز سے تاجِ شرب

جس کو اس بزم میں ساقی نے دیا ساغرِ گل اس کے سر میں نہرا وہم و خیالِ جزو گل  
شارحِ فصلِ گلستاں ہے نوائے بلبل شرحِ ہنگامہ ہستی ہے زہے موسمِ گل

رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشاموجِ شرب

شوقِ بادہِ دلِ مرزا میں بھرا پھر نیک بعد تو بہ کے کہیں پھر نہ خطا ہو سرزد  
فصلِ گلِ جوش پر ہے ابر کی بھی بے آمد ہوش اڑتے ہیں مے جلوه گل دیکھ اسد  
پھر ہو اوقت کہ ہو بالکشا موجِ شرب

## ردیف (ت)

۳۲

خازنِ راز تو ہوا ہے گلشنِ بے خارِ دوست ہے نمونے سبزہ سے صرف خزاں گلزارِ دوست

چھپ گئی ہے تیرگی میں تابشِ انوارِ دوست آمد خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست

دو درِ شمع کشتہ ہے ضایہ خطِ خسارِ دوست

آنکھ اٹھائے اس کے نظارہ کو ہر کس کا جگر کیا لڑا سکتا ہے کوئی برقِ تاباں نظر

لن ترائی اس کو زیاہے کمالِ حسن پر اسے دلِ ناعاقبت اندیش غبطِ شوق کر

کون لا سکتا ہے تابِ جلوه دیدارِ دوست

لے ماخیرہ مہ پر



یوں بیاں کرتا ہے اس مخمل کی باتیں جید رک  
تا کہ میں جانوں کہ ہے اسکی رسائی واں تلک

مجھ کو دیتا ہے پیام وعدہ دیدار دوست

میرے ہر اک درد کا ظالم لگا تا ہے سراغ  
اور یہ کہتا ہے کہ اب حاصل ہوا اس سے فراغ

کیا بتاؤں مجھ کو دکھلاتا ہے کیا کیا سبز باغ  
جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہ ضعف دماغ

مگر کہ ہر وہ حدیثِ لطفِ خبر یار دوست

باتوں باتوں میں لگا دیتا ہے دل میں نیتنر  
یاد دلواتا ہے باتیں یار کی آٹھوں پہر

ہے تسلی و دلاسا سے جفا مد نظر  
چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر

ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخی گفتار دوست

دشمن اس کا مرسلہ آیا ستانے کے لئے  
دوست بن کر ظلم اس انداز سے اسنے کئے

ہوں تخریب میں کہ دونوں میں کہ دکھ کس دئے  
مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے

یا بیاں کیجئے سپاس لذتِ آزار دوست

بات جو ہوتی ہر چمی دلیس کھپ جاتی ہر آپ  
کھینچ کر سامع کا دل اپنی طرف لاتی ہر آپ

طبع مرزا دمدم یہ کہکراتر آتی ہے آپ  
یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ

ہر ردیف شعر میں غالب نے بس تکرار دوست



## ردیف (دو)

۳۳

ناز کا لطف حسینوں سے گیا میرے بعد      دلربا عشوہ دل کش نہ رہا میرے بعد  
وہ کرشمہ نہ رہا ہو شرابا میرے بعد      حسن غمزے کی کشاکش سے چٹھامیے بعد

بارے آرام سے ہی اہل جفا میرے بعد

شیوہ غنچ و دلال آج جہاں سے اٹھا      کام سے اپنے ہوا ناز معطل گویا  
اب کہاں ہر کوئی دل ان سے جو ہو عہد برا      منصب شفتگی کے کوئی قابل نہ رہا

ہوئی معزولی انداز وادامیرے بعد

اب کہاں ہے کوئی سر باز بیسر مجھ سا      تیز جس کے لئے کی جائے گی شمشیر قضا  
اب تو بیکار ہے خود جو ہر ذاتی اس کا      درخور عرض نہیں جو ہر بیدا کو جا

نگہ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد

یا کبھی ان کی پھر انگشت ابھوس ترقی      یا نظر آتی تھی پوروں پر خنکی سرخی  
میرے مرتے ہی صدا فسوس یہ نوبت پہونچی      خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پڑی

ان کے ناخن ہوئے محتاج حایمے بعد

آج دنیا سے اٹھی درخت گریباں کی نزار      اب کبھی ایک جگہ ان کا نہ ہوگا اجراع

رہنِ عشق سے محفوظ ہوئی دلی متاع ہے جنوں اہل جنوں کیلئے اغوش و دراع

چاک ہوتا ہے گریہاں سے جدا کیسے بعد

مے کرے بند ہوئے سرد ہوا گلخنِ عشق کون ایسا ہے کہ آباد کرے گلخنِ عشق

ہے کوئی اب کہ ہوا سوارِ بر تو سنِ عشق کون ہوتا ہے حریفِ مے مردِ فگنِ عشق

ہے مکر رب ساقی پہ صلا میرے بعد

بزمِ الفت ہے دھواںِ حار تو حیرت کیا ہے کیا تعجب ہے جو اندھیر بہاں چھایا ہے

مجھ سا پروانہ جاں سوز کہاں پیدا ہے شمعِ جمعیتی کی تو اس میں سے دھواں اٹکتا ہے

شعلہِ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

مذنوں روئگی سر بیٹ کے حسرتِ میری کوئی بھی بات نہ پوچھے گامتناؤں کی

بے کسی ہوگی پس مرگ لہر پر چھائی غم سے قربا ہوں کہ اتنا نہیں نیاس کوئی

کہ کرے تعزیتِ جہر و وفا میرے بعد

چھوٹ کر مجھ سے ہوا بیکس و تنہا غالب ایسا وارفتہ کہاں اس کو ملے گا غالب

ہاتھ ملتا ہے جو افسوس سے مرزا غالب آئے بے کسی عشق پر رونا غالب

کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا کیسے بعد

۱۔ مردِ فگنِ عشق۔ مرد کو بچا ڈینے والی عشق کی شراب

میرے مراد کے بعد ساقی پکا پکا کر کہہ رہا ہے کہ اب کوئی ہے جو مے مردِ فگنِ عشق کا حریف ہو یعنی عشق کی شراب کا

جام پیئے۔ لیکن جب کوئی آواز نہیں آتی تو پھر چپکے سے یلوس ہو کر کہتا ہے کہ حریفِ مے مردِ فگنِ عشق کون ہو سکتا ہے؟

یعنی کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔ اس شعر میں نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ یہاں مصرعہ بھی ساقی کی صلا (دلی متاع) پر ہے۔

## رولیف ( ر )

۳۳

ہوئے ہیں سدرہ شوقِ در در دیوار      د اس کو روک سکیں گے مگر در دیوار  
کریں گے اور اسے تیز تر در دیوار      بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر در دیوار

نگاہِ شوق کو ہیں بال و پیر در دیوار

شبِ فراق میں رونے کی آگئی جو امنگ      تو پل کی پل میں ہوا کچھ عجیب گھر کا ڈھنگ  
ادھر ہے خشت کا انہار اُدھر ہو تو وہ سنگ      و فورِ اشک نے کا شاد کا کیا یہ رنگ

کہ ہو گئے مرے دیوار و در در دیوار

خبر ہے کہ سرِ شام آئی گا وہ نگار      تو سایہ حد سے بڑھاتا کہ ہو قدم پہ نثار  
چلا ہی جاتا ہے بڑھتا ہوا نہیں ہے قرار      نہیں ہے سایہ کہ سنکر نویدِ مقدم یار

گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

چڑھا دماغ میں کچھ نشہ شباب ایسا      کہ گرم کر دیا بازارِ خود نمائی کا

بقیہ صفحہ ۳۸۔ کے الفاظ ہیں۔ اس مصرعہ کو مکرر پڑھ رہا ہے ایک دفعہ بلانے کے بعد میں پڑھا ہے۔ کون ہوتا ہے حریف  
مردانگن عشق، یعنی کوئی ہے جو ہے مردانگن عشق کا حریف ہو۔ پھر جب کوئی آواز پر نہیں آتا تو اسی مصرعہ  
کو مایوسی کے بعد میں مکرر پڑھتا ہے۔ کون ہوتا ہے حریف..... یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ اس میں لہجہ  
اور طرزِ ادا کو بہت دخل ہے کہ کو بلانے کا لہجہ اور یہ لہجہ سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے اس طرح مصرعہ  
مذکورہ کی تکرار کرنے سے یہ معنی فوراً ذہن نشین ہو جائیں گے۔

کسی سے اب تجھے مطلق حجاب بھی نہ رہا      ہوئی ہے اس قدر ارزانی سے جلوہ  
کمرست ہے تیرے کوچے میں ہر در و دیوار

سدا جو جانب دیوار و در رہا نکلتا      ہوا ہے آئینہ ہر سنگ و خشت حیرت کا  
کئے ہیں کام مری چشم شوق نے کیا کیا      جو ہے تجھے سر سودائے انتظار تو آ  
کہ ہیں دکان متاعِ نظر در و دیوار

رہی ہمیشہ جو گردش ہی سایہ کو گھر کے      یہ شوق تھا کہ بلائیں یہ اس کے گھر کی لے  
نصیبِ خفتہ مرے غمِ کدہ کے جاگ اٹھے      وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں تو سایہ سے

ہوئے فل در و دیوار پر در و دیوار

یہ آرزو ہے کہ اپنوں سے پائیں آزادی      یہ رونق ان کی نہیں ہم کو وہ نشادی  
چہل پہل سے پریشان ہیں ل سے فریادی      نظریں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی

ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

ہمیشہ ضبط ہی گریہ کو کر لیا میں نے      اُنہ کے اشک جو اُنہ انھیں پیامیں نے  
یہ عجز دیکھ کے گھر کو بچا دیا میں نے      نجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے

کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

ہر ایک جزو ہے گھر کا سرور سے بیتاب      ہر ایک ذرہ نظر آ رہا ہے مست و خراب  
ہمارے اشک گویا اٹھائے ہیں حجاب      نہ پوچھ بے خودی عیشِ مقدمِ سیلاب

کہ نہاچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

نہ کوئی دوست ہے مزا کہیں نہ ملے میں      نہ راز داں ہے نہ ہے ہم نشیں نہ ملے میں  
 بھرے ہوئے ہیں بہت اہل کیں نہ ملے میں      نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں نہ ملے میں  
 حریف رازِ محبت مگر درو دیوار

۳۵

پایا نہ میرے گھر کو ستم گر کہے بغیر      ڈھونڈا ہے گھر رقیب کا کیونکر کہے بغیر  
 سمجھا مرا پستہ نہ مکر کہے بغیر      گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر  
 جاے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

جب تک وہ دیکھتے تھے کہے قدرت سخن      اک روز بھی تو مجھ کو نہ دی رخصت سخن  
 چھیڑا کبھی تو بولے نہیں فرصت سخن      کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن  
 جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

حراما نصیب کون ہے ہمسایہ جہان میں      نکلا نہ کوئی کام ہمسایہ جہان میں  
 کس طرح دیکھے ہو گزرا جہان میں      کام اس سے اڑا ہے کہ جب کا جہان میں  
 یوں نہ کوئی نام ستم گر کہے بغیر

کیا کیا تمہارے ہاتھ سے ہوتے نہیں ستم      کیا کیا ہمیں پہنچتے نہیں تم سوز و غم  
 لیکن جو سودرا بھی شکایت تو لو قسم      جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے و گرنہ ہم  
 سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

ابرو کو اس کی کہتے ہیں شمشیر خوش نیام      تیرا جل ہے اس نگہ جاں ستاں کا نام  
ہوتا ہے ہر اداسکے بیاں میں اک انتظام      مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام

چلتا نہیں ہے دشمن و خنجر کہے بغیر

بہتر سمجھتا ہے کوئی پتھر کو پوجنا      مذہب کسی کا مہر منور کو پوجنا  
ایمان عاشقوں کا ہے دلبر کو پوجنا      چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کو پوجنا

چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

ہوتا نہ کس طرح سے فدائے خم و سبو      دکھلا رہا تھا عالم مستی مقام ہو  
پیش نظر خدا ہو جو ساقی ہو روبرو      ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو

بنتی نہیں ہے شبشہ و ساغر کہے بغیر

رکھتا ہوں پاس اسلئے کا فظلم دوا      تحریر سے ہوتا بسہولت ہر ایک بات  
ممکن ہو کون دن کہے سمجھوں یلکا کورت      بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہوا التفات

سنتا نہیں ہوں بات مکر کہے بغیر

مرزا نے کچھ کیا جو کبھی حال زار عرض      انجام یہ ہوا کہ ہوئی ناگوار عرض  
یوں ہی نہ ہو کہیں دلِ نازکِ بار عرض      غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض

ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

اس بام پر تجسلی انوار دیکھ کر حیراں ہوں اپنے آپ کو ہشیار دیکھ کر  
 جھپکی نہ آنکھ برق شرر بار دیکھ کر کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر  
 جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

رکھتی ہے رات دن پیشِ دل تپاں مجھے تاب سکوں ہے برق کی صورت کہاں مجھے  
 کرنا نہ آیا سوزِ محبت نہاں مجھے آتشِ پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے  
 سرگرم نالہاںے شرر بار دیکھ کر

ظلم و ستم کا وقت ہے کوئی نہ جو رکا اک کھیل ہو گیا کہ جب اٹھے ستا لیا  
 دل اب تو نام سے ہے محبت کے کانپنا کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا  
 رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

نوبت نہ آئی تھی کہ گلے پر مرے چلے چلنے سے اس کے پہلے ہی مرنا پڑا مجھے  
 یہ اور بوسے لے مرے قاتل کے ہاتھ سے آتے میرے قتل کو پر جوش رشک سے  
 مرنے والوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

مستی نے تیری کھو دیا صبر و سکونِ خلق ہے لغزشِ خرام سے زخمی دروِ خلق

۱۔ آتشِ پرست۔ پارسی لوگ آگ کو مظہرِ خدا سمجھ کر پرستش کرتے ہیں۔ ان کی عبادت گاہوں میں ہر وقت  
 آگ روشن رہتی ہے۔ فرماتے ہیں محبوب کی جہانی میں جو میں آہ و بکا کرتا ہوں اور میرے منہ سے آگ برساتے  
 والے نالے نکلتے ہیں تو ان کو دیکھ کر لوگ مجھے آتشِ پرست کہتے ہیں۔ ۲

شیشہ ہوا ہے باعثِ حالِ زبونِ خلق      ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پر خونِ خلق  
لڑے ہے موج نے تری رفتار دیکھ کر

پڑتا ہے دمِ دمِ سر پرالم سے ہاتھ      مصروفِ سب سے کوئی ہے ہر وقت غم سے ہاتھ  
قسمت کہاں وہ سنس کے ملا کر گم ہاتھ      وحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ  
مجھ کو حریص لذتِ آزار دیکھ کر

مضمون ہمارے تلے ہیں لعلِ بین کیساتھ      نسبت ہے حرفِ حرف کو درِ عدل کیساتھ  
لیتا ہے اس کو کوئی اگر تھرفن کے ساتھ      بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کیساتھ  
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

چلنے سے پیشتر تجھے لازم ہو دیکھ بھال      رستے کی اونچ نیچ سے چلنا نہ ہوا بال

لے متاعِ سخن کلام کی دولت، ہماری متاعِ سخن کے خریدار کے ہاتھ بک جاتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ سخن ہم اور  
سخن شناس ہو۔ عالمی سلسلے میں منشی ہر گویا لائقِ ناز ایک فارسی خط میں منشی نبی بخش حقیر کی سخن فہمی کے معنی بکھنے  
ہیں، یہ خط کتنا حسرتِ آویز خدائے میری یکسی اور نہائی پر رحم کیا اور ایک شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے  
رفقوں کا درجہ اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا جسے میری اندھیری راتوں کو روشن کر دیا۔ اس نے اپنی  
باتوں سے ایسی شمعِ روشن کی جسکی روشنی میں نے اپنے کلام کی خوبی و تیر و تختی کے اندھیرے میں خود میری  
نگاہ سے سخن فہمی دیکھی میں حیران ہوں کہ اس فرزندِ یگانہ منسی نبی بخش کو کس درجہ سخن فہمی اور سخن سنجی عنایہ  
ہوئی ہے، حالانکہ شعر میں کہتا ہوں اور شعر کہا بھی جانتا ہوں مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں  
سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے اور سخن فہمی کس کو کہتے ہیں؟ مشہور ہے کہ خدائے حسن کے دو حصے کے آدھا یوسف  
کو دیا اور آدھا بنی نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ ہم سخن و ذوقِ معنی کے بھی دو حصے کے گئے ہیں۔ آدھا منشی  
نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے صحیح میں آیا ہو۔ جو زمانہ اور آسمان میرے گھاسی مخالف ہو مگر میں اس شخص کی  
بدولت رہنے کی دشمنی سے بد فکر نہیں اور اس نعمت و نیا پد کا نفع؟ (از یادگارِ غالب)



پُرنگ راہ میں بھی ہے غافل سفرِ سال      ز ناز باندہ سببِ صد دانہ توڑ ڈال  
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

دن رات خاک دشت کی یا چھانتا تھا میں      یا کچھ دنوں سے نقشِ قدم بن رہا تھا میں  
مثلِ شکستہ پا سرِ وادی پڑا تھا میں      ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں  
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

اس درجہ بدظنی ہے خدا جانے کیوں اسے      ہر دم یہ وہم ہے کہ محبت ہے اور سے  
کہتا ہر ہنس کے چہ کو ہری چگ اسی لئے      کیا بدگمان ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے  
طولی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

ہیبتِ بھٹائی ہوتی طلبِ نور پر      خاکِ سیہ بہاڑ ہوا کس قصور پر  
یہ گرمیاں یہ غیظ اور اک بے شعور پر      رگرنی تھی ہم پر برقِ بجلی نہ طور پر  
دیتے ہیں بادہِ ظریفِ قرحِ خوار دیکھ کر

دیکھا جو آستانہ تو آنکھوں میں پھر گیا      مرزا کا صبح و شام وہ سجدوں کا مشغلا  
دھجے جو پھر لہو کے نظر آئے جا بجا      سر پہوڑنا وہ غالبِ آشفۃ مال کا  
باد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

یہ مرگرنی پر ناحق میری بربادی کے سماں ہے      فطول اتنا ترس آیا ہے اس گرمیاں ترساں پر

غلطی کی یہ کیوں مجھ کے حال پریشاں پر  
لڑتا ہے حراول زحمت مہر درخشاں پر  
میں ہوں وہ قطرہ شبنم کہ ہوں غارِ بیاں پر

ہوئی گوشت کے ہاتھوں زلزلے بھر میں رسوائی  
ہوا بے ساز و سامانی پہ بھی سامانِ زیبائی  
سیہ خانہ میں جب آئے کہ بھگتیں قید تنہائی  
نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی

سفیدی دیدہ یعقوب کی پھرتی ہونداں پر

جنوں مانع ہوا استاد کا احساں ٹھانے سے  
فرغت پا چکا روز ازل پڑھنے پڑھانے سے  
رہا انکار عقلِ کل کو غیر لبتانے سے  
فنا تعلیم درس بے خودی ہوں اس زلزلے سے

کہ جنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستان

جگر میں غلش سرگز نہ رہتی نشتر غم سے  
یہ ایذا میں ہوتی جو بیلاب جبر کے دم سے  
کوئی دم جان کی ہلاکت تو ہوتی درجیم سے  
فرغت کس قدر راستی مجھے تشویش مریم سے

بہم گم صلیح کرتے پارہ ہائے دل نمکلاں پر

برابہ نقشہ عالم سے سن آباد کا نقشا  
وہاں بیٹھا ہر سکر روزاول سے رشتے کا

۱۔ حضرت یعقوب حبیب یوسف سے نہایت محبت رکھتے تھے۔ اسلئے ان کے دو مرتبے بھائی ان سے بہت جلتے ایک  
ن سب جانی ان کو تڑکار کے ہانے جنگل میں لے گئے۔ اور ان کو ایک کنوئیں میں ڈھکیل دیا۔ گھر آکر اپنے ماپ سے  
لہو دیا کہ یوسف کو بھڑایا اٹھالے گیا۔ حضرت یعقوب بہت رنجیدہ ہوئے اور یوسف کی یاد میں روتے روتے اندھے  
ہو گئے۔ ادھر یوسف کو ایک قافلے کے لوگوں نے کنوئیں سے نکال کر غزیرہ مصر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ عزیز مصر  
لہو بیوی رہی حضرت یوسف کے حس و جمال پر عاشق ہو گئی تھیں حضرت یوسف نے اس کی کوئی بات نہیں مانی۔ آخر کا  
یوں ہو کر اور ان بڑا زمام لگا کر کو زندان میں ڈال دیا۔ اس تعزیر میں واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ قید میں بھی حضرت  
یوسف نے خانہ آرائی نہ چھوڑی حضرت یعقوب کی آنکھوں کی سفیدی زندان کی دیواروں پر پھر پھر کرے آراستہ  
اری تھی یعنی جس کسی حالت میں بھی اپنی آرائش نہیں چھوڑتا۔

نالوں کے دھوئیں بجے شب تار میں نقشا      انجم میں ہے آہ شرر افشاں کا تماشا  
 ہے شعلہ الفت سے زمانے میں اجالا      لوگوں کو ہے نور شید جہاں تاب کا دھوکا  
 ہر روز دکھاتا ہوں میں اکٹاغ نہاں اور

دل باختہ کو کب ہے ترے سر کی قسم چین      پاتا ہے کہاں بستہ زنجیر الم حسین  
 دیتے ہیں کہاں مجھ کو شب و روز کے غم چین      لیتا نہ اگر دل تمھیں دیتا کوئی دم چین  
 کرتا جو نہ مرنے کوئی دن آہ و فغاں اور

تھے نہیں رستہ جو ذرا پاتے ہیں نالے      بہتے ہوئے اشکوں کے چلے آتے ہیں نالے  
 وہ جوش ہے دریا کو بھی ٹرتے ہیں نالے      پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے  
 رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

پہلے اشعار کہتے تھے جو بہت اچھے تھے      سیکڑوں ایک ایک سے بہتر بہت اچھے  
 مرزا کے بھی اشعار ہیں اکثر بہت اچھے      ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے  
 کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اے مرزا غالب! اس شعری سرسبز چمنوں کو اپن لکھی ہے "لیتاد اگر دل" یہ بہت لطیف تقویر ہے لیتا کو  
 رابطہ چین سے کرنا مرزا طے آہ و فغاں سے غری میں لعنہ معنوی اور لفظی دونوں معبود ہیں فارسی  
 میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز بلکہ نصیح اور بلج رحمتہ تقلید ہے فارسی کے حاصل معنی مصرعین ہر اگر  
 دل تمھیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا۔ اگر نہ مرنے کو کوئی دن آہ و فغاں کرتا؟

نیز پوری غزل (اس شعر کو حضور کریم مرزا غالب نے حاتم علی قدیر کو ارسال فرمائی تھی علاوہ انہی)  
 اس غزل کے سات شعر اور ایک اور غزل اس بزم میں مجھے نہیں مٹی جائے۔ "نوار" علامی کی یادداشت  
 پر بھی تھی۔ ۱۲

وقف جو یہاں مجھ کو بھی تھا کوئی دن اور      تم کو بھی مناسب تھا مہرِ ناکوئی دن اور  
تم نے نہ مرا ساتھ نہ با کوئی دن اور      لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور  
تنہا گئے کیوں اب ہو تنہا کوئی دن اور

درِ پرتیرے اس خاص غرض سے ہوئی ہیں سا      منظور ہے ہستی کا مجھے اپنی مٹانا  
ہے سخت اگر سنگِ در اس کی نہیں پروا      مٹ جائے گا سرگزرِ ترا بغیر نہ گھسے گا  
ہوں درِ پرتیرے نا صیدِ فرسا کوئی دن اور

بگڑے ہوئے آثار ہیں کیا بات بناؤں      کچھ روٹھ گئے ہو تو بتا دو کہ مناؤں  
اک بات ذرا سی ہے جو مانو تو بتاؤں      آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں  
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

دیرینہ محبت کا کیا پاس نہ تم نے      حیرت ہے کہ کس دل کی جدا ہونے ہو مجھ سے

لکھنؤ غزل نہیں مرثیہ ہے مرزا غالب نے نواب زین العابدین عارف کی موت پر لکھا جو عین جوانی کے عالم  
ہم را ہی ملک بھا ہوئے تھے جب کہ ان کی عمر ۲۶ برس کی تھی۔ غالب صاحب کے اپنے سات بچے ہوئے لڑکے  
بھی اور لڑکیاں بھی۔ مگر کوئی پذیرہ جینے سے زیادہ نہ جیا، لہذا زین العابدین خاں کو جو ان کی سالی کا لڑکا  
تھا حبشی بنالیا، زین العابدین خاں خوش فکر ہونے کی وجہ سے مرزا غالب کو اور بھی زیادہ عزیز تھے ان کی  
اچانک موت کا مرزا غالب کو نہایت صدمہ ہوا۔ اور یہ دلدروز نوہ لکھا چھ نکہ اسی سال مونس اور تسکین بھی  
گزرے تھے اس لئے سالک نے یہ تاریخ بھی مٹائی ہے

برس دن میں ہوئے یہ تین شاعر      ارم میں عارف و تسکین و مومن

نالوں کے دھوئیں کچے شب تا میں نقشا      انجمن میں ہے آہ شرر افشاں کا تماشا  
ہے شعلہ الفت سے زمانے میں اجالا      لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا  
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور

دل باختہ کو کب ہے ترے سر کی قسم چین      پاتا ہے کہاں بستہ زنجیر الم چین  
دیتے ہیں کہاں مجھ کو شب و زکے غم چین      لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین  
کرتا جو نہ مرنے کوئی دن آہ و فغاں اور

تھے نہیں رستہ جو ذرا پاتے ہیں نالے      بہتے ہوئے اشکوں کے چلے آتے ہیں نالے  
وہ جوش ہے دریا کو بھی شربت ہے نالے      پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے  
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

پہلے شعرا کہتے تھے جو ہر بہت اچھے      تھے سیکڑوں ایک ایک سے بہتر بہت اچھے  
مرزا کے بھی اشعار ہیں اکثر بہت اچھے      ہیں اور بھی دنیا میں سنغور بہت اچھے  
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اے مرزا غالب! اس شعری سرسبز جنم کو یاد رکھیں کہ "لیتا" اگر دل لایا بہت لطیف فقر ہے لیتا کو  
رہط ہے چین سے، مکرنا مرلو طے، آہ و فغاں سے، مرنے میں تعقید معنوی اور لفظی دونوں معسوب ہیں فارسی  
میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز بلکہ بصیر اور بلج ریختہ تقلید ہے فارسی کے حاصل معنی مصرعین ہر اگر  
دل تمہیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا، اگر نہ مرنا تو کوئی دن اور آہ و فغاں مکرنا؟

نیر، پوری غزل (اس شعر کو چھوڑ کر) مرزا غالب نے حاتم علی قدیر کو ارسال فرمائی تھی علاوہ از  
اس غزل کے ساتھ شعر اور ایک اور غزل "اس بزم میں مجھے نہیں سی جایا" "نوار" علامہ کو بی، بادداشت  
پیشگی تھی - ۱۲

مجبوراً بھی تھا کوئی دن اور      تم کو بھی مناسب تھا ٹھہرنا کوئی دن اور  
 ساتھ نہ با کوئی دن اور      لازم تھا کہ دیکھو مزارِ ستا کوئی دن اور  
 تنہا گئے کیوں اب ہو تنہا کوئی دن اور

خاص غرض سے ہوں ہیں سا      منظور ہے ہستی کا مجھے اپنی مٹانا  
 سنگِ در اس کی نہیں پروا      مٹ جائے گا سرگز تر اپتھر نہ گھسے گا  
 ہوں در پتھرے ناخیز سا کوئی دن اور

اے آثار ہیں کیا بات بناؤں      کچھ روٹھ گئے ہو تو بتا دو کہ مناؤں  
 راسی ہے جو مانو تو بتاؤں      آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں  
 مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

ت کا کیا پاس نہ تم نے      حیرت ہے کہ کس لہجہ رہا ہوتے ہو مجھ سے

یہ مرثیہ مرزا غالب نے نواب زین العابدین عارف کی موت پر لکھا جو عین جوانی کے عالم  
 بنا ہوئے تھے جب کہ ان کی عمر ۲۶ برس کی تھی۔ غالب صاحب کے اپنے سات بچے ہوئے لڑکے  
 بھی مگر کوئی پندرہ جیسے سے زیادہ نہ جیا، لہذا زین العابدین خاں کو جو ان کی سالی کا لڑکا  
 با زین العابدین خاں خوش فکر ہونے کی وجہ سے مرزا غالب کو اور بھی زیادہ عزیز تھے ان کی  
 کا مرزا غالب کو نہایت صدمہ ہوا۔ اور یہ دلدوز نوہ لکھا چھ نکلہ اسی سال موسیٰ اور تسکین بھی  
 ملے سالک نے یہ تاریخ بھی تھی

برس دن میں ہوئے یہ تین شاعر      ارم میں عارف و تسکین و مومن

باندھی ہے کمر ملک عدم کے ہیں ارادے جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے  
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن او

کس ذوق سے تھا نحو تماشا بھی عارف اس نرم سے کس واسطے اٹھا بھی عارف  
کیوں ہو گیا پیوند زمیں کا بھی عارف کیوں اے فلک پیر حواں تھا بھی عارف  
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرنے کوئی دن اور

والہ تمہیں گھر کے اجالے کا سبب تھے چھایا ہے اک اندھیر مری آنکھوں کے آگے  
کس خاک کے پرے میں جیسے میری نظر سے تم ماہِ شب چار دم تھے مرے گھر کے  
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن او

مانا کہ وہ آیا تھا فقط جان ہی لینے ممکن تھا کہ جیلے سے اسے ٹالے رہتے  
کچھ بات بنا دیتے تو کیوں چھوٹے تم سے تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و تند کے  
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

جلدی جو یہ کی جانے میں کیا جی میں سمائی جاتے ہوتے ہر ایک سے کیوں آنکھ پھرائی  
افسوس نہ اپنوں کی بھی الفت تمہیں آئی مجھ سے تمہیں نفرت ہی نیڑے لڑائی  
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

ناراض ہی تم تھے تو دل غمزدہ تھا خوش تم سامنے تو پہننے تھے ناخوش ہے یا خوش  
جب تم نہ ہے یہ تو کہو دل ہے کیا خوش گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش  
کرنا تھا جو انرگ گزرا کوئی دن اور

چھوڑے گی ابھی جان کہاں رشتہٴ قالب مرزا ابھی سمجھے نہیں تم اس کے مطالب  
کیا زیست ہر ایسے کی جو ہر موت کا طالب ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب  
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن او

۲۰

اجابتوں پر دعاؤں کی کیجئے کیا ناز نہ عجز اپنا ہوا کارگر نہ سوز و گداز  
ازل میں بسکہ ہر اک شے کا ہو چکا ہر طراز حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسوں نیاز  
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

نظر ہی سب نہیں پھر دھڑ دھوپ ہے سود ابھی ہے تجھ سے بہت دور منزل مقصود  
ہر ایک ذرہ میں ہے نور ہستی معبود نہ ہو بہرہ بیاباں نور دویم وجود؟  
ہنوز تیرے تصور میں ہی نشیبِ فراز

ہم آج تک تو رہے شکل دیدہ حیراں ہوا نہ سامنے نظروں کے حسنِ یار عیاں  
گزاریں صبر میں کچھ اور دن کہاں یہ تو اں وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں  
کہ دیجئے آئینہ انتظار کو پرواز

رہا ہے یہ تہہ خنجر بھی ذوق دید میں مست گیلے جان سے پھر بھی ہوا خیالِ نپست  
کیا ہے یا کے پرتو نے اس کو نیست و هست ہر ایک ذرہ عاشق ہے آفتاب پرست  
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوہٴ ناز



عجب مقام میں مرزا ہے کیا کہوں غالب      مثال اسکو آگروں تو کس سے مومن غالب  
فضا میں عالم امکان ہے فزون غالب      نہ پوچھ وسعتِ میخانہ جنوں غالب  
جہاں یہ کائنات گروں ہر ایک خاک انداز

۴۱

مفت ہوتے ہیں پریشان عزیز      کیا مجھے سمجھے ہیں نادان عزیز  
مجھ کو ہے یار کا فرمان عزیز      کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز  
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز  
مشکل اس کا ہے نکلا دل سے      ہے تعلق بھی بلا کا دل سے  
تیر کو تو نے جو کھینچا دل سے      دل سے نکلا یہ نہ نکلا دل سے  
ہے ترے تیر کا پیرکان عزیز  
آف نہ مرزا نے کبھی کی غالب      جو مصیبت پڑی جھیلی غالب  
ضبط لازم ہے تمہیں بھی غالب      تاب لاتے ہی بنے گی غالب  
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

۱۵ مرزا غالب نے ایک خط میں مرزا آقہ کو لکھا کہ کون ترک لباس کرنے ہو، پیسے کو نہ ہائے پاس ہے کیا جس کو اتار کر پھینکو گے ترک لباس سے قید ہستی ماٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھانے پے گزارا نہ ہوگا۔ سختی اور سستی اور رخ و آرام کو ہوا کر دو جس صورت ہو اسی صورت سے ہر صورت گزرنے دو۔ جے تاب لاتے ۱۶۔ نیز نواب ملائی کو بھی لکھا "بھائیوں سے پھر نہیں ملا۔ بازار میں نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ جو اہر خبردار میرا سلام انھیں کو ادا ان کا سلام مجھ کو پہنچا دیتا ہے اس کو غلیظت جانتا ہوں۔ جے تاب لاتے ہی بنے گی غالب ۱۷۔"

میری ہستی ہے اک انوکھا راز      میں بقتا و فنا ہم دم ساز  
ظاہر انجام ہے نہ کچھ آغاز      نہ شکلِ نفس ہوں نہ پردہ ساز  
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تجھ کو ہنسنے سے کام صورتِ گل      میں ہوں اور ہم نوائیِ بلبَل  
لاگ دونوں میں آپڑی بالکل      تو اور آرائشِ خیمِ کاکل  
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

بس زیادہ نہ لے تعلق کی      غیر ممکن ہے دل کی آزادی  
کیا عجب ہے کھلے پر پردہ کبھی      لافِ تمکینِ فریبِ سادہ دلی  
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گزار

جب سے کنجِ قفس کیا آباد      بھول کر بھی نہیں چمن کی یاد  
دل نہیں چاہتا کہ ہوں آزاد      ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد  
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

تنگ آیا ہوں ہجرِ دلبر سے      کیوں نہ آنکھوں سے اشکِ خوں برسے  
دل کہاں تک فراق میں ترسے      وہ بھی دن ہو کہ اس ستم گرسے  
نازِ کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

یہ کوئی ضبط ہے کہ میں چپ ہوں      دل ہو خالی تو کیا لہو روؤں  
روتے روتے ہوا ہے حال زلوں      نہیں دل میں مرے وہ قطرہ خوں  
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلبار

تیغِ بڑاں تری نگاہ تیسر      عشوہ تیرا جہاں سے گرم ستیز  
خوش خرامی تری قیامت نیر      اے ترا جلوہ یک قلم انگیز  
اے ترا ظلم سر بسر انداز

اٹھ گیا ہے نقابِ روئے نکو      خوب نکلیں گی حسرتیں اب تو  
منعِ پابوس سے نہ کر مجھ کو      تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو  
ریشِ سجدہ جبینِ نیاز

غم سے کس دن میں جاں بلب نہ ہوا      ورد سے حالِ غیر کب نہ ہوا  
لطفِ مجھ پر یہ بے سبب نہ ہوا      مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا  
میں غریب اور تو غریب نواز

مرفوش و مستِ نظم رہتا تھا      دل سے تنہا شاہدِ سخن پہندا  
روئے خاک اڑائے مرزا      اسد اللہ خاں تمام ہوا  
اے دریغا وہ رنید شاہد باز

## رولف دک

(۴۳)

چاہتے یہ شوخ تو دنیا میں کیا کم تھا نمک      سنگ کے بدلے لے سکتے تھے پتھر کا نمک  
ان کے ہاتھوں کب دہانِ زخم نے چکھا نمک      زخم پر چھٹکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک  
کیا مڑا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

بے سبب کب تک سے اخترازی زخمِ دل      تو نہیں واقف تو مجھ سے پوچھ از زخمِ دل  
اس کی خاکِ پاچھر ٹک لے چارہ ساز زخمِ دل      گردِ دریاہ یا رہے سامانِ ناز زخمِ دل  
ورنہ ہوتا بے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

چاہتا ہوں میں تو یہ پیدا کوئی پیدا ہو      اور مڑے مجھ کو یہ ہے دیکھوں اسے ہنسنا ہو  
حسرتیں نکلیں کہیں فصلِ بہاری لائے تو      مجھ کو از رانی ہے تجھ کو مبارک ہو جو ہو  
ناکِ بلبل کا درد اور خندہ گل کا نمک

غیر ممکن تھا کسی مرہم سے ہو اس کا علاج      تھا اسی دماں کا طالب اسکے زخموں کا مزاج  
تھی تنگ دوس کی اس کو اور کس کی احتیاج      شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کآج  
گردِ ساحل ہے بزخمِ موجِ دریا نمک

سیکھ لے اس شوخ سے کوئی محبت کا نباہ      گو بظاہر ہو چکی پر مجھ سے ترکِ رسم و راہ

پھر بھی مجھ پر کس قدر ہے ہربانی کی نگاہ داد دیتا ہے مرے زخم جگر کی واہ واہ

یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وجہں جانمک

پوچھ لو اگر یہ کسی لگ رہی ہے انکوئے تاکہ ہو اس خستہ تن کا قصہ آسانی سے طے  
تم گئے مجھ پر لگے ہونے تقاضے پے پے چھوڑ کر جانا تن مجروح عاشق حیف ہے

دل طلب نہا زخم اور مانگیں ہلے اعضا نمک

ہے عروسے چارہ جوئی باعث تحقیر درد کیوں کسی کی سعی سے حاصل کروں تاثیر درد  
اس کے ہنسنے سے مجھے ہاتھ اگئی نذر درد بغیر کی منت نہ کھینچوں گاپے تو قیر درد

زخم مثل خندہ قاتل ہے سزا پایا نمک

اپنی آنکھوں سے جو تیرے شوق کو بھر دیکھ لیں حضرت مرزا بھی تیری بخود کی داد دیں  
اب کہاں زخم کھائے اور کہاں وہ لذتیں یاد ہیں غالب مجھے وہ دن کو وھرق میں

زخم سے گرتا تو میں ہلکوں سے خستہ تھا نمک

۴۴

ختم قصہ ہے شپ بجز بسر ہونے تک صورت شمع ہوں لہان سحر ہونے تک

کیا خبر حال ہو کیا تجھ کو خبر ہونے تک آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

اک تلامذہ پاک یوں نہ ہے پھر دل تنگ روز طوفان حوادث کا ہر آمادہ جنگ

کس طرح دیکھئے بے چارہ کی نکلے گی ہنگ  
 دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ  
 دیکھیں کیا گزرتے ہیں قطرہ پر گہر ہونے تک  
 آتش ہجر سے حالت ہے جگر کی جو خراب  
 کش مکش سے ہے مری جان کو قمارِ عذاب  
 دل یہ کہتا ہے کہ پہلے مجھے کیجئے خونِ ناب  
 عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب  
 دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر بہنے تک  
 تم سے اور وعدہ وفا ہی ہو کبھی ناممکن  
 دیکھو لیں خیر کہ لائے ہو خدا کو ضامن  
 اپنی اس دارِ فنا میں ہے بقا ہی کے دن  
 ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن  
 خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک  
 ہو گیا حسن کی ہیبت سے دل کو وہ دہشیم  
 سخت حیرت ہے کہ زندہ ہے کس طرح کلیم  
 فرضِ عاشق ہے دم جلوہ کرے جانِ کلیم  
 پھر تو خیر سے ہے شبنم کو فست کی تعلیم  
 میں بھی ہوں ایک۔ حنایت کی نظر ہونے تک  
 ظرف رکھتا ہے تو کر بادہ پرستی غافل  
 ورنہ یہ بزمِ رب کی نہ یہ بستی غافل  
 تیرے کو محروم نہ کرنے تری مستی غافل  
 اک نظر پیش نہیں فرصتِ ہستی غافل  
 گرمی بزم ہے اک رقصِ شر ہونے تک  
 پلو پھٹے کیا ہو یہ مرزا سے کہ کیا ہے مزاج  
 کل تھی فرصت اسے اندر وہ مصیبتِ مزاج  
 وہ مرض ہے کہ معائنہ دوا کا محتاج  
 نیم بستی کا اسد کس سے ہو بزمِ ملاح  
 شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

## رویف (دل)

(۴۵)

یہ بے شعور جب سے ہوئی مبتلائے گل  
چنتا نہیں ہے اس کی نظر میں سوائے گل  
بھولی ہوئی ہے خیرِ قیام و بقائے گل  
ہے کس قدر ہلاک فریبِ وفائے گل  
بلبل کے کار و بار پہ ہیں خندہ ہائے گل

مدت سے یاد گل میں غنادل کو تھا شغف  
اشجارِ برگِ بارے سے خالی تھے صفِ بصف  
اب گل سے شاخ شاخ ہوئی جامِ جمِ بکف  
آزادی نسیم مبارک کہ ہر طرف  
ٹوٹے پڑے ہیں حلقہٴ دام ہوئے گل

جوشِ بہار میں کوئی غنچہ اگر کھلا  
کتر کسی طرحِ دلِ صد چاک سے نہ تھا  
سمجھنا نہ کوئی خستگی گل کا مہرا  
جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا

اے وائے نالائِبِ خونیں نوائے گل

جب پائے بوس کی بھی اجازت مجھے نہ دو  
کم قسمتی کا اپنی گلہ مجھ کو کیوں نہ ہو  
جرمِ بنوں رگاؤں جو آنکھوں پاؤں کو  
خوش حال اس حریفِ یہ مست کا کہ جو

رکھنا ہو مثل سایہ گل سر بہائے گل  
کہتا ہوں ہو نہ یہ کہیں تیرے گلے کا بار  
گل کو جو دیکھتا ہوں کھلتا ہر دلیں خار

اس کے وجود پہ ہے مجھے رشک بار بار      ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار  
میرا رقیب ہے نفس عطرائے گل

دل تنگ آگیا ہے غم روزگار سے      فرحت ہو خاک سیر گل ولا زار سے  
خالی ہے ہاتھ سر میں گرانی غار سے      شرمندہ رکھتے ہیں مجھے باد بہار سے  
مینائے بے شراب و دل بے ہوائے گل

بو باس اس نے حسن میں حاصل ضرور کی      لیکن وہ بات اس میں کہاں تھیے نور کی  
نسکین کیا ہو اس سے دل ناہمو کی      سطوت سے تیرے جلوہ حسن غیور کی  
خوں ہے مری نگاہ میں نگِ ادائے گل

رکھتا ہے غنچہ دل میں ازل سے چسک      سنبل کو کر رہی ہے پریشاں تری لشک  
نرگس بھی چاہتی ہے تیرے نور کی جھلک      تیرے ہی جلوہ کا ہے بدھوکا کہ آج تک  
بے اختیار دوڑے ہے گل در قضاے گل

پھیلی ہے جسکی بوئے دل آویز چار سو      چل چڑ جس سے ہر گل خنداں کو رنگائے بو  
مرزا کو جس کی باغ جہاں میں ہے جستجو      غالب مجھ سے اس سے ہم آغوشی آرزو  
جس کا خیال ہے گل حریف قبائے گل



## رولیف (ن)

(۴۶)

اب وہ دل اور وہ خیال کہاں      وہ تصور وہ دیکھ بھال کہاں  
وہ خوشی اور وہ ملال کہاں      وہ فراق اور وہ وصال کہاں  
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

جب تک آزادہ جہاں ہم تھے      دید بازی میں ہم نے دن کاٹے  
دل ہے اب اور غم ہیں دنیا کے      فرصت کار و بار شوق کسے  
ذوقِ نظارہ جمال کہاں

اب نہ دل میں خیال گیسو کا      اور نہ آنکھیں ہیں محو شوقِ لہ  
و لولہ مٹ گئی جو دل میں تھا      دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رھا  
شورِ سودا کے خط و خال کہاں

کیا کروں گردِ دشتِ زمائے      حوصلے پست کر دیئے دل کے  
نہ رہا وہ سخن : ذوقِ مجھے      تھی وہ اک شخص کے تصور سے

اب وہ رعنائی خیال کہاں  
بہر چکا توں دل میں جتنا تھا      کوئی قطرہ جگر میں بھی نہ رھا

ہمنشیں طعن کیا یہ مجھ کو دیا      ایسا آسان نہیں لہو رونا

دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

تھے کبھی خاک آستانہ عشق      اب نہ وہ ہم نہ وہ زمانہ عشق

جیب پرستی تو تھے یگانہ عشق      ہم سے چھوٹا قارخانہ عشق

واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

جورِ گردوں اٹھائے جاتا ہوں      ٹھوکر میں صبح و شام کھاتا ہوں

روز ایذا نئی اٹھاتا ہوں      فکر دنیا میں سرکھپاتا ہوں

میں کہاں اور یہ وبال کہاں

کہئے مرزا کا حال کیا غالب      بے طرح ضعف ہو گیا غالب

ہے یہ پیری بھی کیا بلا غالب      مضحکہ منہل ہو گئے قوی غالب

وہ عناصر میں اعتدال کہاں

اے مرزا غالب اس شعر کے متعلق عبدالرزاق شاکر کو بیڑ لکھتے ہیں "بندہ نواز زبان فارسی میں خطوں کا کھنٹا

پہلے سے متروک ہے۔ یہ براہِ مری و ضعف کے صدروں سے محنتِ نزدیکی و جگر کاوی کی قوتِ مجھ میں نہیں رہی

حرارتِ غریبی کو زوال ہے اور یہ حال ہے کہ وہ مضحکہ منہل ہو گئے قوی غالب : وہ عناصر میں اعتدال کہاں۔

کچھ آپ کی تخصیص نہیں۔ سب دوستوں کو جن سے خط و کتابت رہتی اردو ہی میں نیاز مانے لکھا کرتا ہوں

اس مکتوب میں آگے چل کر فرمایا ہے "اور میں اب انتہائے عمر ناپائیدار کو پوچھ کر آفتابِ لب با او"

بجومِ امراضِ جسمانی و آلامِ روحانی سے زندہ درگور ہوں۔ کچھ یادِ خدا بھی چاہیئے نظم و شری قلم رو کا انتظام

ایزدانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا ہے اگر اس لے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان

باقی و قائم رہے گا۔" اشارہ ایسے ہی نظر آتے ہیں۔



بھاگا ہوں دام توڑ کے آفت رسیدہ ہوں      بیجا نہیں جو سایہ سے اپنے زمیدہ ہوں  
 ہیبت زدہ ہوں چاشنی غم چشیدہ ہوں      ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں  
 میں دستِ غم میں ہوئے صبا دیدہ ہوں

کہتے ہیں یوں تو سب مجھے با اختیار ہو      لیکن خدا گواہ جو کچھ اختیار ہو  
 مجبور جو ہو پھر اسے کیا اختیار ہو      ہوں درد مند جبر ہو یا اختیار ہو  
 مگر نالہ کشیدہ گرا شک چکیدہ ہوں

چکے ہوئے ہے غصہ غم کا زہ دہن      خوش ذائقہ حلاوتِ جاں سے ہو کیا دہن  
 اس درجہ تلخ تقادمِ آخر مرا دہن      جاں لب پر آئی تب بھی نہ شیریں ہوا دہن  
 از بسکہ تلخی غم ہجراں چشیدہ ہوں

بے حس ہوں مثل عضو معطل پڑا ہوا      جنبش مجھے ہو ذرہ برابرِ حال کیا  
 میں لائقِ جزا ہوں نہ مستوجبِ سزا      نے سب سے ملا کہ نہ ساغر سے واسطہ

میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں  
 ہوں دشمنِ فرشتہ نہ جنِ وہری سے لاگ      حیواں کی تاک میں نہ کسی آدمی سے لاگ  
 اپنے سے ہے لگاؤ نہ کچھ غیر ہی سے لاگ      ہوں خاکسار نہیں مجھ کو کسی سے لاگ  
 نے دانہ فنادہ ہوں نے دام چیدہ ہوں

پوچھو نہ ہمدرد مری حسرت کی داستاں  
حراماں نصیب کر کے قضا لاتی ہے یہاں  
نا کامیاں نصیب میں وہ ہیں کہ الاماں  
ظاہر ہیں میری شکل سے فسوس کے نشاں

خاراں سے دست ہندیاں گزیدہ ہوں  
سنبیل نے اپنی زلف کے کھوئے نہیں شکیں  
سبزان باغ ابھی نہیں گرم دلاں و غنچ  
باغ خیال دل سے ملنے ہوئے ہے رنج  
ہوں گرمی نشاطِ تصور سے لغتہ سنج  
میں عنذلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

مسکن نہ آسماں نہ زمیں ہے مری جگہ  
کرسی ہے اور نہ عرش بریں ہے مری جگہ  
میں خود کہیں ہوں اور نہ کہیں مری جگہ  
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ  
ہوں میں کلام لغز و لے ناشفیدہ ہوں

ہے اک زمانہ بربرِ کین و مخالفت  
دنیا کو ہے عروج میں میرے مزاحمت  
پہناں ہے مشتری کی نظر سے مری صفت  
جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت

میں پوسف بر قیمت اول خریدہ ہوں  
مشرک میرے کیوں ہے زمانے کو قال و قیل  
میں بھی ہوں اپنے رنگ میں بے مثل و بیحدیل  
ہے نیکوں نے فرض کر لیا بد خجہ کو بے دلیل  
اہل و ع کے زمرے میں ہر چند ہوں ذلیل  
پر عاصیوں کے فرقے میں ہیں ہرگز نہ ہوں

مرزا ہی سے نہیں ہے زمانے کو کچھ حسد  
میں نے بھی بن گئے انسان دام و دود  
اس طرح کھائے لینے میں جسکی نہیں ہے حد  
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد

ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردِ گم‌نیزہ ہوں

ہم سے بڑا تو برا ہو تو بھلا کہتے ہیں      لطف بیجا کو جوان پر ہے بجا کہتے ہیں  
کچھ صواب اس نے کیا بھی تو خطا کہتے ہیں      کی وفام سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں  
ہوتی آئی ہے کہ آنچھوں کو برا کہتے ہیں

دل پریشان ہے غموں میں پریشیاں اپنے      ایسی آشفٹہ بیانی کو کوئی خاک سے  
کہہ نہ بیٹھیں کہیں کچھ اور خدا خیر کرے      آج ہم اپنی پریشانیِ حاطران سے  
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

دردِ دل خود بھی جو رکھتے تو سمجھتے اسکو      دردِ انگیز ہیں اندوہ فرا ہیں یہ تو  
سارنگ سے مگر اب پتھر یہ کہیں سب سن لو      اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو  
جوے و لغزہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

راتِ دن بہتی ہے بیانیِ رخ کی حالتِ غش سے      ناکش خاک ہوں تہی ہو بری گشتِ غش سے  
بے تامل جاتا ہے ملتی ہو جہالتِ غش سے      دلیں جا بے ہوتی ہو جو فرصتِ غش سے  
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

ہی ہو سہ بخیز شرک ہے دلی سے مفقود      ہم معبود ہیں نہ کہے کے نہ کعبہ معبود  
رو بقبہ میں تو صرف ایک جہتِ مقصود      ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود

قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

یوں تو کانٹوں پر ہمیشہ ہمیں ترپایا ہے      اب محبت کا تری لطف مگر پایا ہے  
حالتِ زار پہ تو بے جو ترس کھایا ہے      پائے اوکار چبے تجھے رحم آیا ہے

خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

سوزِ باطن کا جو کچھ حال ستم کرنے سنا      دلنشین ہوئے کو تھا ہی کر یکا یک جھجکا  
ہم نے بھی رنگ بیاں کو وہیں اپنے بدلا      اک شہر دل میں ہر اس کو کوئی گھر ایسا کیا

اگل مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

کرتے ہم رد و قدح اس سے تو ہوتا دل ننگ      گفتگو کرتے ہوئے رہتا ہے مادہ بھنگ  
ہاں میں ہاں اسکی ملاتے ہیں تو بڑھتی ہوا مٹنگ      دیکھئے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ

اس کی ہر بات پر ہم نام خدا کہتے ہیں

سن کے یہ سانحہ مرزا سبھی رو دیں شاید      جو سخن سنچ ہیں اس غم کو نہ بھولیں شاید  
بزمِ ماتم ہو پیا بزمِ سخن میں شاید      وحشت و شیفقتہ اب مرثیہ کہیں شاید

مر گیا غالب آشفقتہ نوا کہتے ہیں

۱۷۷۱ء۔ ایک قسم کی گھاس جسکے متعلق روایت ہے کہ جو اسکو اپنے پاس رکھتا ہے لوگ اس پر مہربان ہو جاتے ہیں گویا ربِ حب کا اثر رکھتی ہے جس سے تجھے رحم آیا ہے ہمارے ہی کچھ لیا ہے کہ تیرے راستے کے کانٹے "مہر گیا" کا اثر رکھتے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے تو ہم پر مہربان ہوا ہے ۱۲۷۱ء آشفقتہ نوا پریشان مایس کہنے والا۔ وحشت و شیفقتہ دونوں غالب کے ہم عصر شاعر اور دوست تھے۔ اس شعر میں وحشت و شیفقتہ کے الفاظ خاص طور پر بھولی ہوئی ہیں۔ وحشت صاحب کا نام غلام علی خاں اور شیفقتہ کا نام نواب مصطفیٰ خاں تھا۔ وہ جہانگیر آباد کے رئیس تھے جنکا شیفقتہ صاحب ایک مانے ہوئے گن فہم اور کس کس تھے جو دہلی میں رہتے تھے وہ غالب کی عظمت کے حد سے زیادہ متعجب

عشق کیا جب شمل قمری طوق گردن میں نہیں      وہ جنوں کیا پھڑس کر زم اگر تن میں نہیں  
اسکو جنوں کیا کہیں جس کا مکان بن میں نہیں      آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں

ہے گریباں سنگ بیراہن جو دامن میں نہیں

پہلے دامن میں جو گلکاری تھی گلشن میں نہیں      لطیف خونباری جو متحاصر کلاں میں نہیں  
دل تو دل اب تو لہو گہاے گردن میں نہیں      ضعف سے لے کر کچھ باقی مستی میں نہیں

رنگ ہو کر اڑ گیا خوں کے دامن میں نہیں

چونکہ دیواریں ہوئی تھیں سداہ آفتاب      اسلئے وہ در ہوا ہے سجدہ کاؤ آفتاب  
حق جو درد دیدہ نگاہی اک گناہ آفتاب      ہو گئے ہیں جمع اجزاء نگاہ آفتاب

ذرے اسکے گھڑی دیواروں کے وزن میں نہیں

در سیر خانہ کا میرے اک دربان خیر ہے      موت کے مزے میں ہوں جیسے طبیعت خیر ہے  
ذرے افکر ہیں زمین خاک سید کا ڈھیر ہے      کیا کہوں تاریکی زندانِ غم اندھیر ہے

بینہ نور صبح سے کم جسکے روزن میں نہیں

اس کو مارا اس کو زندہ کر دیا عجائز سے      اسکو غم سے کیا بسمل تو اسکو ناز سے  
گھر بنایا اس نے ہر دل میں نئے انداز سے      رونق ہستی ہے عشق خانہ ویران ملک سے

بقیہ ۵۵۔ معتقد احمد رشاس تھے ان دونوں کو اس مقطع میں یاد کرتے ہیں۔ ۳

انجن بے شمع ہے گر برق خرمین میں نہیں

غم بھر میں اس نے لے دیکر فقط یکساں طعن دیکھے انصاف سے تو سرسبز بیا ہے طعن  
نہ فقط نا تجربہ کاری کہ یہ کرتا ہے طعن زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن

غیر سمجھا ہے کلدت زخم سوزن میں نہیں

جیسے ہی اک شکر گل کے خوب نفاٹے ہوئے مرے بھی پوئے یوں ہی اربان دل ساک ہوئے  
قبر میں پیشِ نظر وہ گل سے رساں ہوئے بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے ماے ہوئے

جلوہ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

کرنہ درماں چارہ گر مجھ خستہ ورنجور کا ہر سام اک زخم ہوگا اس تن محروم کا  
دل کی حالت دیکھ چھٹا ہو گیا زنبور کا قطرہ قطرہ اک ہیو لاپے نئے ناسور کا

خوں بھی ذوقِ درد سے فاسخ مئے تن میں نہیں

کثرت سے پر توجہی پر مینا نہ کو مٹی ڈٹ گیا میں زندہ پینے پر تو قلعی کھل گئی  
ایک کش میں خم کے خم خالی کئے اور بس نہ کی لے گئی ساقی کی نخوت قلمز آشامی مری

موج سے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

غم تو آئیکے بھر کیونکر نہ اٹھے دل سے دوو کیا ادھیڑا پنجہ پیری نے تن کا تار و بود  
نیستی ہے اپنی ہستی اور عدم اپنا وجود ہو فشا رضعف میں کیا ناتوانی کی نمود

قر کے جھکے کی بھی گجائش مئے تن میں نہیں

کس طرح مرزا ہوا اسکی دیدہ خلقت میں قدر مال میں جس کا نہ حصہ ہو نہ ہولت میں قدر



قد کی مشرعت ہر جہت ہو قسمت میں قدر  
حقی وطن میں شان کیا غالب ہو غرست میں قدر  
بے تکلف ہوں ہر مشقت خس کر گلشن میں نہیں



اب جو مستان گھٹا اے برستی ایک دن  
اَوّل جل کر اٹھائیں لطف ہستی ایک دن  
دیکھ لو گے بخودوں کی تیز دستی ایک دن  
ہم سے کھل جاؤ بوقت بے پرستی ایک دن  
در نہ ہم پھیریں گے رکھ کر ہر مستی ایک دن

جب گرد میں دام تھے ہر مغال تھا ہریاں  
ایک دن اپنے اپنے پلانے سے تھی تب فرصت کہاں  
مظنی میں بھی نہ اس جسکے سے باز آن زباں  
قرص کا پیتے تھے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں  
رنگ لائے گی ہماری فاقہ ہستی ایک دن

ہے بہا اس دور کی ایک ایک ساعت جانے  
اس کی رونق کو نہ کچھ بے قدر قیمت جانے  
زار نالی بھی جو ہو تو سارے عشرت جانے  
نغمہ ہائے غم کو بھی اسے دل غنیمت جانے  
بے صدا ہو جائیگا یہ ساز ہستی ایک دن

زعم دانانی پر اس درجہ نہ کر ناداں نہ ہو  
مثل گل پڑمردہ ہو گا ورنہ یوں خنداں نہ ہو

اے مودی محمد حسین آراء اب حباب میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ مرزا غالب قرضدار ہو گئے وضع خواہوں سے  
نالہ کر دی۔ جواب دیہی میں طلب گئے مسمیٰ صدر الدین صاحب کی عدالت تھی جس وقت یہی پر گئے انھوں نے  
یہ شعر جرحا سے قرض کی پیتے تھے اے آرزو نے مدعی کو روپے اپنی گرہ سے ادا کر دینے اور اس طرح مسرزا  
غالب قرض سے سبکدوش ہو گئے۔ ۱۲

چاردن کی رفعت موبہوم پر نازاں نہ ہو غرہ اوج بناے عالم امکان نہ ہو  
 اس بلندی کے نصیب نہیں ہر پستی ایک دن  
 شب سر محفل جو ہاتھ پائی وہ کرنے لگا کون کہتا ہے کہ غیروں نے اسے کسنا دیا  
 اس بے برتاؤ میں مہرا نہیں اس کی خطا دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا  
 ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیشدستی ایک دن

۵۱

ظاہر میں گو شغیف نہیں جہر باں نہیں ان کے ہمارے ربط کوئی درمیاں نہیں  
 لیکن خفا بھی ہم سے وہ جانِ تہاں نہیں ہم پر جفا سے ترک وفا کا گماں نہیں  
 اک چیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں  
 تم پوچھنے جو آئے تو مجھ پر کرم کیا کچھ بھی اگرچہ رسم عیادت نہ کی ادا  
 کیا کم ہے یہ نگاہِ ترحم سے دیکھنا کس منہ سے شکر کیجئے اس لطیفِ خاص کا  
 پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں  
 ہوتا نہیں وہ رام تو ہے اس کارم عزیز بڑھتا ہو جس سے شوق و شہتہ کیا ہر کم عزیز  
 خفگی کا بھی تو شوخ کی ہر کم کو غم عزیز ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز  
 ناہریاں نہیں ہے اگر ہریاں نہیں  
 کیا جانے ذوقِ جور و جفا کو عدو سا ہینر ہم جس سے یاد آتے ہیں ہر ظلم ہی وہ چیز

اس لطیف معنوی کی کہاں غیر کو تیز ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز  
 نامہریاں نہیں ہے اگر مہریاں نہیں  
 کیا بات میں نے کی ہے کہ تم کو بری لگی حیرت سی نام بوسہ لب سن کے ہو گئی  
 میں نے کیا سوال تو مجھ سے خطا ہوئی بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی  
 آخر زباں تو رکھتے ہو تم گودہاں نہیں

## قطع

ہر چند خوں یار میں اک التہاب ہے ہر چند مجھ کو اس کو حضوری عذاب ہے  
 ہر چند غیظ و غصہ بوقت خطاب ہے ہر چند جاں گدازی قہر و عتاب ہے  
 ہر چند پشت گرمی تاب و توان نہیں  
 لیکن جب اس سے رحم و کرم کی امید ہے جو گفتگوئے تلخ ہے حلوائے عید ہے  
 اس ذوق و انبساط میں شکوہ بعید ہے جاں مطرب تراخ ہل من فریب ہے  
 لب پر وہ سنج زمزمہ الاماں نہیں  
 صادق اگر ہے عشق تو پھر کیا ہر خوف و بیم کرنذر یار گو ہر جاں بھی نبی بیم  
 پیدا وہ درد کر کہ ہو حال جگر سقیم خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم  
 دل میں چھری چھو جو مزہ خونچکاں نہیں  
 بے داغ سینہ ہو تو نہ سینہ اسے کہو خالی ہو سوزے تو جگر کو نکال دو

مفسط اگر دہ ہو تو سلام ایسی جان کو ہے ننگ سینہ دل اگر آلت لردہ ہو  
 ہے عار دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

دشت میں مرکو پھوٹتا ہوں کھاکے پیچ و تاق دیوار و درگریں کہیں ہو کچھ تو انقلاب  
 دیوانہ ہوں تو کیا مجھے آنا نہیں حساب نقصان نہیں جنوں میں بلا ہے ہو گھر خراب

سو گز زمین کے بدلے بیاباں گراں نہیں  
 نغائبندگی کا مادہ میری سرشت میں بیت انصاف میں عمر کٹی یا کفشت میں  
 ہوتا تھا اور خاک مے بخت زشت میں کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سر نوشت میں  
 گویا جہیں پر سجدہ بت کا نشان نہیں

ہو حرف گیر اگر ہے زباں خاص و عام کی پروا نہیں کسی کے خیالات خام کی  
 شہرت ملائکہ میں بھی ہے میرے نام کی پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی  
 روح القدس اگر چہ ملا ہمزباں نہیں

مرزا سوال بوسہ لب کو وہ ہر گھڑی سن کر چوٹا لٹا ہے تو سوچتی ہر دور کی  
 جب جاں بلب سے کا تو خود ہو گا مقتضی جان ہے بہائے بوسہ کیوں کہے ابھی  
 غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

۵۲

میری تحریر جس میں لائے تفسیر نہیں میں جو ادوارہ ہوں اس میں مری تفسیر نہیں

قابلِ چارہ مری گردش تقدیر نہیں مانعِ دشتِ نوردی کوئی تذبذب نہیں  
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

دل کا اک لور ہے جو لئے پھرتا ہے کشاں بخود اتنا ہوں کہ ہے راہ بھی نظروں نہاں  
کوئی منزل بھی تو پیدا نہیں جزوِ مگماں شوقِ اس دشت میں دوڑاں ہر جھکو کر جہاں  
جادہ غیر از نگہ دیدہ تصویر نہیں

جان تو نذر میں جلاد کو دی جاتی ہے اس کے خوش کرنے کی تدبیر تو کی جاتی ہے  
لیکن امیدِ جفا قطع ہوئی جاتی ہے سیرتِ لذت آزار رہی جاتی ہے  
جادہ راہِ فتنہ بزدل شمشیر نہیں

نہیں ناکامیِ فریاد کی پروا مجھ کو نہ خیالِ آہ کی برباد روی کا مجھ کو  
ہو نہ پوری نہ سہی ہے تو تمنا مجھ کو رنجِ نومبری جاوید گوارا مجھ کو  
خوش ہوں گریزاںِ ربونی کش تاثیر نہیں

خشک ہو زخمِ توبے چینِ دل اپنا ہو جائے جب تک اک زخمِ بیاور نہ پیدا ہو جائے  
سنگِ طفلان جو نہ کھاؤں مجھے سودا ہو جائے سر کھاتا ہے جہاں زخمِ سراپا ہو جائے  
لذتِ سنگ باندازہ تقدیر نہیں

کر یا عفو کا جب وعدہ راسخ اس نے کون شرمندہ ہو پھر شرمِ گنہگاری سے  
نفس کہتا ہے کہ لے خوب گناہوں کے مجھے جب کرمِ رخصتِ بیباکی و گستاخی دے  
کوئی تقصیر بجز نجلتِ تقصیر نہیں

وہ بھی مرزا سا جریدہ ہے بقول ناسخ صاحب اوصاف حمید ہے بقول ناسخ  
ہند میں شاعر چمیدہ ہے بقول ناسخ غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ  
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد تیر نہیں

تری رد گزریں جو ہم دیکھتے ہیں فضا ایسی جنت میں کم دیکھتے ہیں  
گل و لالہ ہر جہاں ہم دیکھتے ہیں جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں  
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں  
ہوئے ہم جو مشتاق اس کے سخن کے یہ آثار گویا ہیں دیوانہ پن کے  
دہن ہی نہیں اس بے سحر فن کے دل آشفنگاں خال کنج دہن کے  
سویدرا میں سیرِ سرم دیکھتے ہیں

۱۔ یہ ترقی کی علامت اور اس کے کلام کی عظمت کا ہر ساعے اعتراف کیا ہے دوقی نے کہا ہے سہ  
رہ ہوا پر۔ ہوا تیسرے کا امداد نصیب دوقی یا رسول ہے بہت دور غزل میں مارا  
ستودار یا کبھی کہا ہے سہ ستودار تو اس غزل کو سزل دوقی کہہ نہ ہونا پڑا ہے تجربے استاد کی طرف  
عالم یہ سہ ستودار گزراں ہمارے استاد کا اس رائے سے اتفاق کہ تا میر تقی میر کے طبع باریستا ہوئے ہیں کوئی مستر  
باقی نہیں رہے جیسا کہ انھوں نے کہا ہے سہ

۲۔ رنجی کے تمہیں استاد ہیں ہو غالب کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی تیر بھی تھا  
تاج کشمیر کے مشہور ساعر اور اپنے زمانے کے استاد تھے انھوں نے فرمایا ہے کہ جو شخص میر تقی میر سے عقیدت  
ہیں رکھتا وہ بے بہرہ ہے غالب نے مقلع میں تاج کے مہر تائی کو بابر دیا ہے۔ ۱۲

ترے قدِ موزوں نے پایا وہ عالم      عجب کیا قیامت کرے خیر مقدم  
جو تو ہو خسرِ اماں تو محشرِ مسلم      ترے سروِ قامت سے اک قد آدم

قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

جو ہے حیرتِ آئینہ تجھ کو پیاری      تو اس سے بھی بڑھ کر ہے حیرتِ ہماری  
فقط اک نگہ کی ہے امیدواری      تماشا کر اے مَوَّائینہ داری

تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

رہے ہجر میں رات بھر گرم نالے      گئے قافلے جانبِ عرش ان کے  
نہ ہوتا نشان تو نشاں بھی نہ پاتے      سراغِ توفِ نالے داغِ دل سے

کر شبر و کافش قدم دیکھتے ہیں

نہیں رکھتے مرزا کسی سے مطالب      نہ دل جانبِ عیش دنیا ہے راغب  
تمنائے زر ہے نہ دولت کے طالب      بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب

تماشا ئے اہل کرم دیکھتے ہیں

جلتا ہوں ان کی گرمیِ قہر و عتاب میں      کیونکر مرے نہ پاؤں عذابِ عتاب میں  
پوچھو نہ مجھ سے گرمیِ دوزخ کے باب میں      ملتی ہے خوں سے یار سے نارِ التہاب میں

کافر ہوں گرنے ملتی ہو لذتِ عذاب میں

لے جاؤ گے صوفیہ پر

آیا ہوں درد و غم کے لئے انتخاب میں دن زندگی کے کاٹ رہا ہوں عذاب میں

ہوں عرصہ دراز سے اس پہنچ و تاب میں کب سے ہوں کیا بتاؤں جہاں خراب میں

نہ ہائے ہجر کو بھی رکھوں گے حساب میں

کیا کہتے ہوتی تھی شب غم کس طرح بسر اختر شمار یوں ہی میں ہو جاتی تھی سحر

توڑا ستم یہ اور نیا چشم شوق پر تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر

آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

آنکھوں میں پیشتر ہی نہ تھا نیند کا گزر کرتا تھا صبح ہجر میں سر پیٹ پیٹ کر

غفلت جو روتے روتے ہوئی شب کسی قدر تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر

آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

لکھ تو دیا انہیں کہ مرا حال ہے زبوں ہے ان سے آرزوئے تسلی تر اجنوں

آگاہ ان کی عادت و خصلت و خوبئیں قاصد کے آتے آتے خط اکا اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے تو آئیں

رہتے تھے ہم پیالہ جہاں ان سے خاص عام اٹھنا تھا ایسی بزم سے میں روز نشہ کام

پینے میں آج مجھ کو نہ ہو کس طرح کلام مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا اور کجا م

ساقی نے کچھ ملانا دیا ہو شراب میں

لے تا آتشِ دوزخِ التهابِ منہلوں کا بھر کنا۔ فرماتے ہیں محبوب کی بد خوئی بھی میرے لئے سامانِ راحت ہے۔ دوزخ

کا آگ بھی شعلہ زنی اور بجھنے میں اس کی خوشی سے متا بہت کھتی ہے اس لئے یہ بھی میرے لئے سامانِ راحت ہے اگر میں

ایسا نہ سمجھوں تو کافر ہوں عشق کا ایمان یہی ہے ۱۲۰



آنکھیں بھی راہ میں جو بچھاتا ہوا چلے      ممکن نہیں کہ مکروفسوں غیر کا چلے  
چالیں ہزار بار سے یہ پردہ غاپلے      جو منکروفا ہو فریب اس پہ کیا چلے  
کیوں بدگمان ہوں دوست دشمن کے بائیں

دھڑکا مجھے تو یہ ہے کہ دشمن نہ آئے      جاتے ہوئے تمہیں مئے گھر سے نہ دیکھ لے  
تم ہنستے ہنستے ہو گئے خاموش کس لئے      میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ قریب سے  
ڈالاجے تم کو وہم نے کس بیچ و تاب میں

وہ آن میرے گھر جو چلے آئے مستی سے      شکر خدا کہ ہو گئے قصے تمام طے  
جاتے لئے وصال کا وعدہ بھی کر گئے      میں اور خط و وصل خدا ساز بات ہے  
جاں نذر دینی بول گیا اضطراب میں

سیرِ بدہ کچھ اثر ہیں نمایاں عتاب کے      لیکن ہیں چپ خیال سے شرم و حجاب کے  
آثارِ بات بات میں ہیں بیچ و تاب کے      بے تبوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے  
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

آنا ہے یوں تو ان کو لڑانا نگاہ کا      نظر میں بچا کے سب کی، ملانا نگاہ کا  
آفت ہے اُف مگر نہ اٹھانا نگاہ کا      لاکھوں رگ و ایک چرانا نگاہ کا  
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

لے لگاؤ سے لگاؤ یا محبت مرا ہے۔ فرماتے ہیں دوست کی لاکھوں لگاؤ میں ایک طرف اور لگاؤ کا چرانا ایک طرف۔ اسی طرح مصرع ثانی میں لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف اور غصہ میں بگڑنا ایک طرف۔ دونوں مصرعے ہم اند اور لاجواب ہیں۔ عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ ایسا ہی گزرتا ہے معشوق کی (باقی ص ۹۷)

وہ نالہ جو کہ عرشِ معلٰی کو بھی ہلائے      وہ نالہ جو زمین کو بھی زلزلے میں لائے  
 ۲ وہ نالہ اور کان تک اس شوخ کے بجائے      وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے  
 جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

جادو وہ چیز ہے کہ جو اس کو عمل میں لائے      مشکل سے مشکل امر کو آسان کر دکھائے  
 لیکن مجھے یہی تو ہے افسوس ہائے ہائے      وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے  
 جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

تھے یا تم پیالہ ہمارے سبھی کبھی      دیکھانہ ہم نے ہوش میں مرزا کو بھی کبھی  
 وہ دن کہاں کہ شغل سے فرصت نہ تھی کبھی      غالب جھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی  
 پیتا ہوں روزِ ابرو شبِ ماہِ تاب میں

۵۵

جامِ سبو کو رکھ نہ بچا کر سحاب میں      شامل نہ کر صبوحی کو شب کے حساب میں  
 وہاں کچھ کمی نہیں کہ ہے تو اضطراب میں      کل کے لئے کر آج نہ خستِ شراب میں  
 یہ سوئے ظن ہے ساقی کو تر کے باب میں

گردِ شبنم سے پیوستہ لگاؤٹ عاشق کے لئے بہت بڑی چیز ہے اور عاشق کی نظر میں مکہ چرانہ لگاؤٹ سے بھی زیادہ  
 ۲ دلفریب ایک طرح معنوں بناؤنگار میں ہمایوت دلفریب ہونا ہے مگر اس کا عہد سے مجھڑا مکہ بناؤ سے بہتر ہوا ہو جاتا ہے  
 مولانا آئندہ جو بیٹہ سادہ کلام کو پسند کرتے تھے اور عاشق کی پیچیدہ گوئی پر حرف رکھتے تھے اس شو کو سنکر نہایت  
 خوش ہوتے مگر طرزِ بطور مزاح یہ کہا یہ تو ہماری طرز کا شعر ہے اس میں غالب کی کون سی خوبی ہوئی۔ ۱۳

یا تو ملائکہ سے بھی مخامخ مرتبہ بلند ہم سا نہیں ہے یا کوئی اب نوار و مستند  
 پہونچا رہا ہے ہر تنفس ہمیں گزند ہیں آج کیوں ذلیل کر کل تک تھی پسند

گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

آخرب کیوں روح کا قالب سے انزع کیوں بڑھکے کرب سانس کا ہونا ہے انقطاع  
 سننے سے اسکے کہتے ہیں کیوں ہوش اوداع جان کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دم سماع  
 گروہ صدا سمانی ہے چنگ و رباب میں

کہتے ہیں صاف صاف یہ انداز چال کے لینا نہیں مردم سے ادھر دم کہیں اسے  
 بے اختیار ہوں کہیں مجھ کو گرانہ دے رو میں ہے رخس عمر کہاں دیکھے تھے  
 نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

کی لاکھ فکر ہستی آشیاب میں پے پے قصہ ہوانہ ان کے وجود و عدم کا طے  
 چرت میں مبتلا ہوں کہیں بھی ہوں طرف نشے اٹنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے  
 جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

ایجاد کیا کہ موجد و وجود ایک ہے سب معبودوں میں عابد و معبود ایک ہے  
 کیا ذکر سجدہ ساجد و مسجود ایک ہے اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے  
 جبرائیل ہوں پیر شاہدہ ہے کس حساب میں

موج و حباب میں ہے مقرر وجود بحر ان کا وجود بھی ہے سراسر وجود بحر  
 کہتے انھیں عرض تو ہے جو ہر وجود بحر ہے مشتمل نمودِ صورت پر وجود بحر

یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں  
 جیتے ہیں تازہ حسن سے ہم کو ہوا آگئی ہے رہروں کے واسطے سامان گوی  
 جب چھپ سکے نہ ذات سے پڑے کی کیا رہی شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے ہی  
 ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں  
 گو خود نما نہیں ہے وہ پردہ نشیں ہنوز نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز  
 ہے مونا ز خود بھی وہ ناز آفریں ہنوز آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز  
 پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں  
 اشیاء کی ہے تصور اشیاء سے سب نمود دیکھا جو غور سے تو خیالی ہیں سب جو د  
 استی کی وابستہ کی ہڈت ہر ہست بود ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود  
 ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں  
 مرزا کو ایک عمر سے ہے جستوئے دوست کچھ آرزو نہیں ہے بحر آرزوئے دوست  
 آنکھیں ہیں منہشیں کی طرف دل ہر سوئے دوست غالب نیم دوست کو اتنی ہر سوئے دوست  
 مشغولِ حق ہوں بندگی بو تراب میں

کس طرح رو کوں گریہ شام و سحر کو میں  
 کس کس کے سچ و غم میں کھپاؤنگا سحر کو میں  
 رولے میں روزِ بیٹیوں کہیں چشمِ ترکو میں  
 جیلِ ہون ل کو روؤں کہ بیٹیوں کے ترکو میں

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوم گز کو میں

مانا نہ دل سے تیرا چہ دشمنوں کو دوں      آگاہ تیرے نام سے اغیار کو کروں  
آوارہ و خراب تری جستجو میں ہوں      چھوڑا نہ رشک لے کر تیرے گھر کا نام لوں

ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جس راہ میں قدم کا بھی رکھنا تھا ننگے عار      طے سر کے بل کیا اسے اللہ رے اضطراب  
دم بھر کو بھی تو دل لے نہ لینے دیا قرار      جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار

اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

آہ میرے قتل کو کس زعم پر ہوئے      انجان تم نے جان لیا جان من مجھے  
دھمکی میں تو وہ آئے نہ معلوم ہو جسے      ہے کیا جو کس کے بازو دھو گے میری بلا ڈرے

کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

میں جانتا تھا مجھ کو فقط ان سے کام ہے      لغت ہو ماسوا سے تو سودائے خام ہے  
اس پر بھی ہے بہ قدر تو میرا سلام ہے      لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ نام ہے

یہ جانتا اگر تو سنا تا نہ گھر کو میں

کرتا ہوں سو قدم بھی اگر طے نہ تو کیسا تھ      یعنی ہر اک قدم پہ ہوں کہ خضر نو کیسا تھ  
آہستہ رو کے ساتھ کبھی تیرو کیسا تھ      چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کیسا تھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہر چند بت کدوں ہی میں سب عمر دی گزار      لیکن خدا گواہ کہ ایماں ہے برقرار

ہاں شوق دید کا تو ہوں بیشک گناہگار خواہش کو محنتوں نے پرستش دیا قرار  
 کیا پوچھا ہوں اس بتِ بیدار کو کہ میں  
 پھر گم ہوا تلاش میں اس کی میں دلفگار ہوش و تواں پر نہ رہا پھر کچھ اختیار  
 پھر سچی و جستجو کا جنوں سر پہ ہے سوار پھر بخودی میں بھول گیا راہ کوئے یار  
 جاتا و گرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں  
 پرسانِ حال کوئی ہنر کا نہیں رہا باقی جہاں میں قدرِ ہنر و نہیں ذرا  
 مجھ کو یہ زعم اب بھی ہی گاہک ہزار ہا اپنے پہ کر رہا ہوں قیاسِ اہل دہر کا  
 سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں  
 مرزا میری دعا بھی یہی ہے بعدِ نیاز دیکھوں جمالِ بار میں اے رب کار ساز  
 جس طرح پہلے کہہ گیا ہے اک سخن طراز غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ سمنند ناز  
 دیکھوں علی بہادر عالی گہر کو میں

اے مقطع میں اب علی بہادر جاں والی باندہ کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے مرزا غالب کو اپنے یہاں مدعو کیا تھا  
 ایک خط میں اوارالہ رولہ منفق کو یوں تحریر فرماتے ہیں میرے باندہ بندیل کھنڈا آنے کا میں نے سر سامان کر لیا  
 ڈاک میں روپیہ ڈاک کا دے دیا قصدِ برتا کر فتح پور تک ڈاک میں جاؤں گا وہاں سے نواب علی بہادر کے ہاں کی  
 سواری میں جا کر باندے میں ہفتہ بھر رہ کر کالی ہو جاتا ہوں آپ کے قدم دیکھتا ہوں اسبیل ڈاک دلی چلاؤں گا  
 ناگاہ مصور والا بیمار ہو گئے (ظہر بادشاہ) اور مرض نے طول کھینچا وہ ارادہ قوتِ فعل میں آیا۔



کون کہتا ہے خفا مجھ سے وہ مغرور نہیں      کینہ و بغض جو مجھ سے ہے وہ متور نہیں  
 لے سکے نام مرا کوئی یہ معتدور نہیں      ذکر میرا بدی بھی اسے منظور نہیں  
 غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں  
 بعد اک عمر کے بیدار ہوا طالع شوق      خوش نصیبی ہے کہ چرکا تو ذرا طالع شوق  
 آج تو برسریا رہی ہے مرا طالع شوق      وعدہ میر گستاں ہے خوشا طالع شوق  
 مردہ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں  
 ہے فقط نقطہ موہوم اگر ہے عالم      دہن اس شونخ دل آرا کا مگر ہے عالم  
 وہم ہی وہم ہے گو پیش نظر ہے عالم      شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم  
 لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں  
 غور سے دیکھ اگر رکھتا ہے چشم باطن      تجھ پہ کھل جائے گا یہ عقدہ مشکل کن  
 جزو ہو کل سے جدا یہ نہیں ہرگز ممکن      قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن  
 ہم کو تقلید تنگ ظرفی منصور نہیں

۱۔ عاتب صاحب نے ایک خط شاہ عالم باہروی کو لکھا :-

مشفق، مکرئی! چودھری عبدالغفور صاحب کو میرا سلام کہئے گا اور یہ پیغام پہنچائیے گا کہ حضرت صاحب عالم  
 کی متائے دیدار بقید ماہرہ کنایہ اس سے بے کراور کسی کا بھی دیدار مطلوب ہے۔ خواہش وصل مقدر و بڑ جوید کو  
 نہیں۔ معروضاتی ترمیم کے ساتھ لکھا۔

وائے ناکامی امید کہ ہمت نہ رہی ہار غم جس سے اٹھاتے تھے وہ قدرت نہ رہی  
خوصلہ دل کا ہوا پست وہ جرات نہ رہی حسرت لے ذوق خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی  
عشق پر عہدہ کے گوں تن رنجور نہیں

ہنس کے کہتے ہیں گئے آپ اگر جنت میں ہوں گے غلمان ہی غلمان ہاں یا چوریں  
کچھ تعجب نہیں جو آپ وہاں چور ہیں میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں نکلیں  
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم چور نہیں

یہ تو ممکن نہیں تو دل سے مجھے بھولا ہو ہاں جو اغماض سے لے کام تو چارہ کیا ہو  
کچھ یہاں بھی رہے یاد کا تو اچھا ہو ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو  
تو تغافل سے کسی رنگ میں معذور نہیں

لے خوشا بزم طرب جس میں ہم ہیں ہم لوگ دافح رنج و الم دشمن غم ہیں ہم لوگ  
آج تک راہِ رو نقشِ قدم ہیں ہم لوگ صاف ورد کی شہ پیمانہ ہم ہیں ہم لوگ  
وائے وہ بادہ کرا فشر دہ انگور نہیں

ہے فدائی مرے نکمتوں کا فدائی غالب میری حکمت کا ثنا گر ہے شنائی غالب  
پوچھو مرزا سے مری نغمہ سرائی غالب ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب  
میرے دعوے پر یہ جہت ہے کہ مشہور نہیں

قابل رجز فغانِ دل ناشاد نہیں آہ وزاری یہ مری لائق ایراد نہیں  
ہے فقط یاد دہانی کوئی فریاد نہیں نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں



ہے تقاضا، بخا شکوہ سیداد نہیں  
 عاشقوں کو نہیں محبوبے جاں بھی محبوب      ہاں سمجھتے ہیں رضا جوئی دشمن معیوب  
 ننگِ عشاقِ مخافِ باد کا بیجا اسلوب      عشق و حروری عشرت گہر کی انوب  
 ہم کو تسلیم کنو نامی فرحاد نہیں  
 رقصی تخی خانہ نشینی تنگ دوسے فروم      اب کاوٹ دم و حشت ہو نہ دل ہے مغموم  
 گویا ہاں میں ہے آبادی و رونقِ مقدم      کم نہیں وہ بھی خرابی میں یہ وسعت معلوم  
 دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھریا د نہیں  
 ہر تغیر سے زمانہ کے ہے عبرت مطلب      دور اس کا سبق آموزی عالم کا سبب  
 یہ مودب وہ ہے جو خوب کھاتا ہے ادب      اہل بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب  
 کلمہ موج کم از سیلی استاد نہیں  
 کس خموشی سے توجیلائے ہم جو رجوا      آہ و نالہ کو کیا ضبط سمجھ کر شکوا  
 پھر بھی سمجھانہ تم گارے پابندِ رضا      وائے فروغی تسلیم و بداحالِ وفا  
 جانتا ہے کہ ہمیں طاقت فریاد نہیں  
 آشیانے سے قدم اب تو نکال اپنا کہیں      اب نہیں ہے وہ زمانہ کہ رہے گوشہ نشین  
 شکر کر آج کوئی دام نہیں فرشِ زمیں      بدگل کے تلے بند کرے بے گل چیں  
 مرده اس مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں  
 دل کے لینے کو تو ہر دم نفاقتا خلا لا      بوسہ مانگا تو بہ تکرار یہ بولا لا لا  
 ف خوب گل چہرے اڑا کوئی مزاجم ہی نہیں۔

مقا تو معدوم دہن لانے معما کھولا      نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا  
 دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجا نہیں  
 شبنم اس عشرت گلزار یگر یاں کیوں ہے      دیدہ نرگس حیرت زدہ حیراں کیوں ہے  
 منقبض غنچہ گل وقت بہاراں کیوں ہے      دیدہ نرگس حیرت زدہ حیراں کیوں ہے  
 گر چراغان سر رہ گزر بار نہیں  
 تم اگر بھول گئے اپنی حکایت غالب      سن لو مرزا سے وہ پردرد روایت غالب  
 ہو گئی سہو کی یہ کیا تمہیں عادت غالب      کہنے کس منہ سے ہو غربت کی شرکایت غالب  
 تم کو بے چہری یا ران وطن یاد نہیں

مرے عقائدِ راسخ میں کچھ فساد نہیں      خدا نخواستہ میں منکرِ معاد نہیں  
 غلط کہ یاد مجھے طولِ روزِ داد نہیں      نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں  
 شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں  
 یہ بات ساقیِ مہوش نے کیا بنائی ہے      کہ ہو نہ ابر تو پینے میں کیا برائی ہے  
 ہمیشہ کیا اسی صورت سے پی پلائی ہے      کوئی کہے کہ شبِ مہم میں کیا برائی ہے  
 بلا سے آج اگر دن کو ابر باد نہیں  
 کریں رقیبِ برائی بھی تو بُرا نہ کہیں      بھلائی لاکھ ہو مجھ سے مگر بھلا نہ کہیں

کبھی زباں سے کوئی کلمہ خیر کا نہ کہیں جو آؤں سامنے ان کے تو مرجانہ کہیں

جو جاؤں پاس سے ان کے تو خیر یا نہیں

دل و ہجر غم و ایزائے رشک بستے ہیں سرشکِ خون جگر چشم تر سے بہتے ہیں

عرو کے ساتھ وہ مصروفِ عیش ہتے ہیں کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں

کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

کھلا ہی رہتا ہے اٹھوں پہر فیضِ کباب اس آستانے سے ملتا نہیں کسی کو جواب

جو صرف راہِ خدا ہو نہیں کچھ اس کا حساب علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب

گدائے کو چہ میمانہ نامراد نہیں

رہے جہان میں ہم مبتلائے رنجِ مدام کھلی جو آنکھ تو دیکھانہ بزمِ غم و آلام

سنا نہیں کبھی ہم نے سرور و عیش کا نام جہاں میں ہوں غم و شادی ہم ہیں کیا کام

دیا ہے ہم کو خزانے وہ دل کشاد نہیں

اک التماس تو مرزا کی بھی سنو غائب کرو وہ بات نتیجہ بھی جس کا ہو غائب

خفیف ہو گے یہ چھیڑاں سے چھوڑو غائب تم انکے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غائب

یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

روز مضمون نیا باندھتے ہیں روز مرہ بھی جدا باندھتے ہیں

تجھ کو ہم برق ادا باندھتے ہیں تیرے تو سن کو صبا باندھتے ہیں  
ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں

نالہ دل کی حقیقت کیا ہے کامیاب اس سے کوئی ہوتا ہے  
چھیڑنا اس کو فقط منشا ہے آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے  
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

تجھ کو وہ چال ہے حاصل لے عمر دم میں لے کرتی ہے منزل لے عمر  
تیری رفتار ہے کامل لے عمر تیری فرصت کے مقابل لے عمر  
برق کو پا بربنا باندھتے ہیں

بند کا جب کہ ہے بندہ مفہوم مرگ کی پھر ہے توقع موہوم  
کیوں رہیں شوقِ اجل میں مغموم قید ہستی سے رہائی معلوم  
اشک کو بے سرو پا باندھتے ہیں

سر میں رکھتا ہے نہ یہ نشہ مل نہ اسے نازش عشقِ بلبیل  
ناز ہے حسن پہ اپنے باکل نشہ رنگ سے ہے واشد گل  
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

ان کی بندش کو سخن میں مت پوچھ کس طرح لیتے ہیں تمہیں مت پوچھ  
شعرا کی غلط آئیں مت پوچھ غلطیہائے مضا میں مت پوچھ  
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

مجھ سے وحشی کا کیا کیا درماں ڈال دی پاؤں میں گویا جولاں  
 چارہ گرا اپنے ہیں کتنے ناداں اہل تدبیر کی دامانہ گسلاں  
 آبلوں پر بھی حسا باندھتے ہیں  
 تھے وہ مرزا ہی سے پیماں غالب ہم سے دھوکا نہیں آساں غالب  
 ہم کو سمجھنا کوئی ناداں غالب سادہ پرکار ہیں خوباں غالب  
 ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

۶۱

جب تیری خاک رہ کی برابر نہیں ہوں میں کیا شکوہ سنچ جو مقدر نہیں ہوں میں  
 بے تے میں سنگ در کا بھی ہمسر نہیں ہوں میں قائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں  
 خاک ایسی زندگی پر کہ پتھر نہیں ہوں میں

۱۔ خط بنام نواب کلب علی خاں۔ بعد تسلیم معروض ہے حب بادشاہ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا اور  
 خدمت تاریخ نگاری سلطین نمودر مجھ کو تعویض کی تو میں نے ایک غزل طرز تارہیر لکھی مقطع اس کا یہ ہے  
 ”عالت وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا۔۔۔“ اب مقطع کی صورت بدل کر حضور کی نذر کرنا ہوں خدا کرے کہ خدمت  
 کو پسند آئے سے بوڑھا ہوا ہوں قابل خدمت نہیں اسد نہ خیرات خوار محض ہوں نوکر نہیں ہوں میں  
 خط میں ایک قطعہ بھی لکھا تھا جس میں مقطع بدل دیا ہے۔ قطعہ حسب ذیل ہے۔

در برابر کلب علی خاں کے ہوں مقیم  
 تائید گداؤں ہر در نہیں ہوں میں  
 بوڑھا ہوا ہوں قابل خدمت نہیں اسد  
 خیرات خوار محض ہوں نوکر نہیں ہوں میں

ہو جائے مضطرب تو نہیں کچھ خطائے دل      انصاف شرط ہے کہیں راحت بھی پائے دل  
دن رات جو چرخ کہاں تک اٹھائے دل      کیوں گردشِ مدام سے گھرا نہ جائے دل

انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

بیکار کیوں سمجھتے ہیں اہل جہاں مجھے      نقصان کیا کسی کو ہے میرے وجود سے  
سہواً نظم نہیں ہوں کہ معنی بدل گئے      یارب مجھے زمانہ مٹاتا ہے کس لئے

لوحِ جہاں پہ حرف مکر نہیں ہوں میں

تجویرِ قتلِ جرمِ الفت کے واسطے      ہے ننگِ مدعیِ عدالت کے واسطے  
یہ جو رو نظمِ اہلِ محبت کے واسطے      حد چاہئے نرا میں عقوبت کے واسطے

آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

حُفرتِ حقیر جانتے ہیں کس لئے مجھے      بے آبرو کیا مری تقدیر نے مجھے  
نسبت نہیں ہے کوئی جہاوت سے مجھے      کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے

لعل و زمرہ دوزر و گوہر نہیں ہوں میں

اجرامِ چرخ بھی تو نہ خروم ہوں دریغ      اور مجھ سے کہ تنگ ہو ہی توں کا توں دریغ  
بندہ نواز کس لئے آخر ہے یوں دریغ      رکھتے ہو تم قدمِ مری آنکھوں سے کیوں دریغ

رتے ہیں ہر وہاں سے کمتر نہیں ہوں میں

گردوں نے بوسے پاؤں کے کس شوق سے لئے      سر پہ قدم تمہارے زمیں تک نہ لئے  
یہ روک ٹوک ہے تو فقط ہے مرے لئے      کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوسے کے لئے

کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں  
 مرزا کی طرح شغل تمہیں بھی کوئی نہ تھا  
 بے کار بیٹھے بیٹھے زمانہ گزر گیا  
 خوابیدہ بخت شکر ہے بیدار تو ہوا  
 غالب و ظیفہ خواہر ہود و شاہ کو دعا  
 وہ دن گئے کہ کہتے تھے لو کہ نہیں ہوں میں

۶۲

تھیں کبھی زلفیں جو زریب سنبلستان ہو گئیں  
 خار بن کر جلوہ گرد دوزخ کاں ہو گئیں  
 شکلِ نرگس چنہاں شونخ و فتال ہو گئیں  
 سب کہاں کچھ لار و گل میں نمایاں ہو گئیں  
 خاک میں کیا صورتیں ہو گئی کہ پہاں ہو گئیں  
 آہ لے عہدِ جوانی وہ انگلیں اب کہاں  
 تو ہی جب نصرت ہوا پھر کیا ہے عمر جاو داں  
 ولولے ہی دلیں تھے کچھ اور جنتک تھے جواں  
 یاد تھیں ہم کو بھی زرگارنگ بزم آرا تیاں  
 لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

اسے عزل دہلاؤ اور اجار بس اس تمہید کے ساتھ شائع ہوئی تھی کہ اس ہفتہ میں جو مشاعرہ ہوا صاحبِ مرزا نور الدین بہادر  
 جو کھنوسے تشریف لائے تھے اور شاہزادہ والا تار رولق افروز شغل متاعہ تھے ایک عزل مرزا علی محمد یعنی میر شاعر  
 اور نزل جناب نجم الرور محمد اسد اللہ خاں غالب کی راقم اجار کے پاس پہنچی۔ جو کہ اردو اخبار میں شائع کر دی گئی۔ حالت  
 منی حقیر کو بھی اس عزل کے متعلق لکھا ہے۔

”بھائی خدا کے واسطے غزل کی داد دینا اگر نیت یہ ہے تو میر و مرزا کیا کہتے تھے اگر وہ رنجہ تھا تو پھر یہ کیا ہے  
 صورت اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب شہر اڑکانہ تیموریہ میں سے کھنوسے یہ زمیں لائے حضور نے خود بھی غزل کہی اور  
 مجھے بھی حکم دیا سو میں حکم بجالایا اور غزل لکھی۔“

ہو گیا ہر چند پہلو سے جدا سخت جگر دیکھتی آنکھوں ہو اگم یک بیک نورِ نظر  
دیدہ بے نور واسے شوق سے اٹھوں پیر۔ قید میں یعقوب نے لی گونہ یوسف کی خبر  
لیکن آنکھیں روزِ دلیوارِ زنداں ہو گئیں

سیکڑوں قربانی رنگِ رقابت مر گئے ہیں زبانِ خلق پر دن رات جکے تذکرے  
غیر کا نظارگی ہونا نہ چاہا عشق نے شہرِ رقبوں سے ہیں ناخوش پرنیانِ مصر سے  
ہے زلیخا خوش کر محو ماہِ کنگاں ہو گئیں

ہم کو یہ سمجھے ہوئے ہیں اس قدر بے ننگ نام ننگ ہے ان کیسے ہم ہوں اگر ان کے غلام  
خیر اگر چاہا خدا نے پھر تو بن جائے گا کام ان پر یزادوں سے لینے خلد میں ہم انتقام  
قدرتِ حق سے ہی حوری اگر وال ہو گئیں

دل میں تو بیشک اترتی ہیں یہ چھریاں بار بار آن واحد کے لئے لیکن نہیں ان کو قرار  
تیردن کر آ رہی ہیں جاری ہیں برق وار وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یاربِ کبار  
جو مری کوتاہی قسمت سے شرکاں ہو گئیں

دیدیا ہے اذن درباں نے تو کھا کر چرخ و تاب کم ہوا منت سماجت سے مری امر کا غتاب

لے قاعدہ ہر عاشق ہمیشہ قہقوش ناخوش رہتے ہیں مگر زلیخا سے مستی رہی معنی وہ معرکہ ورتوں کو دیکھ کر خوش ہوئی تو  
زلیخا پر طعنہ زن تھیں کہ تو نے ایک غلام سے عشق کیا ہے۔ زلیخا نے انھیں اپنے گھروں کو کیا۔ جب وہ انہیں تباہ ایک ایک کیوں  
پھر ایک ایک جہری سب کے ہاتھ میں دے کر ہلاکت کی کہ جب یوسف انہیں تو مچری سے لیوں کاٹ دیں مگر جب یوسف  
سامنے آئے تو ان کے حال کو دیکھنے میں انہی خوش ہو گئیں کہ سب نے انتہائی وارفتگی میں بجائے لیوں کاٹنے کے اپنی انگلی  
کاٹ لی تب زلیخا نے کہا کہ تم مجھ پر طعنہ زن تھیں اب جن کا اثر دیکھ لیا۔



ہو گیا ہے سہل گو غفل میں ہونا بایاب      واں گیا بھی میں تو انکی گالیوں کا کیا جواب

یاد تھیں جتنی دعائیں صرف رباں ہو گئیں

کام اچھا دے گیا صبر و سکون انجام کار      ورنہ پہنچی تھی یہ نوبت پیر بہن ہوتا رتار  
دل فغاں کرتا تو پھر ہاتھوں کو کیوں تاق قرار      بسکر روکائیں نے اور سینے میں ابھریں بار بار

میری آہیں بخیر چاک گر گیاں ہو گئیں

میکرے میں تشنہ لب جو زندہ کام آگیا      چہ خیر آب بقا تک وہ مے اُشام آگیا  
جی گیا جو کشتہ شمشیرِ آلام آگیا      جاں فزا ہے باد جس کے ہاتھ میں جام آگیا

سب بیکریں ہاتھ کی گویا رگ جال جا گئیں

اپنے نصب العین ہیں جملہ مذاسب العلوم      نقش ہیں دل پر تمام انکے قضا و علوم  
بچ ہیں اپنی نظر میں لاکھ ہوان سکی دھوم      ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم

ملتیں جب مٹ گئیں اجزاء ایماں ہو گئیں

ابتلا میں تو بہت کچھ دل کو ترپاتا ہے رنج      غمزدہ کی جان کو آٹھوں پہر کھاتا ہے رنج  
ضبط و استقلال سے آخر تنگ آتا ہے رنج      رنج سے تو گر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج

منشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کراہاں ہو گئیں

دوستوار مرنے کا میرے کیوں راتے ہو مذاق      یہ لہو رونا بھی ہے آنکھوں کا حسن آفاق

۱۔ مضمون کو مزاحیہ انداز میں لکھا ہے اس طرح کہ میری ہمدردی صبح کا وقت ہے جاڑا تو بڑا  
ہے انجھٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے دو حرف لکھتا ہوں آگ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی ہے مگر ہانڈہ آتش سال  
کے جب دو حرفے پلے فوٹ مار گئے ہیں دوڑ گئی۔ دل تو ناہو گیا۔

ہے شبِ بھراں کی تاریکی زیادہ دلوں کو شاق  
 شکِ ٹوٹا کھوٹے بنے دو کہے شامِ فراق  
 میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں  
 بزم میں جو ہنشیں تیرا ہے راتیں اسکی ہیں  
 صبحِ نظارہ میں کر دیتا ہے راتیں اسکی ہیں  
 اس بھی وہ خوشِ فطیبت ہے راتیں اسکی ہیں  
 نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں  
 تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں  
 کس غضب کا ہے یہ طوفاں خیز و نالاں  
 اس کی آنکھوں نے تو باندھا ابر بارانِ کمال  
 کر دیے اس نے بھی تیرا کی طرح دریا رواں  
 یوں ہی گریز و تارِ باغِ غالب تو لے اہل جہاں  
 دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

وخت ہے اور طاقتِ رفتار بھی نہیں  
 دامنِ بقدرِ خلعتِ یکِ خار بھی نہیں  
 ہمسایوں زدہ کوئی نادار بھی نہیں  
 دیوانگی سے دوشِ پزناں بھی نہیں  
 یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں  
 ہو کر غریبِ ورطہٴ ترماں ابھر چکے  
 یہ یاں جیتے جی ہے تو سمجھو کہ مر چکے  
 دن اپنے جب کہ شوقِ تھامیں گزیر چکے  
 دل کو بنا زحمت دیدار کر چکے  
 دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں  
 لٹے ہیں تجھ سے کرتے ہیں جو کسے راہ لے  
 البتہ تجھ کو پا نہیں سکتے ہیں سست پے

ممکن کبھی ہوئی نہیں کوئی محال شے      ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے

دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

میں اک نحیف و زار ہوں، طاقت تو اس پر یہ دل کے ولولے پر شوقِ جاں تاں

حیرت یہ کہہ رہی ہے کہ اب جا بے کہاں      بے عشقِ عمر کٹ نہیں سکتی ہے اویاں

طاقت بقدر لذتِ آزار بھی نہیں

سودائے سر پہ وجہ پراگندگی ہوش      وحشت ابھارتی ہے کہ کرنا و خروش

ٹکرنوں ہائے کس سے کھائے جنوں کا جوش      شوریدگی کے ہاتھ سے سر پہ وبالِ دوش

صحرا میں لے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

دشمن ہی کچھ عناد کو سمجھا کریں شرف      پھرنے بھی دو جو پھرتے ہیں رات و سحر

لیکن ہمیں جو بغض ہو کچھ بھی تو لو حلف      گنجائشِ عداوتِ اغیار یک طرف

یاں دل میں ضعف سے ہوس یار بھی نہیں

فریاد میں جو میں نے ہلا دی کبھی زبان      قائم نہ پھر زمین رہے گی نہ آسمان

آساں میری آہ بہاں سوز کو نہ جان      ڈرنا لہائے زار سے میرے خدا کو مان

آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

ہے زخمِ زارِ سینہ کو بیاں سے روکشی      زخمی جگر کو خنجرِ براں سے روکشی

کرتا ہے اس کا تیر نظر جاں سے روکشی      دل میں ہے یار کی صفِ ترگاں سے روکشی

تلا نکد طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

لیتے ہیں کام اداؤں سے آلاتِ حرب کا      خنجر کی اور تیر کی حاجت نہیں ذرا  
 کرتے ہیں خونِ خلق نہتے ہیں وہ تو کیا      اس سادگی پر کون نہ مرجائے لے خدا  
 لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں  
 مرزا جو بادشاہ تھا اقلیمِ شعر کا      جس کا ہے ملک نظم میں جھنڈا اگڑا ہوا  
 فرزا نہ کوئی ہو گا یہ غالب گمان تھا      دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا  
 دیوانہ گر نہیں ہے تو ہوشیار بھی نہیں

۶۴

رفوگرِ سرِ طرحِ شک ہو بھلا سے ٹہری پن میں      کہ بیٹھا ہے رفوگر نے مرے زخموں کے دم میں  
 سمجھ لیتا جو ہوتی تھک کو کچھ بھی آنکھ اس فن میں      نہیں ہزخم کوئی بخنے کے درخور مرے تن میں  
 ہوا ہے نارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں  
 دمِ نظارہ دیوار و درہوں قفِ جبرانی      کہ اچھا رنگ لائی اشکِ چشمِ ترکی طغیانی  
 ان آنکھوں کی بدولت پھر گیا امید پر پانی      ہوئی ہے مانعِ ذوق تماشا خانہ ویرانی  
 کھنسا سیلاب باقی ہے بزرگِ پنبہ روزن میں  
 کبھی ابرو کے سرِ صدقے میں قفِ تیغِ بزل ہوں      کبھی زخمی نگا ہوں جراتِ خوارِ پیکال ہوں  
 وفورِ سوزن سے جلوہ گاہِ داغِ پہنان ہوں      ودیعتِ خانہ بیدار کاوشہائے شرماں ہوں  
 نیگین نام شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں

زچو کیا بلا ہے تیرگی شہانے بھراں کی      چمک فتنے کی ہے اس میں غیاہر و خشاں کی  
سیاری مات ہے بختِ سید کی فردِ عصیان کی      بیاں کس سے غفلت گستری میرے شہستاں کی

شبِ مہر ہو جو رکھ دیں پندہ دیواروں کے روزں میں  
ہنسی یا روض کی ایک نصیحت مجھ کو فرمائی      زاب وہ جوشِ وحشت ہے نہ فرطِ ناشکیبائی  
سکوں ما ہو گیا دل کو گیا سامانِ رسوائی      نکو ہش مانع بے ربطی شورِ جنوں آئی

ہوا ہے خندہ احبابِ بخیمہ جیبِ ودا میں  
نہے تقدیرِ آئینہ کر یہ ہوسانے اس کے      کہاں پیدا دیا شانِ خدا اس کے مقدسے  
یہ حیرت ہے غیاپائی ہے کیا اسکی تکلی سے      ہوئے اس جہر و ش کے جلوہ مثال کے آگے  
پراشتال جو ہر آئینہ میں مثلِ ذرہ روزں میں

کروں کیا ہمشینوں سے مری حالتِ مخالفت ہے  
مجھے ڈالا ہے نا جنسوں میں کیا سمتِ مخالفت ہے      مرا مذہب جدا سب مری ملتِ مخالفت ہے  
جو گل ہوں تو ہوں گلشنِ ہر بخش ہوں گلشن میں      نہ عالوں نیکوں یا بدہوں پر محبتِ مخالفت ہے

مقامِ سکوہ کیا ہے درد اگر لاکھوں مجھ کو      ذریعے بھی بخشے درد کی برداشت کے مجھ کو  
بسکروشی نہ ہوگی اس کے آستانے مجھ کو      ہزاروں دل دیئے جوشِ جنون عشق نے مجھ کو  
سیر ہو کر سویلا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

خیالِ گیسوئے پرہیز میں پابندِ حولاں ہوں      بتوئے دامِ کیمیا ہوں کس سیرِ حاسماں ہوں  
ادھر انکی مہرِ رازی طرح کیوں نہ قرباں ہوں      آسہ زندانِ تاثیرِ الفت ہائے خواہاں ہوں  
حمِ دشتِ نوازش ہو گیا ہے طوقِ گردنِ میں

طمانیتِ دلِ اربابِ زریں خاک نہیں خیالِ زر کے سوا اور سر میں خاک نہیں  
چٹو رہی ہے یہاں اور گھر میں خاک نہیں مرنے جہاں کے اپنی نظر میں خاک نہیں  
سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

حال ہے کہ وہاں نجاتِ نارِ سالے جائے کوئی اٹھا کے چین تک قفسِ مرا لجاوے  
غرض ہے کیا اسے صیاد کی بلا لے جائے مگر غبارِ ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے  
وگر نہ تابے تو اس بال و پر میں خاک نہیں

ہوئے ہیں فرشِ زمیں گل بہار بے حد ہے کھڑا ادب سے سر راہِ سروِ خوش قد ہے  
وجودِ عرضِ مرکبِ گلوں سے شاید ہے یہ کس بہشتِ شمال کی آمد آمد ہے  
کہ غیرِ جلوہ گل رہ گزر میں حناک نہیں

خوفِ کردل مجھے ہوتی تو یوں نہ کھل جاتا سنبھالتا کسی صورت سے اس کو بھلاتا  
مجھے ہی جب نہیں پروا وہ کیوں کس کھانا بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا  
اثرِ مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

کیا خدا نے نہ مجھ کو کسی سے شرمندہ ہوا کسی کی نہ منت کشی سے شرمندہ  
نہیں ہر کچھ بھی تو ہوں اپنے جی سے شرمندہ ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ  
سوائے حسرتِ تعمیرِ گھر میں خاک نہیں

مدام طالبِ حسن المآب ہیں مے کش      کسی کی یاد میں بے ارتباب میں مے کش  
زمانہ کہتا ہے مست شراب ہیں مے کش      خیال جلوہ گل سے شراب ہیں مے کش

شراب خانہ کی دیوار و دریں خاک نہیں

جو دیکھتے ہیں مضامین تازہ کی آمد      مذاق اڑاتے ہیں مرزا تمام اہل حسد  
کہا جب ہی تو یہ غالب نے ہو کے دق بچید      ہمارے شعر ہیں اب صف دل لگی کے اسد  
کھلا کہ فائدہ عرض ہنریں خاک نہیں

۶۶

ہم سے نہ کہتے بار بار کہتے ہوئے بائے کیوں      اپنے ہی دل کو چھپے زخم بھر دکھائے کیوں  
فرطالم سے خون دل اشک میں بہہ نچائے کیوں      دل ہی تو پورے سنگ و خشت درد سے بھر نچائے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

اکی میں کسی کو دخل کیا ملکِ قہر نہیں زمین      سر پہ اٹھلے ہم اسے تو نہ جائیگے کہیں  
اپنا نشانِ مٹائیں گے صورتِ نقشبند نہیں      دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستان نہیں

بیٹھے ہیں رہ گزر رہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

چشمِ بشر میں ہوا اگر حسرتِ فہریم روز      دیکھ سکے نہ بھر کے جی طلعتِ فہریم روز  
تاب کہاں کہ ہو اسے رویتِ فہریم روز      جب وہ جالِ دلفروز صورتِ فہریم روز

آپ ہی ہوں نظارہ سوز پرے میں منہ چھپائے کیوں

خوف سے سیسے روبرو انہیں سکتے مہر و ماہ  
 انکو کہاں یہ تاب ہے دیکھیں جوتیری جلوہ گاہ  
 دشنہ غمرہ جاں ستاں ناوک نا بے پناہ  
 سکتے ہو آئینہ کو بھی ڈال دے تو اگر نگاہ

نیرا ہی عکس رخ ہی سلنے تیرے آئے کیوں

دہر میں شادی و ام اصل میں نول یک ہیں  
 زندگی و محن ہم اصل میں و نول یک ہیں  
 قطرہ آبِ آبِ ہم اصل میں و نول یک ہیں  
 قید حیات و بند غم اصل میں و نول یک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اُنے عرو کا سادہ پن گئی بواہوس کی شرم  
 باندہ کر آیا تھا کفن رہ گئی بواہوس کی شرم  
 ٹال گیا وہ تیغ زن رہ گئی بواہوس کی شرم  
 حسن اور اس چہرے نطن رہ گئی بواہوس کی شرم

اپنے پر اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

ہمکو یہ جن کہ چھٹ بجائے راہِ صواب پس وضع  
 اسکو یہ ضدادھر سے ہو کچھ تو جواب پاس وضع  
 مانع رکم و راہ ہے خوئے خراب پاس وضع  
 واں وہ غور و غمز و ناریاں یہ جواب پاس وضع

راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلکے کیوں

میں ہوں تلاشِ یار میں کہتے ہو جس کو گم رہی  
 بک نہ لگاؤ ہمدموں تم نے یہ بات کیا کہی  
 اسکی جفا و جہر سے مجھ کو ہے خوب آگہی  
 ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا ہی

جسکو ہو جان و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

کم ہوئی مے کشی نہ کچھ دورِ مدام بند ہیں  
 بزم سے اٹھ گئے سبویا کہیں جام بند ہیں  
 عیش و خوشی سے میرزا خاص نہ عام بند ہیں  
 غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

روئے زار زار کیا سمجھئے ہائے ہائے کیوں



تو نے اشلے سے مجھے کیا یہ بتا دیا کہ یوں صاف جواب دے مجھے میرے سوال کا کہ یوں  
 چپ سے چلے گا کام کیا لب تو ذرا ہلا کہ یوں غنچہ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں  
 بوسہ کو چھپتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

غمزہ جو اس کا دیکھ لے سینے میں پھر نہ دل ہے تار کو رشمہ دیکھ کر ہوش اڑ رہے ہے  
 تیغ نگہ اگر چلے ہو کے لبو جگر ہے پر شیش طرز دہری کیجئے کیا کہ بن کہے  
 اسکا ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

ہم دو امید میں ہے کیا کہیں کس طرح جئے سرت ویاس میں غرض مگر کے دن گوا دیئے  
 ہاتھ اٹھا اٹھلے ہم دل سے دعا کیا کئے رات کے وقت ہے بے ساتھ قریب کو لئے  
 آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

لی ہیں جگر میں چشکیاں طور جفا تو دیکھئے فہ کو جواب کیا دیا طرز ادا تو دیکھئے  
 کیسا حجاب اٹھا دیا شرو جیا تو دیکھئے غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے  
 سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

سکتے میں خاص عام ہیں عجب خیال یا رے ہونٹ سینے بھٹے سے ہیں آج تو اہل بزم کے  
 حکم سکوت بھی ہیں گو نہ دیا ہوشو نے بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خوش بیٹھئے  
 اس کی تو خاموشی میں بھی ہے مدعا کہ یوں

کیا کہیں بزم یار میں بات ہی کچھ بگڑ گئی      مفت میں ہو گیا مرن مذ نظر تھی دل لگی  
دیر تک ہنسی رہی بات بن آئی غیر کی      میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تھی

سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں  
اسکو دکھاؤ عشق کا ہوش و خروش کس طرح      لائے زباں پہ حال دل شمع خموش کس طرح  
شوق وہوس کریں یہاں دیدہ و گوشت کس طرح      مجھ سے کہا جو مانے جاتے ہیں ہوش کس طرح  
دیکھ کے میری بچو دی چلنے لگی ہوا کہ یوں

آمد و شد وہاں جو تھی طبع اسی میں شاد تھی      تا دیر یار ہو گئے رد کی یہی مراد تھی  
خاک میں بھی اگر ملا خاک بھی وقف یاد تھی      کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی  
آئینہ دار بن گئی جبریت نقش پاک یوں

عشق میں صدق ہو اگر سکائے مال ہے وصال      جزو جو کل سے جاملہ ہو گیا ایک لں کا حال  
وجہ سکون و اتحاد کیوں نہ ہو پھر یہ اتصال      گر تیرے دلیں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال

موج محیط آب میں ما لے ہے دست و پا کہ یوں  
یوں تو ہیں ہند میں بہت فن سخن کے مدعی      ہیں یہ جدائی بند شبنم طرازا ہے اور ہی  
حق تو یہی ہے میرا ختم ہوئی سخنوری      جو یہ کہے کہ رختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی  
گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

## رولف (و)

۶۸

کچھ بات ہو بطر زمامت ہی کیوں نہ ہو      عزت ہے ہم کو خواہ اہانت ہی کیوں نہ ہو  
کچھ رکھئے ہم سے دیں کدورت ہی کیوں نہ ہو      وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو  
کیئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

ممکن نہیں ہے دل میں گزرا نسا ط کا      دل میں وہ شوق و ذوق کہاں ارتباط کا  
اب وہ نہ میں رہا نہ زمانہ نشاط کا      چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا  
ہے دل پہ بار نقش محبت ہی کیوں نہ ہو

آزادگی کا اپنی مجھے مل گیا صلہ      ٹوٹا ہے النجائے اعانت کا سلسلہ  
شکوہ کسی کا ہے نہ کسی کا مجھے گلہ      ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ  
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

لیں چٹکیاں جگر میں جو مجھ سے کبھی ملا      چھیڑا ہمیشہ شکوہ دشمن کا سلسلا  
کی بات بھی تو وہ کر دیا جس گول ہلا      ہے مجھ کو تجھ سے تذکرہ غیر کا گلا  
ہر چند برسبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

یکسوئی ہو بشر کو میسر یہ ہے حال      اس کیلئے غلوت و غلوت کا ایک حال

تنہا بھی ہوتا نفس سے ریتی پریل وقال ہے آدمی بجائے خود اک محتر خیال

ہم انجن سمجھتے ہیں غلط ہی کیوں نہ ہو

ہم انقلاب سے متاثر ہوں کیا مجال ہرگز نہ لیں ہزار سبق دے جہاں کا حال

وارستگی میں رتبہ وغیرت کار کو خیال ہنگامہ زربونی ہمت ہے انفعال

حاصل نہ کیجئے دہرے بعثت ہی کیوں نہ ہو

آزادگی جہان سے فزائگی نہیں کیا رم ہے اور چیز جو دیوانگی نہیں

دنیا سے بھاگنا کوئی مردانگی نہیں وارستگی بہانہ بے گانگی نہیں

اپنے سے کرنے غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

رکھتا ہے شاہراہ فنا میں قدم کوئی ہوتا ہے محو دل سے خیال عدم کوئی

اس فکرِ جاں گداز سے چھٹتے ہیں ہم کوئی ملتا ہے فوت و فصیح، ہستی کا غم کوئی

عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

کرتے پھر ی رقیب چناں و چینل اسد جاتے ہیں اسکے کوچے سے مرزا کہیں اسد

دیکھیں گے آپ قبر ہماری وہیں اسد اس فتنہ نو کے دے اب اٹھتے نہیں اسد

اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

ستایا تو نہیں میں نے کسی مرغ نوازن کو مجھے یوں دیکھتے ہیں جیسے دیکھیں اپنے دشمن کو

فغان کرتا ہوں میں جب یاد کرتا ہوں نشترِ کو قفس میں گرا چھائی جانیں میسے شیون کو

مرا ہونا برا کیا ہے تو اسخِ بانِ گلشن کو  
یہ ماننا غیر صورتِ اشنا اس کا نہ حرم ہے مگر یہ روسیہ اس کے تجسّس میں تو ہر دم ہے  
وجودِ غیر جب تک ہے تو مجھ کو کچھ نہ کچھ غم ہے نہیں مگر ہمدی آساں ہو یہ شک کیا کم ہے  
ندی ہوتی خدا یا آرزوے دوست دشمن کو

بھرا یا بخیر گر کا دل بھی ظالم میہی حالت پر انڑ والا نہ اس منظر نے بھی تیری طبیعت پر  
ہنسی آتی ہے مجھ کو تیرے دلوے زنجیر پر نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس برات پر  
کیا سینے میں جسے خونِ کھالِ مرکانِ سوزن کو

ہوئی ہے کیا بلا دیوانگی عشق پر یوش میں کربائے سکون مطلق نہیں قلبِ شوش میں  
جنوں کی حرکتیں قائم ہو گئیں ہواستِ خش میں خدا شرمائے ہاتھوں کو کرکے میں کشتائش میں  
مُسبھی میرے گریہاں کو کبھی جاناں کے دامن کو

ہم اپنا غرقِ خوں ہونا بجا آساں سمجھتے ہیں رواں ہونا گلے پر تیغ کا آساں سمجھتے ہیں  
نکلتا جانبِ مقتلِ ترا آساں سمجھتے ہیں ابھی ہم قتل گاہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں  
نہیں دیکھا شننا و بوجے خوں میں تیرے توسن کو

رہا دستورِ آہن سے سناں و تیر بنے کا ہمیشہ مادہ اس میں رہا شمشیر بنے کا  
زمانہ اب ہے اس کے لائق تو قبر بنے کا ہوا چرچا جو ہرے پاؤں کی زنجیر بنے کا  
کیا بیتاب کال میں جنبشِ جو ہرے آہن کو

مجھے کیا ہے سے ہرگز گھبے یا گھر کے کھل جائے  
دُر خوش آب پانی کی جگہ ماروز برساتے  
سینہ سختی سمجھتا ہوں اگر کالی گھٹا چھائے  
خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار اُرائے  
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابلی سے برقِ نرین کو

زبے قسمت کہ اسکے سامنے مثالِ جاناں ہے  
بتوں کو جان کر سگانِ کعبہ دل کو قرباں ہے  
اگر دیکھیں حقیقت میں تو وہ بکا مسلمان ہے  
وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے  
مرے بت خانہ میں تو کہنے میں گاڑو برہن کو

پھر یا سرِ بخت شوقِ اجل نے چار سو مجھ کو  
لے پھرتی تھی دردِ رجاں دہی کی آرزو مجھ کو  
رہی جلا دہی کی زندگی بھر جستجو مجھ کو  
شہادتِ ہمتی مری قسمت میں جو دی تھی جستجو مجھ کو  
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

جو ہونا مالِ میٹھی نیند کیونکر خاک پر سوتا  
زرو گوہر کے ہونے کس طرح ٹھنڈے بگر سوتا  
متاعِ رفتہ رہ جاتی تو پھر کیا بے خطر سوتا  
نہ لٹتا دن کو تو کب ات کو یوں بے خبر سوتا  
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعادیتا ہوں رہن کو

مضامین کے خزینے بہتے ہیں سینے میں شاعر کے  
نثرینہ دار و مالک ہیں سمنور ان ذخائر کے  
گہر کی قدر کیا ہے سامنے الفاظِ نادر کے  
سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے  
جگر گیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جاکے معدن کو

دراقدس کا اک زبان ہے فغفور ہیں غالب  
سکند کو بے خراستیاں بوسی ہیں غالب  
ای دو ازہر کھتا ہے مرزا بھی جیس غالب  
مرے شاہِ سلیمان جاہ سے نسبت نہیں غالب  
فریبوں و جم و بخت و دربار و بہن کو

سکرسانی سن ہوئے اس خستہ تن کے پانو' جاتا کہاں کہ ہو گئے ایک ایک من کے پانو'  
 کیا جانتا تھا وہ نہیں جھوٹے سخن کے پانو' دی سادگی سے جان پڑوں کو یکن کے پانو'  
 بہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو'

جی میں ہے پوجئے بت نازک بدن کے پانو' جیسے بھاری پوجتے ہیں برہمن کے پانو'  
 ہاتھ آئیں کس طرح گراس پرفتن کے پانو' دھوتا ہوں میں جو پیئے کو اس سیم تن کے پانو'  
 رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو'

کہتے تھے اپنے نفس کو ہم نازل ہے یہہ بچتے تھے اس کے سایہ سے گو یا بلا ہے یہہ  
 آثارہ اب ہمارے لئے ہو گیا ہے یہہ بھاگے تھے ہم بہت سوا ب اکلی نزل ہے یہہ  
 ہو کر اسیر دابتے ہیں راہ سزن کے پانو'

سارا بدن ہے فرط جراثیم سے چورچو' عاجز ہوں دو او دوش سے تو کیا قصور  
 جراثیم کچھ علاج تو ان کا بھی کر ضرور مرہم کی جستجو میں پھر اہوں جو دور دور  
 تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو'

صدچاکل ہے صورتِ صبر بگ چار بگ محاسنِ تھانہ کچھ بھی غم برقہ و تگرگ  
 پھر ہو چلا ہے قبر میں وحشت کا ساز و برگ اللہ کے ذوقِ دشتِ نور دی کہ بعد مرگ  
 ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو'

گلبن کی شاخ شاخ ہوئی جام گل بکھن      ہیں قمریوں کی تاک میں سب ہر وصف نصیف  
کس کس کی جان دیکھے امسال ہوتلف      بے جوش گل بہار میں یاں تنگ ہر طرف  
اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ جن کے پائو

ناز و نزاکت ایسی بھی دیکھی سنی نہیں      رفتار کے خیال سے تھکتا ہے وہ حسین  
ظاہر ہیں سب تکان کے آثارِ ہم نشین      شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں  
دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پائو

ایسا سخن شناس تو شاید سنا نہ ہو      بڑھ کر سخن ظفر کا جلوب چاٹتا نہ ہو  
مرزا یقین کیوں مجھے اس قول کا نہ ہو      غالب مرے کلام میں کیوں کر مرزا نہ ہو  
پیتا ہوں دھوکے خمر و شیریں سخن کے پائو

یہ قدم رنجِ پاکیا کوئی کم ہے، ہم کو      ان کا لانا ہی سرِ بزمِ کرم ہے، ہم کو  
خاکِ بوسی کا عجب شوقِ اتم ہے ہم کو      واں پہنچ کر جو غش آتا ہے ہم کو  
صدرِ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

سرمیں سودائے چمن ہے نہ ہوائے گلشن      تیرے در سے بے ہمیں پاؤ اٹھانا بھی کٹھن  
لاغری وہ ہے کہ اک بال ہیں گویا ہر تن      ضعف سے نقش پئے مور ہے طوقِ گردن  
تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ دم ہے ہم کو



آج ہمدرد زمانے میں کہاں پیدا ہے  
ایک کا ایک کو ہو درد تو بے جا کیا ہے  
غم سے جو واسطہ میرا ہے وہی دل کا ہے  
دل کو میں اور مجھے دل نحو و فار کرتا ہے  
کس قدر ذوق گرفتاری ہم ہے ہم کو

وائے غفلت کہ نہیں آتی خبر بھی اب تو  
سامنے کون ہے اور آپ نے دیکھا کس کو  
ہم سے اب یہ وہ دانستہ ہو غماض ہو جو  
جان کر کیجئے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو  
یہ نگاہ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

رہنے دیں دوست اسی طرح ہیں گوشہ نشین  
سیر گزار سے دل اور بھی ہو گا غم گیں  
کھائے زخم جگر پر یہ ہمیں تاب نہیں  
ریشک ہم طرحی و درد اثر بانگ حزیں  
نالہ مرغ چمن تیغ دودم ہے ہم کو

صاف ظاہر ہے کہ وعدہ تھا مگر صاف نہ تھا  
وقت اصرار کھلا آکے نتیجہ اس کا  
ایسی قسموں کا بھروسہ ہمیں کیونکر ہوتا  
سراڑانے کے جو وعدے کو مکر چاہا  
بنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

بے سبب شک رواں کا تو نہیں باز دھاتا  
عین جو ہے یہ ان کا کہ ہوا آنکھیں خونبار  
نہو روئیں تو مرقاں پر کہاں ہے بہار  
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ ولیکن ناچار

پاس بے رونقی دیدہ اہم ہے ہم کو  
داخل شکوہ سمجھتے ہو جو خاموشی کو  
کیا کریں چین کسی طرح نہ جب لینے دو  
حال کیا ہو جو کبھی نالہ پُر درد سنو  
تم وہ نازک کہ خاموشی کو فضاں کہتے ہو

ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو  
 عقل حیران ہے کس وجہ سے چوڑی دھلی  
 کچھ تو ہے جس لئے طے کی ہے مسافت اتنی  
 ایک بیک چوڑی کیوں لغت راحت گھر کی  
 نکھٹو آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی  
 ہو میں سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو  
 جب چلے گھر سے تو تھی دلیس یہاں وہی لہر  
 بیٹھ رہنا ہیں اور ترک سفر ہے اکبر  
 قصد ہے دور کا مانع جو نہ ہو گردش دہر  
 مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے ہر شہر  
 عزم سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو  
 آپ کی طرح ہے مرزا بھی کرم کا طالب  
 دل کھینچا جاتا ہے اربابِ کرم کی جانب  
 وجہ نقل و حرکت کیا کہوں مرزا صاحب  
 لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب  
 جادہ رہ کشش کافِ کرم ہے ہم کو

۷۲

کیا قابلِ خطاب وہی روسیہ ہو  
 مجھ پر نہ بھول کر بھی کرم کی نگاہ ہو  
 چاہو اسی کو دل میں اگر اس کی چاہ ہو  
 تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو  
 مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گتہ ہو

اے غالب صاحبِ نواب علانی کو ایک خط میں لکھا "اشعار تازہ مانگتے ہو کہاں سے لاؤں۔ عاشقانہ اشعار سے  
 مجھ کو وہ بعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھٹا تھا بھی کرتا تھا خلعت پاتا تھا خلعت موقوف ہوئی موقوف  
 زغرلہ دمدہ ہنرل و بچو میرا آئین نہیں پھر کہو کیا نکھوں۔ بورڈ سے پہلوان کے سے پیچ بتانے کو (بانی ص ۳۱ پر)

الزام رکھ کے غیرہ کیا صاف ہو گئے گویا یہ خون ہی نہیں ذمہ جناب کے  
 فرماتے ہو کہ قتل کیا تجھ کو غیر نے بچتے نہیں مواخذہ روز حشر سے  
 قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

جس طرح قتل و خون میں جس بے ہراس ہیں کیا وہ بھی یوں ہی دشمن جانِ اناس ہیں  
 کیا یوں ہی ان کے شیعہ بھی وقف ملیں ہیں کیا وہ بھی بے گنہ کش حق ناشناس ہیں  
 مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

مخل تمام ثنویں و تہا میں ہے بے قرار تکتے ہیں غیر بھی نگہ بد سے بار بار  
 یہ رشک کس طے نہ رہے مجھ کو دل فگار ابھرا ہوا نقابہ میں ہے ان کے ایک تار  
 مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

رکتانہ میکرہ سے تو رکھتا جگہ کی قید آزاد کے لئے نہیں زبیا جگہ کی قید  
 وارستگی با ہے نوبے جا جگہ کی قید جب میکرہ چھٹا تو پھر ابا کیا جگہ کی قید  
 مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

باقی ۱۲۹ کا - رہا ہوں اگر اطراف و جوانب سے استغاثا جلتے میں استغاثا یا جلتے میں باور کرا اور مطابقت  
 واقع سمجھا تھا ہے، دیکھ کو دل مست تھا تھا ہے اور تھا لا موقوفہ، اس پر ہے کہ تم یہاں اور کاش اپنے والد ابا کیساتھ  
 چلے آئے اور مجھ کو دیکھنے کے لئے تم کا تو کو میرے جورم و ذمہ ہے۔ مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہے۔  
 اے حالی نے اس شعر کی تشریحوں کی ہے کہ سعد و مدد و خانقاہ مساوی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میکرہ جہاں ولیفوں  
 کے ساتھ مراد ہے کا اظہر بخار و دی چھٹ گناہ سجود و مدد و خانقاہ میں میٹھ کر لی لینے کی کوئی عار نہیں ہے  
 ہے یعنی یہ مقامات اس شعل کے بالکل لائق نہیں ہیں وہاں بھی مسکدہ چھٹنے کے بعد ہی ایسے سے انکار نہیں ہے اور  
 حجاب پینے کی تصریح نہ کرنا میں مقتضائے ملاءت ہے۔ مراد غالب شوخی برتے سے بھی نہیں چوکتے یعنی مسجود مدد  
 اتناہ حالت عزت ہیں مگر عاتک صاحب ان سب کو مساوی سمجھ لیا ہے۔ ۱۲

ہر چیز باغِ فلد کی ہے منتخب درست      تور و قصور و شہد انا و عنب درست  
 مشہور ہے کہ ہے وہ مقامِ طربِ رست      سنتے ہیں جو بہشت کی توفیقِ سب دست  
 لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو  
 سونانہ ہو گا دیس اگر ہم نہ ہوں کہیں      ذاتی نہ کوئی گھر ہے نہ گھر کی کہیں زمیں  
 مرزا وجود شاہ ہے رونقِ فنا دیں      غالب بھی گرنہ ہو تو کچھ ایسا فر نہیں  
 دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

۷۳

تمہیں نہ ضبط سے جب کام ہو تو کیونکر ہو      تمہیں نہ فرصتِ تدبیر ہو تو کیونکر ہو  
 اب اس سے حضرت دل بات ہو تو کیونکر ہو      گمنی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو  
 کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو  
 حصولِ وصلت و دیدار تو ہے امرِ محال      فقط ہے باعثِ تسکینِ تصورِ مثال  
 امید و یاس کو سمجھا ہے آرزو کا مال      ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال  
 کہ گرنہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو  
 کبھی خیال کا اظہار مدعا کیجئے      کبھی یہ وہم کہ ہرگز نہ یہ خطا کیجئے  
 کہاں تک اپنے مقاصد کا التوا کیجئے      ادب ہے اور یہی کش مکش تو کیا کیجئے  
 حیا ہے اور یہی گو مگو تو کیونکر ہو

تمہارا دل ہے کر رشک و حسد کا گنجینہ      بھرا ہی رہتا ہے بغض و نفاق سے سینہ  
یہاں تک اپنے مقابل سے تمہیں کینہ      الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ  
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

وہ رشکِ ہر رہا رات بھر تو جلوہ نسا      نمود ہونے نہ پائی سحر کہ چل نکلا  
مری نگاہ میں اندھیر کیوں نہ چھل جاتا      جسے نصیب ہو روز سیاہ میل سا  
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

یہ دُریطہ ہے جس نے ہم کو لوسا      تو تم نے غایتِ نخت سے سر کو ٹھکرایا  
نہ نرم کچھ تمہیں بندوں کی ہے نہ خوفِ خدا      تمہیں کہو کہ گزارہ صنم پرستوں کا  
بتوں کی ہو جو تمہاری سی خود کیونکر ہو

کریں گے حضرت دل خاکِ تمہاری قد      ہوتی نہ کچھ بھی ہماری سوائے خواری قد  
انہی کے ہوں وہاں ہم جہاں ہی ہماری قد      ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قد  
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

ہمیں تو آیہ قرآن تھا جو مضمونِ نفا      بجا ہے ہم نے جو پڑھ کر کہا ہے آمنا  
وفا ضرور کریں گے وہ وعدہ فردا      غلط نہ تھا ہمیں خط پر گسانِ تسلی کا  
نہ مانے دیدہ دیدار جو تو کیونکر ہو

سکوں سے کام نہ لوں غطاب میں تو قصو      مگر ہوں غبط میں اس افسر اسے مغزو  
زمانہ بھر میں نہ مرزا سا پائے گا صبور      تجھے جنوں نہیں غالب ہے بقولِ حضو  
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو      (لے ماشیہ ص ۳۱۱)

جوتاب مضطرب ہو اشک آنکھوں کوں کیوں ہو      کسی دل کی بیتابی کا درپردہ بیاں کیوں ہو  
جو ہو درویشنا تو شکوہ درد نہاں کیوں ہو      کش کوئے کے دل کوئی نواسخ فضاں کیوں ہو  
نہ ہو جبل ہی پہلوئیں تو پھر نہ مٹی باں کیوں ہو

وہ ہر گیسلسہ توڑیں تو تم کب تک سے جوڑیں      رہیں ہم مجھ غارہ کہاں تک جب منہ موڑیں  
خفا وہ ہیں لبھوں ہم ترستہ تنگیں کو کیوں توڑیں      وہ اپنی خود چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں  
سبک سرنیکے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

چھپا رکھا تھا ہم نے اپنے دل میں راز الفت کو      نہ کی آف مہر استقلال سے جمیلا ہر الفت کو

حاشیہ ۱۳۳ کا:۔ عرل اور غزل کے ساتھ دلی کے ادوہا میں چھپی جب قلم مغل میں مشاودہ ہوا تو اس میں غزل غائب  
صاحبِ مہر نے غزل کیلئے طرہٴ عید نہ بادشاہ ظفر واکرتے تھے۔ قطع میں غالب نے بادشاہ کے طری مصرع کو اس طرح نظم  
کیا ہے مجھے جنوں نہیں غالب نے بقول حفص: "فراقی یار میں سکیں ہو تو کیوں نہ کر ہو۔"

لے مرزا غالب نے عاتق علی تہ کو نکھا کہ میں نے ان دلوں دو غزلیں لکھی ہیں۔ ایک تو دیدیا نہ ہو مسودہ آپ کے پاس  
بھیج چکا ہوں۔ دوسری غزل نے رعاں کیوں ہو گماں کیوں ہو اب بھیجتا ہوں۔ نیز دوسرے خط میں انھیں کو لکھا:۔

"تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم و اندوہ کا شکوہ گزارا یا یا ہے۔ پس اگر کسی بعد درد پر دل  
آیا ہے تو شکایت کی گجائیں نہیں ہے بلکہ یہ غم تو نصیبِ دوستان درخورِ افراش ہے بقول غالب:۔

کسی کوئے کے دل کوئی نواسخ فضاں کیوں ہو      نہ ہو جب دل ہی سیہ میں تو پھر نہ مٹی باں کیوں ہو  
ہے یہ شعر ہے

بہ فتہ آدی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے      ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسمان کیوں ہو

خبر کیا تھی ہمارے دردِ نہانی کی خلقت کو      کیا غمِ خوانے رسوا لگے آگ اس محبت کو  
نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا زرداں کیوں ہو

نہ کرنے دے ہمیں وحشت میں سجدہ اپنی چو کوٹ کا      پہاڑوں تک کرے گارہری سودائے سراپنا  
ہمیں ہے کچھ نہ کچھ تو چارہ جوئی جنوں کرنا      وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر بھوڑنا ٹھہرا  
تو پھلے سنگِ دل تیرا ہی سنگِ استاں کیوں ہو

نکل و سرور یا عین کا مفعول ذکر کر ہم دم      کڑا دل کسے کسبِ لات مجھ سے کہہ کر ہمد  
یہ ہے پوچھنے پر تو نے تھا ماکوں ہر ہمد      قفس میں مجھ سے رو دا دین کہتے نہ ڈر ہمد  
گری ہے بس پہ کل بجلی وہ میرا امتیاں کیوں ہو

نظر بندی یہ کیسی ہے معا کیا ہے سمجھاؤ      طبیعت کو عجب الجھن ہے اگتھی کو سلجھاؤ  
اگر پردہ نہیں تیر نظر تو سب سے آؤ      یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں لیکن یہ بتلاؤ  
اگر دل میں نہیں تم ہو تو آنکھوں نہاں کیوں ہو

کچھ ایسا ہی ہر انسان کی طبیعت کا اعضا ہے      کہ یہ اپنی خطا کو غیر کے سر ڈال دیتا ہے  
ہمیں ٹھہرے گھر کاروں میں یہ انصاف اچھا ہے      غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو گرم کس کپے  
نہ کھینچو گرم اپنے کو کشش درمیاں کیوں ہو

یہ رُخ کا آئینہ دنیا کی حیرانی کو کیا کم ہے      پریشاں زلفِ عالم کی پریشانی کو کیا کم ہے  
نگاہ تیز جانباڑوں کی قربانی کو کیا کم ہے      یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے  
ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا آسمان کہیں ہو

عنایت تم نے کی جس پر اسی کا ناک میں دم ہے      ہوئے غمخوار جس غمگیں کے تم وہ طعنے غم ہے  
تمہاری مہربانی میں بھی جلا دی کا عالم ہے      یہ فتنہ آدمی کی فائدہ ویرانی کو کیا کم ہے  
ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا اسمال کیوں ہو

مصیبت رشک کی ظلم عدو دن رات بہتے ہیں      تمہاری مہربانی سے پریشاں حال بہتے ہیں  
ہنسی سوجھی ہو تنکو اشک یا انکھوں سے بہتے ہیں      یہی ہے آزمائش تو ستا ناکس کو کہتے ہیں  
عدو کے ہوئے جب تم تو میرا امتحان کیوں ہو

ابھی آئے ابھی جاتے ہو جانا کس کو کہتے ہیں      یہ آنا ہے تمہارا تو نہ انا کس کو کہتے ہیں  
کرم سمجھا ہے اس کو تو جلا ناکس کو کہتے ہیں      یہی ہے آزمائش تو ستا ناکس کو کہتے ہیں  
عدو کے ہوئے جب تم تو میرا امتحان کیوں ہو

جو کہتا تھا بری ہے غیر کے گھر محفل آرائی      تو ہنس کر مالتے تھے جھکو ٹھیراتے تھے سودائی  
لگے اب بحث بھی کرنے جتا کر اپنی دانائی      کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں سوائی  
بالکتنے ہو پرجہتے ہو پھر کہنا کہ ہاں کیوں ہو

چلا جادو جب مرزا کا اسکے روبرو غالب      کرے گی کیا اثر پھر خاک تیری گفتگو غالب  
بر بزم اس ہے بے فائدہ کیوں جدو غالب      نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں تو غالب  
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو



## رولیف (می)

(۷۵)

سب رملتوں کے ساتھ مراعات چاہیئے آپس میں اتحاد ہو وہ بات چاہیئے  
 زندگی وزاہری میں مساوات چاہیئے مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے  
 بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیئے

رُخ کے قریب زلف کی ظلمات چاہیئے دن سے ملی جلی ہوئی یہ رات چاہیئے  
 ہرنے کا اس کی ضد ہی سے اثبات چاہیئے مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے  
 بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیئے

مصروف آپ مشق جفا میں تھے عمر بھر مطلق نہ تھی کسی دل مظلوم کی خبر  
 بیٹھے ہیں اب تو ہاتھوں تلے بچے جگر عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک شخص پر  
 آخر تم کی کچھ تو مکافات چاہیئے

جرات تو دیکھ اس دل کو تارہ دست کی اس نامراد نے کبھی ہمت نہ پست کی  
 اب غم ہے نیست کا نہ خوشی اس کو ہست کی دے داد اے فلک دلِ حُسن پرست کی  
 ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیئے

صورت کو ان کی روح جب اپنی ترس گئی تدبیر کار گر نہ ہوئی کوئی دید کی

اس سے زیادہ مشکل رسائی کوئی نہ تھی      یکے ہیں مہرِ فوں کے لئے ہم مصدق

تقریب کچھ تو بہرِ مملکت چاہیئے

یہ لوٹتا ہے ثروت و اقبال و جاہ کو      کرتا ہوں غافل اس سے دلِ پیش خواہ کو

سمجھا نہیں ثواب کبھی اس گناہ کو      سے سے غرض نشاط ہے کس رویاہ کو

اک گونہ بخودی مجھے دن رات چاہیئے

بے کار شے ہیں ہم وہ محرک اگر نہ ہو ق      مژرایہ راز وہ ہے جو پاتے ہیں راز جو

ہستی کا سب ظہور عدم سے ہے جان لو      نشو و نما ہے اصل سے غالب فرغ کو

فاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیئے

ہر باغ کی ہے باغِ جہاں میں فضا جدا      ہر گلستاں نے پائی ہے آبِ ہوا جدا

ہر گل کی بو جدا ہے روش اور ادا جدا      ہے رنگ لار و گل و نسیم جدا جدا

نہرِ رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

سر میں اگر خودی ہے نہ لے نام بے خودی      خود میں ہے تو نہ کر ہو بس خام بے خودی

کر سجدہ شکر کا جو طے جام بے خودی      سر پہ ہے خم پہ چاہیئے ہنگام بے خودی

رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے

قائم ہو ایک حال پہ کس طرح آدمی      کرنی ہے راہ طے اسے جذبِ سلوک کی

ہر فعل کی ہے حالتِ موجودہ مقتضی      سر پہ ہے خم پہ چاہیئے ہنگام بے خودی

رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے

خالی نہ ہو حقیقت عرفاں سے کوئی بات      انسان حرف حرف سے پیدا کرے نکات  
 نظارہ صفات سے ہو جائے محو ذات      یعنی بحسب گردشِ پیمانہ صفات  
 عارف ہمیشہ مست ہے ذات چاہیے

(۷۶)

ذرا سی جان تن میں، فدا کرنے کو ہوں وہ بھی      رگوں میں جو بہو تھا ہے سرشک لالہ گول وہ بھی  
 جگر رکھتا تھا لیکن، پہاڑ باحالِ زبوں وہ بھی      بساطِ تجزیس تھا ایک ل اک قطرہ خوں وہ بھی  
 سورتا ہے باندا ز چکیدن سرنگوں وہ بھی

یہ کیا کم مہربانی ہے کہ ٹالابات کو اس نے      وگرنہ مفت میں لینے کے دینے پڑ گئے ہوتے  
 خدا نا خواستہ دل سے، نہ وہ روٹھنا نہ ہم روٹھے      ہے اس شہ رخ سے آزر دہ ہم چندے تکلف سے  
 تکلف بر طرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

نکالے کوئے ارمانِ دل آخر مقدر نے      کہ ہم ہوں منتظرِ پیکِ اجل کی آمد آمد کے  
 طبیعت کو ذرا الجھاؤ سا ہے اس تصور سے      خیال مرگ کیا تسکینِ دل آزر دہ کو بخشے  
 مے دامِ تنہا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

سرشکِ خوں بہانے سے تو تھا یہ دعا، ہم دم      کہ دل کی آگ اس پانی سے کم ہو گی ذرا ہم دم  
 مگر اس سے تو سوزِ قلبِ دونا ہو گیا ہم دم      نہ کرتا کاشِ نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہم دم  
 کہ ہو گا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

بجلیے زور بازو پر جہاں تک اپنے اتراؤ      کرو تعریف اپنی سرخرو اس کو نہ ٹھہراؤ  
مہرِ مقتل زیادہ اس کے جوہر کو نہ چمکاؤ      نہ اتنا بریش تیغ جہنسا پر ناز فرماؤ

مے دریائے بیتابی میں ہر اک موجِ خوں وہ بھی

توقع کیا سوال اس سے اگر اک دور کا کیجئے      مناسب ہے کہ اشکِ حسرت و ارماں پیا کیجئے  
سبوحالی دکھا تا ہے جو عرض مدعا کیجئے      سے عشرت کی خواہش ساقی گزروں پر کیا کیجئے

لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام وازگوں وہ بھی

امید و بیم میں مرزا ہو را کہ مدت کو نہ گزراں      نہیں بننے میں تا اس سے ملنے کا کوئی سامان  
کسی صورت پر شکل دیکھئے ہوتی بھی ہر اسماں      مے دولیں ہو غالب شوق وصل شکوہ ہجر  
خلا وہ دن کہ جسے جو اس مے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

نکالے گی نہ چکر سے ہمیں گردشِ زمانے کی      یہ گردشِ جہنم بھی ہر نہایت دل لگانے کی  
زین پر اب کوئی صورت نہیں آرام پانے کی      غم دنیا سے گری پائی بھی فرصت نہ بٹھانے کی  
فلک کا دیکھنا تقریبِ تیرے یاد آنے کی

اسے اپنی پیش کا حال کچھ نہ تو دیا یارب      مگر خط کو مہر وہ پڑھ بھی لے امید کیا یارب  
جلا ہی دے کہ سوزِ دل تو ظاہر ہو ذرا یارب      کھلے گا کس طرح مضمون مے مکتوب کا یارب  
قسم کھائی ہے اس کا فتنے کا خد کے ہلائے کی

اگر ہے آہ انتشارِ نالہ آتش افشاں ہے      نہیں چارہ کہ عالمِ آشکارا زہنِ نہاں ہے  
دباؤں یہ دیکھتی آگ کو نکر عقلِ حیراں ہے      لیٹنا پرنیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہے  
دے شکل ہے حکمتِ دل میں سورِ غم چھپانے کی

کوئی بے کاران کا جانبِ گلزار جانا تھا      گلستاں کو مگر اس رنگ سے مقتل بنانا تھا  
گلوں کو بھی نوپنے زخمِ خورِ دہوں بل جانا تھا      انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا  
اٹھتے سیرِ گل کو دیکھنا شوخیِ مہمان کی

مقدر ہی میں تھا کچھ نتیجہ سے افسوں ساز پر مرنا      بد انجامیِ تھی اپنی خوبیِ آغاز پر مرنا  
مناسب تو نہ تھا اس ظاہری انداز پر مرنا      ہماری سادگیِ تھی السفاتِ ناز پر مرنا  
نرا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہیدِ جانے کی

غمِ دوراں کے شکوے حقیقتِ کھل گئی اپنی      طبیعت کی وہ قوت اور وہ جولانیِ غلطی  
حسینوں کی اٹھائے بات کس کو تباہ آتی      لکھ کو پِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی  
مہرِ طاقتِ کرمِ ضامنِ تھی تو نکلے ناز اٹھانے کی

رہنے میں نہیں سچی محبت کا نشانِ غالب      جنہیں کہتے ہیں خلیصِ مُرست اب میں کہا غالب  
بیانِ حال میں قاصر ہو کر زباںِ غالب      کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابتداءِ زمانِ غالب  
بدی کی اسنے جس سے ہنسنے کی تھی بارہا نیکی

زنداں سے بھی زیادہ برا یہ مکان ہے      اک قبیہ میں پڑے ہیں مصیبت میں جان ہے  
یہاں فقط خیال میں کائنات ہے      کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے  
جس میں کہ ایک بیضہ مور آسمان ہے

سیارے گھومتے ہیں فلک پر نیسے لئے      اسباب اور کچھ بھی نہیں ان کی سیر کے  
چکر دیئے ہیں چرخ کو تیری تلاش نے      ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے  
پر تو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

بے چارہ دل حوادثِ دنیا سے بے تنگ      ہو کیوں نہ چور چور کہ کھایا ہے سخت سنگ  
اس سنگِ ن کے وہم سے ہی میری عقل دنگ      حالانکہ ہے یہ سیلی خارا سے لارنگ  
غافل کو میرے شیشے پر سے کاگان ہے

اپنا تو دل تھا آگ سے گویا بھرا ہوا      کرتا قیام پھر وہ اس آتش کدے میں کیا  
خالی تھا سوزِ عشق سے ہاں دلِ قریب کا      کی اس نے گرم سینہ اہلِ ہوس میں جا  
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

کچھ بات جھک کے کان میں کہنا بہانہ تھا      آخر کوئی سبب بھی تھا دامن کی آڑ کا  
اب تم دھناتی سے تو نہ جھٹلاؤ برلا      کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا  
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

آنکھیں لگی ہیں جانبِ درانتظار میں      تصویرِ سافخوش ہے شوقِ نگار میں  
آیا ہے گشتِ کر کے ابھی خارزار میں      بیٹھا ہے جو کہ سایہِ دیوارِ یار میں

فرماںِ روائے کشورِ ہندوستان ہے  
غم نے لہو پلائے کا اچھا سلا دیا      اک داغِ جاں گدازِ جگر پر لگا دیا  
اس داغ نے تمام جگر کو جلا دیا      ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا  
کس سے کہوں کہ داغِ جگر کا نشان ہے

اس پر جو ڈالتے نہیں وہ قہر کی نظر      ظاہر ہوا نہیں ہے بھروسہِ رقیب پر  
مڑنا کا بختِ برسرِ یاری ہے سر بہ سر      ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر  
غائب ہم اس میں خوش ہیں کہ ناہر بان ہے

یا تو میں کرتا تھا غمتِ آہِ وزاری ہائے      اور تو کرتا تھا کچھ غمِ گساری ہائے  
یادِ م آخرِ جفا کی شرطِ یاری ہائے      درختِ میسے ہے تجھ کو بے قرار ہائے  
کیا ہوئی ظالم تری نفلتِ شعاری ہائے

دل کا دل ہی میں رہا کچھ بھی نہ نکلا حوصلہ      پستِ ثابت ہو گیا الفت میں تیرا حوصلہ  
منہ چھپایا مجھ سے بس اتنا ہی مالِ حوصلہ      تیرے دل میں گزرتھا آشوبِ غم کا حوصلہ  
تو نے بھر کیوں کی تھی میری غمِ گساری ہائے

عہد تجھ سے زندگی بھر کے لئے تو لیا      کیا خبر تھی زندگی نکلے گی تیری بے وفا  
سامنے آیا مری تقدیر کا کھٹا ہوا      عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا

عمر کو بھی تو نہیں تھی پاداری ہائے      ہو پھر اس سے کیا خوشی کیا دل کو بھائے زندگی  
کون مر کر جئے چوٹے میں جلے زندگی      زہر گنتی ہے مجھے اب وہوئے زندگی  
یعنی تجھ سے تھی اسے ناساز گاری ہائے

ناز کی سے یاد کتنا تھا تر از رخ پھول سا      صورتِ برگِ خزاں یا اب ہے مرجھا یا ہوا  
کس ہونے لے گلِ تر تجھ کو پتہ مردہ کیا      گلِ فشانِی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا  
فاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے

تجھ کو رہنا تھا ہمارے دیدہ نمناک میں      یا مناسب تھا بنانا گھر دل صد چاک میں  
خوبیشتن داری سے تیری آگیا دمِ ناک میں      شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں  
نتم ہے الفت کی تجھ پر پڑہ داری ہائے ہائے

کامیابی اب کہاں ہے بات ہی اے دل گئی      وہ بہارِ عاشقی وہ رونقِ محفل گئی  
عہد لینے کی وہ ساری سعی لا حاصل گئی      خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی  
انہ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

منہ چھپا یا خاک میں کیوں آخر کیا خیال      کیا کسی پر ہو گیا ظاہر ترے دل کا خیال  
جب کہ رسوائی کا تھا ظالم تجھے اتنا خیال      کیوں مری غمخواری کا تجھ کو اتنا خیال



دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے  
 اونچے اونچے وار جب اس نے لگائے بار بار  
 دکھ گئی نازک کلائی اور بازو شل ہوا  
 ہاتھ ہی تیغ آنا کا کام سے جاتا رہا  
 دل پر اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے  
 کر دیا ہے بے طرح رنج و الم نے خستہ حال  
 موت کا آنا کٹھن ہے اور جینا ہے وبال  
 صبح کرنا شام کا وقت زندہ کو ہے محال  
 کس طرح کاٹے کوئی شہائے تارِ نیرنگال  
 ہے نظر نحو کردہ اختر شماری ہائے ہائے  
 کون ہے اب سینے والا کس کہنے اپنا حال  
 دور کیجئے کس کی صورت کچھ کر دل کا ملال  
 کوئی دیکھے تو مری حیراں نصیبی کا کمال  
 گوشِ محروم پیام و چشمِ محروم جمال  
 ایک دل تس پریرنا امیدواری ہائے ہائے  
 نام گوشہ پر دنیا میں ہوا ہے نام و رنگ  
 حال مرزا دیکھ کر اہل جہاں ہوتے ہیں دنگ  
 دل میں باقی تھی ابھی صحرا نور دی کی انگ  
 عشق نے پکڑا نہ تھا غائب ابھی وحشت کا رنگ  
 رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

کیوں قیدِ زندگی سے دل اتنا ادا اس ہے  
 جب اس سے چھوٹنا ہے تو پھر کیا ہر اس ہے  
 کہتے ہیں جس کو موت وہ ہر وقت پاس ہے  
 سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے  
 تسکین کوئے نوید کہ مرنے کی آس ہے

پھر تاپے رات دن یہ پریشان ادھر ادھر      اس کو نہیں قیام کبھی ایک حال پر  
 وحشت زدہ کے حال سے اور غفلت اس قدر      لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر  
 اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

جنات کو دکھائی نہ اس درد کی جھلک      محروم اس منز سے رہے سر بسر ملک  
 ہوں اس عطائے خاص جو منت کش ملک      کیجئے بیان سرور تب غم کہاں تلک  
 ہر مو مرے بدن پر زبانِ سپاس ہے

ہوتا ہے مجھتوں ہی سے انسان بُرا بھلا      صحبت ملی بھی اس کو مگر کیا اثر کیا  
 ہونا تھا آشنائی دل سے حق آشنا      بے وہ غرور حسن سے بیگانہ وفا  
 ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے

سودائی ہیں وہ جن کو ہے سہا سہو اجتناب      انساں کو چاہیئے کہ پئے جائے بے حساب  
 کرتا ہے خوب جذبِ رطوبات آفتاب      بی جس قدر ملے شبِ تہاب میں شراب  
 اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

مزا پہلے دشت میں چاروں طرف اسد      رولق فراواہاں ہے درختوں کی صفِ اسد  
 درِ ثمیں ہے باعثِ قدر صرف اسد      ہر اک مکان کو ہے مکین سے شرف اسد  
 مجھوں جو مر گیا ہے تو جنگلِ اداس ہے

میری غمخواری پر بحث قلیل و قال ہے      طلب کو میرے پائے کوئی کیا مجال ہے  
کہتا ہوں سب مجھ اور زبان میری مال ہے      گزرا مٹی سے فائدہ انھائے حال ہے  
نوشِ سول کی بیہ کایا نہ مخصوصی مجال ہے

اجہ جہ باہر سن کے دل کی کاہل ہے      زبان ہے برجِ ستار کا کھل ہے  
سنا رہا کہ کھانا کھا رہا ہے      کھانا کھا رہا ہے کھانا کھا رہا ہے  
دارِ روضہ حریف زبان پائے مال ہے

وارثہ کو کپ سے نہ رہا ہے      کہیں مری ہوں کاش کبھی جلوہ آفتاب ہے  
مشاق سے کیا کرتا ہوں      روضہ میں ہے آئینہ پر آفتاب ہے  
رجہ کر کے نہ رہا ہے      روضہ میں ہے آئینہ پر آفتاب ہے

پرمنا سے کی ہے پیمانی      ہر آئینہ کو سے لے کر ہے ہر آفتاب ہے  
رمینہ سے کیا ہے پیمانی      ہر آئینہ کو سے لے کر ہے ہر آفتاب ہے  
سہ سے کیا ہے پیمانی      ہر آئینہ کو سے لے کر ہے ہر آفتاب ہے

خوشی سے نہ رہا ہے      ہر آئینہ کو سے لے کر ہے ہر آفتاب ہے  
انسان کے ہاتھ ہیں شب و آفتاب      ہر آئینہ کو سے لے کر ہے ہر آفتاب ہے

ناف زلیں سب ذلہ و غزال ہیں      ہر آئینہ کو سے لے کر ہے ہر آفتاب ہے  
یہ روضہ ہے

گردش کا میری اور ہی کچھ رنگ ٹھنک ہے      گردوں بھی دیکھ کمری حالت کو رنگ ہے  
جوشِ جنوں میں یتنگ و دوکی انگ ہے      وحشت پہ میری عرصہ آفاق تنگ ہے

دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

مرزا کی طرح نفس کو بجھا آیا تو اسد      اس خواب پر نہ بھول کر اتر آیا تو اسد

دھوکہ نہ دیا، مد سے کہیں کھا آیا تو اسد      ہستی کے مت فریب تیں آجا آیا تو اسد

عالم تمام حلقہ دایم خیال ہے

غیر سے تجھ کو محبت ہی سہی      تجھ سے دنیا کو الفت ہی سہی

تجھ پر انہماکیا کو سبقت ہی سہی      عشق نے تجھ کو بھی وحشت ہی سہی

میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

کوئی ایسی خطا کی ہم نے      جس سے لائق نہ رہے محفل کے

۱۳۶ء کا دور۔ مشکیں لاس کبہ کعبہ کو سیاہ فرسودہ، اعراف و انوار غراں ایک خاص قسم کا  
ہل حال کی ناف سے مشک نکلتا ہے اسے نافِ غراں کہتے ہیں۔

ناف میں زمین کا مرکز حضرت علیؑ کی جگہ دیا کرتے تھے۔ او ان کے خلیفہ علیؑ عاتق حضرت علیؑ کی  
تقریب کرتے ہوئے فرماتے ہیں یہ مات متہور ہے کہ وسط میں ہے یعنی زمین کا مرکز ہے لیکن یہ بات نہیں کہ  
وہ نافِ غراں بھی ہے۔ حضرت علیؑ کی ہر بانی سے کعبہ کے شعب کی خوشنویس تمام دیا میں پھیلے ہیں۔

سلسلہ کچھ تو لگائے رکھئے قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے

کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہے کہاں کی یہ بھلا دانائی کیوں ہے مرغوب تمہیں تنہائی

نہ جنونی ہوں نہ میں سودائی میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی

اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

عالم کن کو دبستاں سمجھو اس سے ملتا ہے سبق انساں کو

بھول کر غیر کا احساں نہ لو اگلی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو

آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

ہے کہاں مثل شرر اسکو قیام گرم رفتار یہ رہتی ہے مدام

نہ توقف ہے نہ دم بھر آرام عمر ہر چند کہ ہے برق خرام

دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

رات دن عشق کا دم بھرتے ہیں رنج و ایذا سے نہیں ڈرتے ہیں

ان پر مرت کے لئے مرت ہیں ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں

نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

۱۔ ایک حدیث ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا یعنی اپنی ہستی ہی سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

حضرت قاتب فرماتے ہیں جو کچھ حاصل ہوا اپنی ہی ہستی سے ہونا چاہیے۔ اگر اپنی ہستی سے معرفت حاصل نہیں ہو سکتی تو اپنی ہستی سے غفلت ہی حاصل کرنا چاہیے۔ خودی مٹی جب مٹی خدائی۔ حاصل کلام پر دوسرے کا احسان نہیں اٹھانا چاہیے۔

شاد ہیں دور میں تیرے اہلاف اور ناشاد و حزیں ہیں اہتراف  
 اس قدر دین نہ ہوگی اہراف کچھ تو دے اے فلک نا انصاف  
 آہ و فریاد کی فرصت ہی سہی

بحر میں غم کو ترے پالیں گے داد بھی اس کی کبھی پالیں گے  
 جس طرح ہو گا یہ دن ٹالیں گے ہم بھی تسلیم کی خود ایلں گے

بے نیازی تری عادت ہی سہی  
 کیا عجب ہے کہ وہ شرمائے اسد کچھ کرے رحم ترس کھائے اسد  
 یہی مزا کی بھی ہے رائے اسد یار سے چھڑ چلی جائے اسد  
 گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

(۸۳)

آوازے رات غیر سحر تک کسائے دل کھول کر مذاق برابر کیا کئے  
 پاکر خموش مجھ کو جو چاہا کہا کئے اس بزم میں مجھے نہیں بنتی جیا کئے  
 بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

بن کر فقیر میں ترے در پر اگر گیا در بان مجھ کو دیچے کے غصے میں بھر گیا  
 چپ چاپ میں جو تیری گلی سے گزر گیا دل ہی تو ہے سیاستِ دہاں سے ڈر گیا  
 میں اور جاؤں در سے ترے بے صدا کئے

آئی ہے پھر چن میں بہارِ خمستہ پے  
قصہ ہوا ہے زبردِ ریائی کا آج طے  
اس مہمان کی نجی خاطر عزیز ہے  
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و بجا دہ رہن

مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کئے

جو دستیاب آدمی کو گرجہ عمرِ خضر  
دانا کبھی نہ لے اسے دو گرجہ عمرِ خضر  
لاکھوں ہی پائیں ایک نہ دو گرجہ عمرِ خضر  
بٹے صرف ہی گزرتی ہے ہوئے عمرِ خضر

حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

سپا امین اس کو سمجھتے رہے فہیم  
اب وہ جوابات کہیں ہں نذرِ نسیم  
سب مال اس نے ہضم کئے بے ہراس و بیم  
مق و رہو تو خاک سے پوچھوں کہ لے لیم

توبہ وہ گہرائے گدراں مایہ کیا کئے

اے ات بے ہمایہ بے سنجو  
بہتان اٹھاتے رہتے ہیں ہنگام گھٹنگو  
پھرتے ہیں مائے مائے تحسین میں کو بکو  
کسی ریز تہمتیں نہ تراشائے عدو

کس دن ہمارے سر پہ نہ آئے چلا کئے

آخر بڑی کہاں سے اسے بمنشینِ خو  
ہر گز کسی حسین کو زیبا نہیں یہ خو

ملہ حرد و کادہ۔ یعنی گودری و سننے آدوں کو رہیں رکھتے پھرتے ہیں۔ دوسرے موسم ہمارے ہیں نظر ہے  
گونا داری ہے پھر دونوں چیزوں سے نہ کام لیتے ہیں۔ خوب شوخی دکھلائی ہے۔

سے حضرت خضر عرِ اوداں رکھتے ہی طر کیا گ کہ وہ بھی قیامت کے روز ہی کہیں گے کہ ہم نے کچھ نہ کیا بھفر  
عمر گزار دی۔ عمر کے متعلق ایک اور شعر بھی کہا ہے یہ

وہ زندہ ہم ہیں کہیں روساں خلق لے حضر  
نہ تم کہ چور سے عمرِ جاوداں کے لئے

رکھنا متقا بیشتر تو نہ وہ مزجیں یہ خو صحت میں بغیر کی نہ پری ہو کہیں یہ خو  
 دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کئے  
 انکھوں میں یوں تو اور کئی دنیا میں نازیں لیکن نہیں ہے سادہ دل ایسا کوئی جس میں  
 ہر تہد میں تو اس کو کہوں گانہ ہم نشیں حسد کی ہے اور بات مگر خوبری نہیں  
 بھولے سے اس نے سیکڑوں عسے وفا کئے

مہر نے عرض حال کا پایا جواب کیا لوگے تم اپنی بات کا اچھا جواب کیا  
 چاہو نہ تم جواب تو اس کا جواب کیا خاکب تمھیں کہو کرے گا جواب کیا  
 مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سنا کئے



وحشت اثر حیات جہانِ خراب ہے مثل شر قیام کی یہاں کس کو تاب ہے  
 اس رہ گزریں جو ہے وہ پا در رکاب ہے رفتار عمر قطع رہ اضطراب ہے  
 اس سال کے سب کو برق آفتاب ہے  
 ہاں بزم سن میں رنگ نرالی بہار کے ہر جام پُر شراب گل تر ہے دیکھ لے  
 مرغ چمن کا ہے بطے پرگیاں مجھے بینائے ہے سرو نشاط بہار سے  
 بالی نذر و جلوہ موجِ شراب ہے  
 تھا دل کو شوق اک نگہ انتفات کا معلوم تھا نہ حال ان آنکھوں کی گھات کا



طے ایک تیر میں ہوا قصہ حیات کا زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا  
نے بھانگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

دہرِ خراب میں ہے خرابات کی صفت مژدہ ہوئے نشوں کو تو مستون کو تہنیت  
جاگیر یہ وہ ہے کہ انھیں کو ہے تولیت بادا و بادا نو شہ زنداں ہے شمش بہت  
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

تارِ نظر کو کرتی ہے اس کی چمک فنا اس پر نگاہ ڈالے کسی کو ہے تاب کیا  
آساں نہیں ہے ہر درخشاں کو دکھینا نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا  
جوش بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

پہلے ہی کچھ تو شوق میں تھا حالِ لبوں دیدار سے تو اور بھی اس کا بڑھا جنوں  
اب اور ہی کچھ اس کو تمنائے کیا کہوں میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں  
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

جھڑتے ہیں پھول یوں تو لبِ اندازے مرزا یہ گل مرے لئے کیا کم ہیں خار سے  
یہ اور بات چیت کرے اس نگار سے گزرا اسد مسرت پیغام یار سے  
قاصد پر مجھ کو رشک سوال و جواب ہے

وہ اگر میری تمنا پر ترس کھا جائے ہے سامنے آنکھوں کے برق حسن پر کھا جائے ہے

خود بخود آنکھوں کے آگے نیرنگی چھا جائے ہے      دیکھنا قسمت کراپ اپنے پر رشک آجائے ہے

میں سے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

انہیں سسکتی ہے ہرگز تاب آتش کوئی شے      ہوتے ہی دو آتشہ تیزاب ہو جاتی ہے

سوز بہناں بڑھکے قہر خود بخود کر دیگا طے      ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گرا نہ بیٹھے میں ہے

آہیگنہ تندئی صہبا سے پگھلا جائے ہے

تھا مناسب کوئی تدبیر ایسی دشمن کی کسے      گفتگو میں تانہ وہ ہر بار بے باکی کرے

کیوں دل اسکا بڑھے جب گزرتی کرے      غیر کو کیونکر وہ یارب منع گستاخی کرے

گر جیسا بھی اس کو آتی ہے تو شرم اچائے ہے

صبر کب تک کیجئے اور کب تنگ غم کھائیے      تاب کے حال دل پر درد سے دکھ پایے

دل کو ضبطِ نالہ کی تدبیر کیا بتلائیے      شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائے

دل کی وہ حالت کرم لینے سے گھبرا جائے ہے

کیا مسرت خیز ہے اے دوست تیری بزم گاہ      تو جہاں ہو پھر وہاں غم پانہیں سکتا ہر راہ

واہ ہوتی ہے وہاں جا کر اگر کرتا ہوں ہ      دور چشم بد تری بزم طرب سے واہ واہ

لغہ ہو جاتا ہے واں گرنالہ میرا جائے ہے

اے حضرت غالب نے یہ ایک نیا مضمون باندھا ہے وہ غیروں کے بجائے اپنے آپ سے ہی رشک کر رہے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے محبوب کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر بھی رشک آ جاتا ہے لہذا میں اس رشک کی وجہ سے اس کو اچھی طرح دیکھ نہیں سکتا ہوں۔

ابک اور شعرا ہی مضمون کا ہے ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے چہرے ہی سے انکی تمنا نہیں کرتے۔

ہم یکب کہتے ہیں ظاہر ہو کوئی انداز عشق      یا ہمیں دنیا کہے وارفتہ و جانبا ز عشق  
کیا کریں جب بد جو اسی اپنی ہو غما ز عشق      گر چہ ہے طرز تغافل پردہ دار ز عشق  
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

دشمنوں کے حال پر وہ آج کل ہے مہرباں      کچھ ہماری بھی نے اتنی اسے فرصت کہاں  
وہ ہے اور آٹھوں پہر اغیار کی دلداریاں      اسکی بزم آریاں سکر دل زنجوریاں  
مثل نقش مدعاے غیر بیٹھا جائے ہے

اک تو قدر نہ ہی لے سکوناز میں پیدا کیا      اور اس میں تھا ہی کیا ناز و نزاکت کے سدا  
اور سونے پہ سہاگ عشق کا آنا ہوا      ہو کے عاشق وہ پیری رخ اور مازگ بن گیا  
رنگ کھلتا جائے ہے بہتہ کا اڑتا جائے ہے

دیکھیے تصویر کی سبکبندی بھی اف - سازیب      اور عقیق لب میں ظاہر جو ہر اہماز ہیں  
اللہ اللہ اکب کہنے میں ہی سوا داز ہیں      نفس کو اس کے مصو پر ہی کیا کیا ناز ہیں  
کہینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کہینچتا جائے ہے

رکھتے ہیں سر سے احباب طن بغض و حسد      دیکھتے اس کیسی کی بھی کہیں ہوتی ہر حد  
تیرہ نختی لائی ہے کیا رنگ اللہ الصمد      سایہ میرا مجھ سے مثل دور جھلکے ہر اسد  
پاس مجھ تڑپاں بجاں کے کس سے ٹھہر جائے ہے

جاں نثاری کی تمنائے آب گل میں ہے      کچھ تمنا اور ہی لیکن دل بسمل میں ہے  
کیا کروں تدبیر بارب جان اک تنگل میں ہے      سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے  
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہے

دل سے دل کورا ہے مجھ کو یقین ہرگز نہ تھا      گفتگو کی آج کچھ اس نے تو عقدہ کھل گیا  
کوئی میرے جی سے پوچھے اسکی باتوں کا مزا      دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا  
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

قطع مجھ سے کر چکے وہ دوستی کا سلسلہ      ان کی نزم عیش کے قابل کہاں ہیں غمزدہ  
پھر بھی ہر دم کچھ نہ کچھ رہتا ہے میرا تذکرہ      گریہ ہے کس کس برائی سے لے بائیں ہمہ  
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

تو اگر چہا جائے گی ہم پر نصیبست ڈھائیگی      جب نہ ہوگا شغل دل پر اک قیامت آئیگی  
زندگانی بے مزہ کر کے مزا کیا پائے گی      بس بھومنا امید ی خاک میں جا جائیگی  
یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

ہم تو کرتے سر کے بل چل کر رہ مقصود طے      بیٹھنے کا ضعف کرتا ہے تقاضا پلے بپے  
پاؤں نے پکڑی زمیں زنجیر پاپے کوئی نشے      رنج رہ کیوں کھینچنے واما ندگی کو عشق ہے  
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

دل رقیبِ روسیہ کا پیش کی منزل سہی ہم نے لومانا کہ ہم جلنے ہی کے قابل سہی  
 سوزِ غمِ رگہائے تن میں خون کے شامل سہی جلوہ زارِ آتشِ دوزخ، ہمارا دل سہی  
 فتنہٴ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے  
 غبارِ نرے نزدیکِ مرزا قابلِ قہر و عتاب پھر کیا اک بے گنہ کو کیوں گرفتارِ عذاب  
 اُن مصیبتِ نکالِ اسکو کہ حالتِ ہر خراب ہے دلِ شوریدہٴ غالبِ طلسمِ ہیچ و تاب  
 رحم کر اپنی تنہا پر کہ کس مشکل میں ہے



خالی نہ تیری چشمِ کرم کی نظر گئی چمکی مثالِ برقِ ادھر آئی اُدھر گئی  
 سینے ہی تک نہ صرف یہ اگر گزر گئی دل سے تری نگاہِ جگر تک اُتر گئی  
 دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی  
 وہ دورِ جام ہے نہ وہ ہے پرستیاں وہ بزمِ دل رہا ہے نہ ساقیِ دستان  
 سرخوش کہاں، خالص ہے اتوں گزراں وہ بادۂ شہانہ کی سرمستیاں کہاں  
 اٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی  
 مدت سے آرزو تھی دل بے قرار میں پھر ہوں تو اڑ کے جایئے بزمِ نگار میں  
 مرکزِ ہیچ گیا ہوں میں اس رہ گزاریں اُڑتی پھرے ہے خاکِ مری کوئے یار میں  
 بارے اب اے ہوا۔ ہو سی بال و پر گئی

کیوں کر بھائے ہم کو نہ پرواز نقش پا      گھر کر رہا ہے دل میں ہر اک باز نقش پا  
دلکش ہے کتنی طرزِ فسوں ساز نقش پا      دیکھو تو دل فریبی اندازِ نقش پا  
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کستر گئی

غنی خاص یہ روش کبھی مردانِ کار کی      یہ وضع ہر وضع نے اب اختیار کی  
جاتی رہی تمیز ہی اغیار و یار کی      ہر لواہوس نے حسن پرستی شعار کی  
اب آبروئے شبوہ اہلِ نظر گئی

عالم ہی اور ہے ترے حسنِ شباب کا      مشکل ہے دیکھنا رخ پر آبِ تاب کا  
بے سود و رائیگاں ہوا اٹھنا حجاب کا      نظارہ نے بھی کام کیا وہاں نقاب کا  
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

بانا وہ مجھ سے ہاتھ چھڑا کر غضب ہوا      ہر چہز تم نے وعدہ فردا کیا تو کیا  
دشوار ہو گیا دلِ مضطر کا تھامنا      فرد و دنی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا  
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مرزا کی طرح دیکھتے تھے شاداں تمہیں      پیری میں بھی جہان نے پایا جوان تمہیں  
لیکن غمِ عالم نے کیا خستہ جاں تمہیں      مارا زمانے نے اسدا لشخاں تمہیں  
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

رہنے کو کیا برباد جو جنت میں گھرے      پھر تو جہاں جہاں ہے وہاں تو اگرے  
آرام دل کو جھوڑے رخ دیکھ کرے      تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظرے  
تو رانِ خلد میں تری صورت مگرے

اس طرح کر چہا کے رخِ دفن بعدِ قتل      ظاہر نہ ہو ہوا ہے کدھر دفن بعدِ قتل  
فائلِ اُترے نہ اندازِ دفن بعدِ قتل      اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل  
میں سے خلیق کو کیوں تیرا گھرے

بھول گیا ہے تو وفا داری قدیم      ایسا گیا کہ جا کے وہیں ہو گیا معیم  
نہ رہیں سے تالی دل معیم      تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم  
میرا سلام کہیو اگر نامہ برے

شہورہ ہمارا، اترنے پر عشق کا      صحرائیں کھنچ کے راقہ لپیٹے چلا گئے

۱۔ میر تقی میرؒ کو اترنے پر میر کا سر کے متعلق کیا خوب شعر فرمایا ہے ملاحظہ ہو۔  
۲۔ دیکھ ۶۱۔ یہ معنیوں چھ آمار جاہتا ہے یعنی سنا کر ایک قاصد کی ضرورت ہوئی مگر یہ کہ  
قاصد کسی تیری سرعائیں نہ بوجھے ایک عائن کا ایک شعر کو لایا اور اس نے عاشق سے کہا کہ  
”میر تقی میرؒ اتر رہے ہیں۔“ عائن ہوں کہ یہ اسی طرح نہ کر گیا خبر اس کے پاس خط بھی لیا قصداً عاشق کو اگلا  
ماہیو دے گا تو اب اس کو دیکھ کر رو شیفقت ہو گیا کہ خط کیا جواب دیو انہی نے کہلے پھر اتر چکی کو جلد یا اب نہ تو  
اور ”قبول“ کے بعد یہ دم سے ہوا ہے کہ عین دل لودار ہے کسی کے باطن کی کسی کو کیا جڑے یہ مجھے کچھ کلام ہنس  
اگر نامہ کرے جائے تو اسکو مر سلام کہیو کیوں صائم کیا دعوے عاشق نہ ہونے کر مٹے تھے اور ایسا کار کا ہوا

اُس جذب کا ہمیں نہیں بے وجہ ادعا      تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا  
 فرصت کشاکش غم پنہاں سے گرے  
 طے کی ہیں ان کے ساتھ بہت سے منزلیں      لیکن نہ پیشتر و کبھی مانیں گے ہم انہیں  
 اس رہ میں راہبر کی ضرورت نہیں ہمیں      لازم نہیں کہ حضر کی ہم پیروی کریں  
 مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر لے

نام خدا تم آج ہو ساقی بامِ جم      اغیار اور حریف ہیں اس بزم میں ہم  
 دیتے ہو ہم کو بے تو نہ دیں کسی کو حکم      ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم  
 ریشہ پیا پیا کرتے ہیں بے حسد رے  
 مدت ہوئی ہمیں نہیں مہرا کا بچہ پتا      اس آستان کے خاک نشینوں میں وہ بھی تھا  
 وہ بھی وہیں تھا جہاں ہو کر رہتا      اے ساکنانِ کوچہ دلدار دیکھنا  
 تم کو کہیں جو غالبِ آشفہ سر لے

اُس طرف زخمِ جوانی اور ہے      اُس طرف کچھ ناتوانی اور ہے  
 کوئی دن گر زندگانِ او ہے      گر یہی نامہ ربانی اور ہے  
 اپنے دل میں ہم نے ٹھکانی اور ہے

میں نے جنوں مرثیوں کو اس صحرایہ مطلب میں لکھا ہے۔ ایسی کوئی اشکال نہیں جو لفظ میں وہی معنی ہو، اور اپنا قصہ کہتا  
 تاتے کہیں کیا کروں گا۔ ہم کہہ رہے تھے کہ وہ کاھلے نہر میں یا لواج شہر میں گئے مگر فقیر ہو کر بیٹھ رہے ہوں چھوڑ کر



میرے سینے پر بے گلِ خن کا گساں ہے زبانِ شمع کی صورت زباں  
کیا بتاؤں اپنے دل کی گرمیاں آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں  
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

ہم نشیں ان سے سفارش کیا کریں حکم یہ ہے نام بھی میرا نہ لیں  
کہئے اب کس طرح راضی انھیں بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں  
پر کچھ اب کے سرگرائی اور ہے

اپنی کو کیا زواں اور کیا خطر صاف کہہ دے گالیاں دی ہوں اگر  
ہو رہا ہے کیوں تامل اس قدر دے کے خط منہ دیکھتا ہر نامہ برد  
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

دور میں ہیں چرخِ گرداں پر نجوم رات دن ہیں دائرِ محور نجوم  
دہر میں ہیں وجہِ خیر و شر نجوم قاطع اعمار ہیں اکشر نجوم  
وہ بلائے آسمانی اور ہے

آچکا ہے غمِ قریب اختتام ٹوٹنے والا ہے کوئی دم میں ام  
منتظر رہتا ہے مرزا صبح و شام ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام  
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

اے نوابِ ناز و دلہا و دلہا کو لکھتے ہیں یہ دن مجھ پر گزرتے ہیں گرمی میں میرا حال بعینہ وہ ہوتا ہے جیسا زبانِ گہائی  
پینے والے جانوروں کا خصوصاً اس توڑ میں کہ دم و ہم کا نجوم ہے آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں اے میری ہدیٰ و قور  
کو لکھتے ہیں وہاں کو کیا پوچھتے ہو؟ قدرِ اندازِ فضل کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا قاتل ایسا عام۔ بوٹا ہے دانی خدا

کچھ وہاں کی خبر نہیں آتی      کیوں صبا راہ پر نہیں آتی  
کوئی تدبیر کر نہیں آتی      کوئی امید بر نہیں آتی  
کوئی صورت نظر نہیں آتی

چرخ آزار کے ہے کیوں درپے      چین دیتا نہیں مجھے ہے  
ہوتی ہے اپنے وقت پر ہر شے      موت کا ایک دن معین ہے  
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

دل ہی جب گم ہے دل لگی کیسی      پاس تھا جب تو کچھ انگ بھی تھی  
کچھ ہمیں اب تو ہو گئے مٹی      آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی  
اب کسی بات پر نہیں آتی

حسن بندوں کا ہے ریاضت و زہد      بسندگی اور نیک سیرت و زہد  
زیورِ عبد ہے عبادت و زہد      جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد  
پر طبیعتِ ادھر نہیں آتی

بقیہ ص ۱۹۱ :- سخت کال ایسا پڑا، اوبائیوں ہو، "لسان الغیب" نے دس برس پہلے فرمایا ہے

ہو چکیں قاتل بلائیں ستیام      ایک مرگ ناگہانی اور ہے  
میاں شہزادہ کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وہاں عام میں مرزا پہنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میسری  
کسرِ شان تھی بعد رنجِ فساد ہوا مجھ لیا جائے گا۔

ہونے دو حسرتوں کا دلیں خوں وہ بگڑ جائیں گے اگر کہدوں  
اپنے دل میں ہے اور ہی مضموں ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ پیسوں  
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

میرے نالے کہیں ٹھہرتے ہیں جا کے روزان کے کان بھرتے ہیں  
خوش تو ہیں وہ مگر مکتے ہیں کیوں نہ جینوں کر یاد کرتے ہیں  
میری آواز گر نہیں آتی

دکھ سے فست جوں ذرا پاتا چیر کر سینہ تجھ کو دکھلاتا  
مقل ہوتی تو خود سمجھ جاتا داغ دل گر نظر نہیں آتا  
بو بھی اسے چارہ گر نہیں آتی

ہے شکایت عبث تغافل کی کیا کہیں کچھ خبر نہ اس نے لی  
جب ہمیں خود خبر نہیں اپنی ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی  
کچھ ہمساری خبر نہیں آتی

روز کے غم سے جان پر ہے بنی یا رب اس سے نجات کب ہوگی  
ہو گیا سیر زندگی سے جی مڑتے ہیں آرزو میں مرنے کی  
موت آتی ہے پر نہیں آتی

اے غالب صاحب لطیف نگار کی کو لکھا ہے "میرا بھادو کون" میرا لانا فضل حق الیاد و موت مرحلے عتاب  
نیمہ روزہ نیم جاں رہ طاع مرنے ہیں آرزو میں مرنے کی آگے آتی تھی حال دل یہ سنسی الم اگر جوان ہوتا اور میرا رہ  
آپ سے دعا ہے خیریت جاہتا اسی برس کا لڑکا ہوئے آیا ہوں دعا کے مغرت کا امیدوار ہوں (ماقی ص ۱۳۸)

ہوش میں تم جو آؤ گے غالب      ہند مرزا سے پاؤ گے غالب  
 حق کو کیا منہ دکھاؤ گے غالب      کبھے کس منہ سے جاؤ گے غالب  
 شرم تم کو مگر نہیں آتی

(۹۱)

نالہ و آہ میں دھرا کیا ہے      حاصل گریہ و بُکا کیا ہے  
 اس ترپنے سے مدعا کیا ہے      دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے  
 آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہے یہاں دل کو شوقِ جلوہ یار      اور وہاں پر وہ مانعِ دیدار  
 ان کو ہے بات بات پر انکار      ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار  
 یا الہی یہ ماجرا کیا ہے

غیر کب تک کہے گا حالِ دروں      آپ کب تک سنیں گے یہ مضموں  
 ہو چکی انتہائے ضبط و سکون      میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں  
 کاش بوجھو کہ مدعا کیا ہے

باقی ص ۱۶۴ :- شرابِ کجخت اب بھی چھوٹی نہیں۔ غارِ کاب بھی عادی ہوتا نہیں۔ "عانتا ہوں نوا طاعتِ زبدِ لا  
 کبھے کس منہ سے جاؤ گے غالب ۱۶۴

۱۶۵ میر بہری کو ایک خط میں لکھتے ہیں "میر بہری و میر فرراز حسین مجھ سے ناخوش اور گورمند ہوں گے اور کہنے  
 ہوں گے کہ دیکھو میں خط نہیں لکھا ہے میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں۔ کاش بوجھو کہ ماجرا کیا ہے  
 ماجرا یہ ہے کہ میرا بھی تو کوئی خط نہیں آیا جس کا جواب لکھتا ہے"

کہتے ہیں واقفانِ غیب و خہود ایک ہیں عبد و عابد و معبود  
آخر ان کا ہے اس سے کیا مقصود جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود  
پھر یہ ہنگامہ اسے خدا کیا ہے

جگٹے کیسے عاشقوں کے ہیں اور معشوق کس کو کہتے ہیں  
حسن کے پھر یہ کیسے جلوے ہیں یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں  
عشوہ و غمزہ واد کیا ہے

ایک سے ایک نازیں کیوں ہے دام بردوش ہر حسیں کیوں ہے  
فکر صیدِ دلِ حزیں کیوں ہے شکن زلفِ عنبریں کیوں ہے  
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے

کس لئے پھول رنگ لاتے ہیں کیوں یہ لالے نے داغ کھائے ہیں  
کس نے یہ تازہ گل کھلائے ہیں بزمِ وگل کہاں سے آئے ہیں  
اب کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہیں محبت کے بھی نرالے بھید آہ نغمہ ہے اس میں نار نشید  
یاس کو مزدہ اور اجل کو نوید ہم کو ان سے وفا کی ہے امید  
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

دکھ کسی کو دیا تو کیا ہوگا تیرے حق میں بہت بُرا ہوگا  
بد نتیجہ بُرائی کا ہوگا ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا  
اور درویش کی صدا کیا ہے

کب یہ مکر اختیار کرتا ہوں      کب دعا بار بار کرتا ہوں  
 طرز دشمن سے عار کرتا ہوں      جان تم پر نثار کرتا ہوں  
 میں نہیں جانتا دعا کیا ہے  
 مثل مرزا ہے گود میں غالب      شعر کہتا ہے دل نشیں غالب  
 ہے مگر رند بالیقین غالب      میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب  
 مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

اے چارہ گرو تم انہیں سمجھا کے تو ہو آئے      اور ساتھ لے مرزدہ آمد بھی ہو گو آئے  
 اظہارِ تمنا سے مگر بات ہی کھو آئے      کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالب ہو لے  
 اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے  
 احسانِ اجل ہے جو ذرا بے مجھے ہلت      ہے اس کے نظارے کی تمنا دمِ رعلت  
 وہ دیکھ تو لے آنکھ سے اپنی مری حالت      ہوں کش مکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت  
 کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے دیکھنے کو آئے  
 اگر مرے گھر بھی وہی وحشت ہے وہی رم      آتے ہی اجازت کے تقاضے ہوئے بہیم  
 مشکل ہے قیام ایک جگہ کا انہیں ک دم      ہے ماعقہ و شعلہ و سیلاب کا عالم  
 آنا ہی سمجھ میں میری آتا نہیں گو آئے

تربت میں مری آکے نہ بھاگیں گے نیکرین  
 مردہ بھی مجھے پاک نہ بھاگیں گے نیکرین  
 پریش سے بھی اکٹا کے نہ بھاگیں گے نیکرین  
 ظاہر ہے کہ گھر کے نہ بھاگیں گے نیکرین  
 ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

ہیں تیغ بکف کون جو پھرتے ہیں اکڑتے  
 یہ کون ہیں جو وعظ میں دنیا ہی میں لڑتے  
 درپردہ کوئی اوہ ہے ہم کس سے بگڑتے  
 جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھکڑتے  
 ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

ہم ہوں تو ہر انسان ہیں طعنے نایافت  
 ہاں اہل طلب کون سنے طعنہ نایافت  
 ہم گم ہوئے اور ختم ہوئے طعنے نایافت  
 ہاں اہل طلب کون سنے طعنہ نایافت  
 دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

ہم وہ نہیں ناکامیوں کے نام سے بیٹھیں  
 اندیشہ مایوسی انجام سے بیٹھیں  
 رنج سفر و سختی احرام سے بیٹھیں  
 اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں  
 اس درپہ نہیں یار تو کہے ہی کو ہو آئے

اس شوخ کے لانے کی تو کرنے کے تدبیر  
 اور واں ترے رنے کی لگے کھینچنے تصور  
 ڈوبی ہوئی تقدیر سے الٹی ہوئی تاثیر  
 کی ہم نفسوں نے اثر گر یہ میں تقریر  
 اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

لے بادۂ دوشینہ سے مراد رات کی پی ہوئی شراب ہے اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں دوشینے بکریں  
 سوال و جواب کیلئے آئے ہیں۔ غالب صاحب غنی کے انداز میں فرماتے ہیں نیکرین کے سوال و جواب بچے کی ہی صورت  
 ہے کہ مرنے سے پہلے مجھے شراب پلا دو فرشتے قبر میں شراب کی بوتل بھاگ جائیں گے اور میں سوال و جواب کی رحمت سے  
 بچ جاؤں گا۔ (کیا خوب انداز بیان ہے)

اک لطف وہاں عید کا دن رات ہو غالب      کیا جلسہ یارانِ خوش اوقات ہو غالب  
 مہرِ آکے لئے وہ درِ حاجات ہو غالب      اس انجنِ ناز کی کیا بات ہے غالب  
 ہم بھی گئے وال اور تری تقدیر کی رو آئے

(۹۳)

جب سے رنگِ بہار طاری ہے      کچھ عجب کیفیت ہماری ہے  
 پھر لہو چشمِ تر سے جاری ہے      پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے

سینہ جو یائے زخمِ کاری ہے

پہلے بے کارِ محض تھا ناخن      اب مگر کام دے گیا ناخن  
 داغِ دل کی طرف بڑھا ناخن      پھر جگر کھودنے لگا ناخن

آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

پھر عبادت کا ہے نبیا انداز      اور ہی سمتِ رخ ہے وقتِ نماز  
 سن کے ناتقے کی دل ربا آواز      قبلہ مقصدِ نگاہِ نیاز

پھر وہی پردہِ عماری ہے

ہو کے گاہک بنے ہیں سودائی      دیدہ و دل کو کچھ نہ سدھائی  
 رہ گئی ان کی ساری دانائی      چشمِ دلالِ جنسِ رسوائی

دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے



مل کے دونوں نہ ہے یہ ٹھہرائی      ایک عالم بنے تماشا شائی  
 دونوں ذلت کے ہیں تمنائی      وہ ہی صدرنگ نالہ فرسائی  
 وہ ہی صد گونہ اشکباری ہے

تنگ ہوں ہجر جاں گزار سے پھر      عشق ہے اس قدر دراز سے پھر  
 مست ہوں چشم نیماز سے پھر      دل ہوا ہے نرا م ناز سے پھر  
 محترستان بے قراری ہے

حسن پھر ترک تاز کرتا ہے      پھر دیرِ فتنہ باز کرتا ہے  
 خونِ اہل نیاز کرتا ہے      جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے  
 روز بازارِ جاں سپاری ہے

لاکھ صدے نئے گزرتے ہیں      جان اس پر نثار کرتے ہیں  
 پھر دم اس پر دغا کا بھرتے ہیں      پھر اسی بے وفا پر مرتے ہیں  
 پھر وہی زندگی ہماری ہے

ق

اُسے ہیں داد خواہ اہل نیاز      ہیں جفا پیشہ گوشِ براواز  
 ظاہر اب ہوں گے حسنِ عشق کے راز      پھر کھلا ہے دیرِ عدالت ناز  
 گرم بازارِ فوجداری ہے

ہرز بردست ہو گیا ہے شیر      زیرِ دستوں کو کر رہا ہے زیر

عدل وانصاف میں نہ کیوں ہو دیر ہو رہا ہے جہان میں اندھیر

زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر کیا دل نے یوں بیاں احوال رو دیئے سُن کے حاکم و عمال

سرا جلاس پھر ہے قال و مقال پھر دیا پارہ جگر نے سوال

ایک فریاد و آہ وزاری ہے

ابھی ثابت نہیں جفا کا سبب نہ ابھی ہے ثبوتِ قہر و غضب

دیکھئے ہو معاملہ طے کب پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب

اشکباری کا حکم جاری ہے

عشق انصاف پر اگر آیا بال کی کھال ہی نکالے گا

دیکھئے اس کا ہو نتیجہ کیا دل و فرخاں کا جو مقدمہ تھا

آج پھر اس کی رو بکاری ہے

ہے یہ مرزا کو تو یقیں غالب ہوئے مغلوب تم کہیں غالب

مل گیا ہے کوئی حسین غالب بے خودی بے سبب نہیں غالب

کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے

کی مگرشی تو فرطِ ندامت سے نم ہوئے اپنی تعلیوں سے نخل دم بدم ہوئے

گھر گھر نشاط و عیش کا جوش و خروش ہے      بزمِ طرب کہیں ہے کہیں ناؤ نوش ہے  
اور یہاں و فورِ غم سے پرانندہ ہوش ہے      ظلمتِ کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے  
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

ہے چونکہ دردِ بحر میں دونوں کا ایک حال      ممکن نہیں کہ ایک سے ہو ایک کو ملال  
باہم نہیں ہے رشکِ حسد کا کوئی خیال      نے فردہ وصال نہ نظارہ جمال  
مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے

کم کر دیا ہے نشہ ساقی کا اجتناب      سر کا ہے آج رخ سے ذرا گوشہ نقاب  
دیدار سے ہے دیدہ مشتاق کامیاب      نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب  
اے شوق ہاں اجارتِ تسلیم ہوش ہے

اس کے گلے کا حار جو در نہیں ہوا      گویا صدف کا اختر قسمت چمک گیا  
اک رشک اور بھی ہے صدف کا تو ذکر کیا      گوہر کو عقد گردنِ خوباں میں دیکھنا  
کیا اوج پر ستارہ گوہر فروش ہے

اے غالب صاحبِ شاعر کو اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: "اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے" یہ خبر ہے پہلا مصرعہ "ظلمتِ کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے" یہ مبتدا ہے۔ شبِ غم کا جوش یعنی اندھیرا کی اندھیرا ظلمت غلیظ۔ گھر نہ پیدا گویا خلق ہی نہیں ہوئی۔ ہاں ایک دلیلِ سحر جو در ہے یعنی بھی ہوئی شمع۔ اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو کچھ جایا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیلِ سحر لکھا گیا ہے وہ خود ایک سببِ بختِ اسبابِ تاریکی کے پس دیکھا جائے جس گھر میں علامتِ صبح مؤیدِ ظلمت ہوگی وہ گھر کتنا تاریک ہوگا۔

ہے شکر کی جگہ کہ نہیں ہم وہ ہے پرست      دو گھونٹ میں جنہیں نہ ہے ہوش پاؤ دست  
اچھا کیا تمہارے تصور نے نذر و بست      دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست  
بزم خیال میکدہ بے خروش ہے

ق

کرتی تھی مجھ کو قلتِ یم یا تو مضمحل      یا اب خیال بادہ کشتی بھی ہے جاں گسل  
کردار سے ہوں اپنی پشیمان و منفعل      اسے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل  
زہنہار اگر تمہیں ہوس ناؤ و نوش ہے  
بکھو کچھ آپ اپنے اگر خیر خواہ ہو      سنبھلو ذرا جو طالبِ امن و پناہ ہو  
تم بھی کہیں نہ میری طرح سے تباہ ہو      دیکھو مجھے جو دیدہٴ عبرت نگاہ ہو  
میری سنبو جو گوشِ حقیقتِ نیوش ہے

اس بزم میں نہ پاؤ گے کچھ غیر گم رہی      جاتی رہے گی عقل سراسر رہی سہی  
مجھ پر گزر چکی ہے جو میں نے تمہیں کہی      ساقی بجلوۂ دشمنِ ایمان و آگہی  
مطب پر نغمہ رہن تمکین و ہوش ہے

کہتے ہیں جس کو اہل جہاں محفلِ نشاط      اک خوابِ خوش سے بڑھکے نہیں بساط  
رونق کو اس کی لحظہ بہ لحظہ انحطاط      یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گونہ بساط  
دامانِ باغبان و کفنِ گل فروش ہے

چاروں طرف نشاطِ جمائے ہوئے رنگ      بجتا ہے شورِ قلقلِ مینا سے جل ترنگ

ہے دل میں اہل بزم کے اک جوش و رنگ      لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ  
 یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے  
 ہے انبساط و عیش کا منظر تو بزم میں      پیدا ہے لطفِ گردش ساغر تو بزم میں  
 کچھ زلیست کا مزہ ہے میسر تو بزم میں      یا صبح دم جو دیکھے آکر تو بزم میں  
 نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے  
 حالت ہی اور کچھ نظر آتی ہے بزم کی      رونق ہی اس جگہ کبھی گویا ہوئی نہ تھی  
 محفل جو تھی بھری ہوئی سنسان ہو گئی      داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی  
 اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خاموش ہے  
 مرزا نے کی نہ کوئی کمی عرضِ حال میں      تا ہو نہ مستان کوئی نے کے وبال میں  
 اک درد ہے بھرا ہوا اسکے مقال میں      آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں  
 غالب صربِ خامہ نوائے سروش ہے

گر نہیں ان کو یقین چاہ کا میری نہ بھی      جاں لیکر بھی اگر قدر نہ کچھ کی نہ بھی  
 وہ یہ کہتے ہیں جان نہیں ہی نہ بھی      نہ ہوئی گروے مرنے سے تسلی نہ بھی  
 امثال اور بھی باقی ہے تو یہ بھی نہ بھی  
 میرے حلقے میں نہیں گل نہ بھی خار تو ہے      دل میں اک صورتِ یادِ گل و گلزار تو ہے

گو مسرت سے ہوں محروم غم یار تو ہے      خار خارِ اہم حسرت دیدار تو ہے  
شوق گل چین گلستانِ تسلی نہ سہی

کیا کوئی فرض ہے ہر روز اسے اے ہی بنے      اپنے ہاتھوں سے ہیں جامِ پلائے ہی بنے  
یہ نہیں ہے نہ ہوئے آج اڑائے ہی بنے      مے پرستاںِ خم مے منہ سے لگائے ہی بنے  
ایک دن گرنے ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

بے دیوانے کی گواہی نہ کی قدر تو کیا      جوشِ وحشت لے دیا اس کا ستارہ چکا  
بہی آنکھوں کا بیاباں نے بنایا تارا      نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا  
گر نہیں شمعِ سیدہ خانہ بلی نہ سہی

رکتے ہیں مجھے احبابِ فضاں کو تاقی      ہر گھڑی جب مجھے گھوٹیں تو نہ کیونکر ہو قلق  
زِ عشرت ہی نہیں باعثِ ولقِ مطلق      ایک ہنگامہ پر موقوف ہے گھر کی رونق  
نود غم ہی سہی نغمہ شادی نہ سہی

بہ سقل پہ حاسد کے پڑا ہے پردا      کر دیا ہے مرضِ رشکِ حسد نے اندھا  
لبا پنا اسے سمجھاؤں بھی تو حاصل کیا      نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا  
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

مے مرزا جو کہیں اس کو نصیحت سمجھو      ہیں جو ہمدرد تو یہ ان کی عنایت سمجھو  
ما جو آئی ہے بہتر یہی حالت سمجھو      فرصتِ صحبتِ خواباں ہی غنیمت سمجھو  
نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبعی نہ سہی

کبھی کیا تھا نہ ظالم نے اس طرح کرم آگے      ہمارے سائے سے پہلے تو کرتا تھا وہ آگے  
 نہ کی تھی تیغ سرِ قتل نگاہ یوں علم آگے      عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے  
 کہ اپنے سایہ سے سراپاؤں سے دو قدم آگے  
 مرے ہی جسے میراے زینے کے غم و کلفت      مرے ہی واسطے بیدار ہوئے ہیں ماتم و حسرت  
 خرابیوں سے زینے کی ہے کہاں مجھے فرصت      قضا نے تمہارے چاہا خراب بادہ الفت  
 فقط خراب نکھا بس نہ چل سکا قلم آگے  
 ہمارے دل کی مٹادی غم و فراق نے ہستی      بسی بسائی ہوئی حسرتوں کی اجڑی ہے بستی  
 کچھ اب تو ہمت طاقت میں قہر کی ہوئی بستی      غم رمانہ نے جھاڑی نشاطِ عیش کی مستی  
 مگر نہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے  
 بتائیں کیا کہ تمہا ہمارے دل کی ہر اب کیا      لگی ہے دھن کہ نہیں خود جواب کچھ نہ کچھ اسکا  
 دیا ہے نامہ مگر دل کا ہے کچھ اور ہی سودا      خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا  
 کہ اس کے در پر پہنچتے ہیں نامہ برس ہم آگے  
 تمہارے چھوٹے سے سرخے میل گئے ہیں بلا کے      تمہارے پھندے میں کیے نہ جیتے جی کبھی چھوٹے  
 ہمارے دل ہی کچھ اٹھا ہوا تھا کیا کہیں ہم سے      یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے  
 تمہارے آنسو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

بہت دنوں تو ہم اکی مرکہ بہت ہے دلچے ہم اشکِ غم بہاؤں کہ قصہ ہی کہیں ہوٹ  
 اب اپنی ہستی کا عقدہ کھلا کر یہ ہے کیا شے دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موہِ نوں ہے  
 ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے  
 وہ اشکِ ماتم مریاں کب بہاتے ہیں غالب غصہ سے مرنے کی میسے خوشی مٹاتے ہیں غالب  
 ملنے خاک میں مجھ کو کہاں وہ آتھی غالب قسم جنازہ پر آنے کی میسے کھاتے ہیں غالب  
 ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

آہ کرنے سے غصہ بے اس کا سوا ہوتا ہے نالہ کرتا ہوں تو سرگرم جفا ہوتا ہے  
 لب ہلانا سببِ ترک و فنا ہوتا ہے شکوے کے نام سے بے فہر خفا ہوتا ہے  
 یہ بھی مت کہہ کہ جو کہئے تو رگلا ہوتا ہے  
 تنگ ہوں کب تک اٹھایا کروں میں جو جفا کونسا ظلم ہے جو آپ نے مجھ پر نہ کیا  
 بے سبب تو نہیں شکوے کا مئے تار بندھا پرہوں میں شکوے سے یوں راگ کر جیسے بلجا  
 اک ذرا چھوڑئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے  
 دل غم دوست کی ہے عین تمنا یہ تو ہم جوشاکی ہوں تو وہ اور ستائے ہم کو  
 کاش آگاہ وہ اسرار شکایت سے نہ ہو گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو  
 شکوہ جو رسے سرگرم جفا ہوتا ہے



کردیا روز کی گردش نے اسے خستہ حال      پاؤں بھی اٹھاتا تھا نہ ہے اسے سخت محال  
ہو گیا خلق کو اندازہ رفتارِ محال      عشق کی راہ میں ہر چرخِ ملکوب کی کچھ چال  
سست روی سے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

ہم یہاں تک تو ہوئے تو گر بیدار و رستم      دیر ہوتی ہے جفاؤں میں تو ہوتا ہے الم  
دل کو ہے تازہ جراحات کی خواہش بہیم      کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیلہ دکہ ہم  
آپ اٹھ لاتے ہیں گریزِ خطا ہوتا ہے

نعتِ برگشتہ نے لینے ہی نہ دی ہم کو پناہ      رکھتے اے کاش نہ ہم اپنی بھلائی پر نگاہ  
کام سب سوئے تدبیر سے ہوئے اپنے تباہ      خوب تھا پہلے ہی سے ہوتے ہم اپنے بدخواہ  
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

دوسے شکوہ نہیں کرتے ہیں کہ ہے تکرارِ دب      ناتوانی کی ہے آخر کوئی حد بھی یارب  
زارِ نالی گئی ہے رشوارِ دم رنج و تعب      نالہ جاتا تھا پرے عیشِ بریں سے اور اب  
لب تک آنا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

طبعِ قدرت نے مجھے دی ہر عجبِ دو فن      میں جو چاہوں ہر قرطاس کھلا دوں گلشن  
راگِ لاسکتا ہے کیا مجھ سے کوئی مرغِ چمن      خام میرا کہ وہ ہے بارِ بد بزمِ سخن  
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

ذات کو تیری کیا حق نے پناہ عالم      تیرا سایہ ہر مخلوق پر ہے ابرِ کرم  
اہل دنیا کو ترسِ فیض سے ہے عیشِ بہیم      اور شہنشاہِ کواکب سپہ و مہرِ علم

تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے  
 محض افسانہ ہیں شاہانِ سلف کے قصے  
 پہنچ ہیں شوکت و اقبال میں تیرے آگے  
 کچھ ٹھکانا ہے بھلا جاہ و شتم کا تیرے  
 سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے  
 تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے  
 گردِ پھرتے ترے دنگے فلک کا ہے یہ حال  
 ذرہ ذرہ ترے دروائے کا خورشیدِ مثال  
 ماہِ کامل کو جبیں سائی میں حاصل ہو کمال  
 ہر جہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال  
 آستانِ پر ترے مناصب سا ہوتا ہے  
 بند میں مرغِ چین مجھ سے خوش الحانی میں  
 کچھ نہ کچھ نغمہ سراہوں جو پریشانی میں  
 ہے ترا لطفِ مدِ طبع کی جولانی میں  
 میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزلِ خوانی میں  
 یہ بھی تیرا ہی کرمِ ذوقِ فرا ہوتا ہے  
 کہنے کیا چرخِ ستمِ کار کو ہی نا انصاف  
 ذکر کیا غیر کا اپنے بھی مہر کے خلاف  
 کوئی ہمدرد نہیں قاف سے لیکر تاقاف  
 رکھیں غالب مجھے اس تلخِ نوائی میں معاف  
 آج کچھ دردِ دل میں سوا ہوتا ہے

بلائے دہرے بے ہاکیوں کی خو کیا ہے  
 تمھارے سامنے انسان کی آبرو کیا ہے  
 کلامِ ہتک یہ دشمن کے رو برو کیا ہے  
 ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے  
 تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے  
 لے حاشیہ مشہور

نگاہ گرم سے ظالم نے بس کو دیکھ لیا      جلا کر اس کو کیا خاک دم میں سہتا پا  
کمال یہ ہے کہ کرتا ہے آگ سے ٹھنڈا      نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برقی میں یہ ادا  
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تندرختو کیا ہے

برآیوں کے ہماری سبق ہزار و دے      یقین ہے کہ نہ فقر وں میں آؤ گے اس کے  
خیال اس کا نہیں ہے کہتے وہ جو چاہے      یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے  
وگر نہ خوف بداموزی عدو کیا ہے

نہ دے گا کام رفوگر یہاں نہ کچھ فن      اٹھائے طاق میں رکھ اپنے رشتہ و سوزن  
سرکش جسم کے تاروں سے سن چکا دامن      چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیرا ہن  
ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

رہا نہ تن ہی تو دل کا کہاں پتا ہوگا      یقین ہے جسم سے پہلے ہی مٹ چکا ہوگا  
سوائے خاک یہاں دستیاب کیا ہوگا      جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا  
کر دیتے ہو جواب راگہ جستجو کیا ہے

حاشیہ ص ۱۸۰: غزل تہرے غالب صاحب کی انھوں نے غزل بھی لکھ کر تہر کو لکھا "اگر تم فقیر ہے یہاں اور اس غزل کا  
طالب کا ذوق بڑا ہے تو یہ غزل اس خط سے پہلے ہی ہوگی۔ نیز یہ غزل شیونرائن آراء کو بھیج کر فرمایا۔  
یہ تمہارا اقبال ہے کہ کو شعر یاد آئے ایک غزل یہ اور دو غزلیں وہ تو بجا جاتی ہیں تیس ہفتہ کا گودام تمہارے  
پاس درام ہو گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شعی سونرائن لیے ہفتہ وار اخبار میں غالب صاحب کا کلام شائع کرتے تھے۔  
کہا جاتے کہ کیرن ذوق پائی میں چاہے تھے کہ غالب کی نظران پر بڑی توجہ دوںوں میں بمعزل نہ چھٹک گئی  
ابتر غالب کی الہ میر یہ مصرع بڑھا ذوق سے سن لیا اور بادشاہ طفرے تکایت کی۔ غالب جب دربار میں گئے بادشاہ  
نے پوچھا کہ آج آپ نے کونسی غزل کہی ہے۔ غالب صلیب پر پوری غزل سنائی اور قطع کا یہ مصرع بدل دیا۔ ہولہ الخ

غلط کر رہتا ہے جویاے خنجرِ قاتل کہیں گے ہم تو کہے اس کی ڈر لا حاصل  
 ہے ہیں شک میں گھل گھل کے کیا بھگر کیا دل رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قاتل  
 جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

جیسے تو فرقہ زہاد کو ہے اس کی تمیز کہ کس کو کہتے ہیں علماں حوئے کیا چیز  
 ہمیں غرض نہیں کوئی غلام ہو کہ کینز وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز  
 سوائے بادۂ گلاب و مشکبو کیا ہے

چڑھا کے سانگو مینا کے نہ ہوں ہر شمار سب کو بھی منہ سے لگا کر نہ سیر ہوں زہار  
 یقین کیجئے میں نام کا نہیں ے خوار بیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار  
 یہ شیشہ و قدر و کوزہ و سبو کیا ہے

ہمارے حال پران کو کہیں نظر ہو بھی اور التفات مریض فراق پر ہو بھی  
 نتیجہ خاک نہ ہو گا اگر خبر ہو بھی رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی  
 تو کس امید پر کیئے کہ آرزو کیا ہے

عروجِ طالعِ غالب اگر اسے بھاتا حسد کی آگ میں حاسد نہ یوں بھنکا جاتا  
 نہ پھر یہ شعروہ مرزا زبان پر لاتا ہوا ہے شہ کا مصاحب پھر کہے اتراتا  
 وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے



تابِ الم اب مجھے زہار نہیں ہے      قابو میں مرے دل افکار نہیں ہے  
 آہِ ذرا دل پر اختیار نہیں ہے      آکر مری جان کو قرار نہیں ہے  
 طاقتِ بیدارِ انتظار نہیں ہے

دل کو تو قابو میں اپنے لے لیا پہلا      کرتے ہیں فرمائشِ جانِ جانِ ہم سے  
 لطفِ طے گا بھلا کب عیش سے اسکے      دیتے ہیں جنتِ حیاتِ دہر کے بیلے  
 نشہ بہ اندازہٴ خمسار نہیں ہے

چھائی ہے کچھ اس طرح کی بیکسی اب تو      رونا ہوں ہمارا ہے کوئی نہ ہے دل جو  
 شکوہِ رقیبوں کا کیا کیا تیرا گلہ ہو      گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو  
 ہائے کہ روستے پہ اختیار نہیں ہے

وہ بھی تو چاہیے کچھ رنج کی آضر      کونسی شے میں ہے پایا عاجز و قاصر  
 چاہو جو تم جان بھی کر سکتے ہیں حاضر      ہم سے عبت ہے گمانِ رنجشِ خاطر  
 خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

غفلتِ دل سے بھلا کیا پائے معافی      آئیں ہی فحش ہے سب یلے معافی  
 اس کو سمجھ منزل و ماوا سے معافی      دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معافی  
 غیرِ گل آئینہ بہار نہیں ہے

اس پہ کئے میں نے برسوں تک تقاضے      سن کے ہمیشہ مگر کچھ ٹالا ہی اس نے  
 طالع خفتہ مرے اب کچھ تو ہیں جاگے      قتل کا میرے عہد تو کیا ہے بارے  
 وائے اگر عہد استوار نہیں ہے  
 تو نے یہ کیا زہد کی ٹھہرائی ہے غالب      چال یہ مرزا نے تری پائی ہے غالب  
 جام و سبو کا تو تو سودائی ہے غالب      تو نے قسم نے کشی کی کھائی ہے غالب  
 تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

(۱۰۱)

زمانے بھر کے رنج و غم ہیں اور تنہا ملول ہے      تھل مجھ سے اس کوہ گراں کا سخت مشکل ہے  
 بڑھاپے بوجھ اتنا سوئے زانو سر بھی مال ہے      بھوم غم سے یاں تک بزرگوں کی مجھ کو حاصل ہے  
 کہ تابو امن و تازہ نظریں فرق مشکل ہے  
 بچے لے چارہ گرد نظر راحت نہیں تن کی      مرے لوں تو اگر کاٹے رگیں بھی میری گزین کی  
 سیئے جائز خم دل پر آئے کر کچھ طعن دشمن کی      رفوئے زخم سے مطلب لذت زخم نہون کی  
 سمجھو موت کہ پاس روستے دیوانہ غافل ہے  
 گلستاں میں اگر وہ ولیق افزائی کئے غالب      تو نور اساعطائے گس کو بینائی کئے غالب  
 عجبت بولے خوش مرزا کو سودائی کئے غالب      وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کئے غالب  
 چنگنا غنچہ گل کا صدائے خندہ دل ہے

جس روز کہ تو میر کو گلزار میں آوے      گل تازہ کھلے نکلت گلی خار میں آوے  
بالیدگی سوکھے ہوئے اشجار میں آوے      جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے

ہاں کالبدر صورتِ دیوار میں آوے  
گل گشت میں پیدا ہو عجب لطف کا منظر      لے بڑھکے بلائیں تری ہر شاخ گل تر  
گل تیرے قدم لینے کو ہوش زہیں پر      سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر  
تو اس قدر دل کش سے جو گلزار میں آوے

مانا کہ غم و ہم سے دل زار گھلا ہے      بر سادیے شرکاں نے خود ریا بھی تو کیا ہے  
آنکھیں بھی لہو روئیں تو کیا فخر ہوا ہے      تب ناز گرا نما نگئی اشک بجا ہے  
جب نحتِ جگر دیدہ خونبار میں آوے

ہر چند ہوا جوش فرو مجھ کو ستا کر      کچھ دل کو ہوئی راحت و تسکین بھی دم بھر  
وہ بات بھی کر جس سے ملے لطف مکر      ملے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ تم گر  
کچھ مجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اعجاز کا رنگ اپنے بخود کھلائے اشارہ      بے جان کو جاندار بنا جائے اشارہ  
جادو سے غضب بیکھے کیا ڈھائے اشارہ      اس چشمِ فسون گر کا اگر پائے اشارہ  
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

مصرف دعاؤں میں ہیں کس سے یارب      تا برہنہ پاگزیرے کوئی پاس سے یارب  
 تکتے ہیں پڑے راہ عجب یاس سے یارب      کانٹوں کی زباں سو گھگھی پیاس سے یارب  
 اک آبلہ پا وادی پر خار میں آوے

آیا مرے آغوش میں کب وہ تن نازک      کس دن ہو راحت کا سبب وہ تن نازک  
 پھنڈے میں ہو یوں غیر کے اب تن نازک      مراؤں نہ کیوں رشک سے جب تن نازک  
 آغوشِ غم حلقہ زنا میں آوے

پھیلائے ہوئے دستِ طلب ہیں سلسلہ سر      دیکھا ہے زمانے میں انہیں خوار ہی اکثر  
 انساں کیلئے حرص ہی دشمن ہے قوی تر      غارت گیر ناموس نہ ہو گھر ہو سر زار  
 کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

مانا کہ جنوں کپے تجھے جوش فراواں      باقی ترے ہاتھوں سے رہی جنبہ اماں  
 یوں ٹکڑے اڑانا تو نہیں ہے تجھے شایاں      تب چاک گریہاں کا مہر ہے لہ ناداں  
 جب اک نفس الجھا ہوا ہزار میں آوے

کیا حال نہ سوزد روں کہیں زباں سے      لگ جائے کہیں آگ نہ گرمی کے بیاں سے  
 بہتر ہو کہ نہاں ہی رہے اہل جہاں سے      آتش کدہ ہے سینہ مرا زہ نہاں سے  
 اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

مرزا کی طرح سحر کی قسم اس کو سمجھئے      مغمضوں ہے اگر رُوح تو جسم اس کو سمجھئے  
 افسوں سے ٹھہرائے ام اس کو سمجھئے      گنہینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے  
 جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے



ماند ہے نجم سحر یار کا خال اچھا ہے اس کے ابرو سے نہ بخیر نہ ہلال اچھا ہے  
 ہر کچھ ہے نو ذرا قبل زوال اچھا ہے حسن مگر چہ بہنگام کمال اچھا ہے  
 اس سے میرا مرہ خورشید جمال اچھا ہے

مفت کے مال کے اس رجب ہیں خواہاں کیا وہ اسی دلو اسی گھات ہیں ہیں شام و بگاہ  
 چاہتے ہیں کہ رقم کوئی ملے خاطر خواہ بوسہ دیتے نہیں وردل پہ ہے ہرقت نگاہ  
 جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

کب بیکر ہوا جیشید کو یہیمانہ نیا دور میں تادم آخرو ہی اک جام رہا  
 دل سے اترا جو یہاں دور کیا پھینک دیا اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا  
 ساغرِ غم سے مرا جام سفال اچھا ہے

کر دیا ہے غم، بجزاں نے مرا سبز شوق نام ہی نام برب جان کا باقی ہے رفق  
 رنگ رہتا ہے مرا یوں تو غم و درد سے فراق انکے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر و فراق  
 وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

انکے ہاتھوں سے کسی کو بھی نہیں پہنچا فیض دین و ایمان کے یہ دشمن ہیں تو کچھ پر فیض  
 بندگی کیسے بھی دیکھا تو نہ پایا با فیض دیکھنے پاتے ہیں عشاق بتو سچ کیا فیض  
 اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

فن ہے وہ چیز کہ فرہاد کی دی بات بنا      ورنہ شیریں سے کہے بات یہ اسکا منتھا  
جس ہنریں تھی اسے مشق وہ کام آہی گیا      ہم سخن پیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا  
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

وصل محبوب اے کاش ہمارا ہو جائے      دور جلدی کہیں یہ پڑہ دوی کا ہو جائے  
جزو ہو وصل کل ایک ہی نقشہ ہو جائے      قطرہ دریا میں جوں جائے تو دیا ہو جائے  
کام اچھا ہے وہ جس کا کمال اچھا ہے

کس کے دروازے سے جو چاہے گدا ملتا ہے      اور جو ملتا ہے تو باچون و چرا ملتا ہے  
در بدر بھیگ اگر مانگے کیا ملتا ہے      بے طلبے یں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے  
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

تا ابد اس کو خدا رکھے سراسر سربسز      اس جہن میں ہے یہ رشک منور سربسز  
ہو سدا اس کا چمن زار مقدر سربسز      خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سربسز  
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

کٹ لے ہیں اسی امید میں مزا کے بھیجی ن      صرف اسی آس رہے ہیں دل مضطرب ساکن  
یہ تصور جو نہ ہو کب ہے تسلی ممکن !      ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن  
دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ہم ہیں شاکی ساقی گلفام کے      اہلِ مخمل ہوں مُحق انعام کے  
حوصلے پورے ہوں خاص و عام کے      غیرِ لبِ مخمل میں بوسے جام کے

ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

ظلم سے خالی ہے کوئی کِر نہ مر      درپے ایذا ہیں اہلِ شہر و درہ  
تم سے کیوں پڑتی مرے دل میں گرہ      خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ

ہستکنڈے ہیں چسرخ نیلی فام کے

دل میں اس ناوک فگن کے ہے گرہ      یہ کمان اپنی کئے رہتا ہے زہ  
تاک میں سب کی ہے کہ ہو یا کہ مر      خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ

ہستکنڈے ہیں چسرخ نیلی فام ہے

تم جوابِ خط ہمیں دو یا نہ دو      ہم کو حاصل ہے غرض ہے دل کی جو  
اس بہانے نام لکھا جائے تو      خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

جوشِ مستی میں کیا طوفِ حرم      خستِ خم پر کی ادا رسمِ سلم  
زہد میں رندی سے بھی چو کے نہ ہم      راتِ پی زمزم پرے اور صبح دم

دھوئے دھتے جامہٴ احرام کے

تھی بلا اپنے لئے اپنی نظر ہتکنڈوں کی اس کے تھی کس کو خبر  
 اپنے ہاتھوں خود میں پہنچا ضرر دل کو آنکھوں نے پھنسا یا کیا مگر  
 یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

ہو چکا ظاہر دعاؤں کا اثر سب تھے مصروف دعا شام و سحر  
 شاد پھرتے ہیں طبیب اور چارہ گر شاہ کے ہے غسل صحت کی خبر  
 دیکھئے کب دن پھریں حمام کے

پوچھ لومڑی سے اپنا مشغلا شغل ہو سکتا ہے کیا بے کار کا  
 روگ ہی کچھ دل کو بیڑھ بگ گیا عشق نے غالب نکما کر دیا  
 ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

سے مرزا قلعہ کو لکھا ہے ”بھائی محمد میں اب کچھ باقی نہیں ہے۔ برسات کی معیبت گزر گئی لیکن بڑھا پے کی  
 شرت بڑھ گئی تمام دن پڑا رہتا ہوں بیڑھ نہیں سکتا ج ضعف نے غالب نکما کر دیا۔“

اسی طرح دہلی سوسائٹی کے جلسے میں اپنا ایک مضمون پڑھا۔ فرماتے ہیں: ”لوڑھا ہوں ناتواں ہوں  
 راج اُپر چھوئے تو نیم جاں ہوں“ ضعف نے غالب نکما کر دیا۔ ”ربا ص الدین امجد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں  
 نے یہ شعر ان کے سامنے پڑھا ”عشق نے غالب نکما کر دیا“ تو فرمایا ”بھائی چپ رہو۔ یوں کہو ضعف نے  
 غالب نکما کر دیا۔ یاد ہرنے غالب نکما کر دیا۔ عشق کیسا عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا۔“

مولوی احمد حسن قنوجی کو لکھا ”میر درویش گوشت خین تمہارا دوست اور تمہارا دعا گو ہے ام عشق  
 نے غالب..... ہینسٹ برس کی عمر ہوئی۔ اضمحلال قوی، ضعف دماغ، فکر مرگ، غم عینی جو مجھے  
 آپ دیکھ گئے ہیں میں اب وہ نہیں ہوں۔“



ہر شجر نے نئی قبا پائی      بوئے گل کو صبا اڑا لائی  
گلِ نرگس نے پائی رعنائی      پھر اس انداز سے بہار آئی  
کہ ہوئے ہر وہ تماشا ئی

ہے صفائی سمک سے تار سماک      نظر آتے نہیں خس و فاشاک  
ہر چمن ہے غبار و گرد سے پاک      دیکھو اے ساکنانِ خطہ خاک  
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

اوس کی ہے بہار سبزے پر      گل چمکتے ہیں صورتِ اختر  
کہتے بے ساختہ نہ پھر کیوں کر      کہ زمیں ہو گئی ہے سترِ اسر  
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

ابرِ باران سے آبِ باری کی      قوتِ نامیہ کو حرکت دی  
نظر آتی ہے شاخ شاخ ہری      سبز کو جب کہیں جگہ نہ ملی  
ہو گیا روئے آب پر کائی

سبز مخمل بچھائی سبزے نے      کھل کھلاتے ہیں ہر طرف غنچے  
پھول کئی شاخ شاخ پر بھولے      سبزۂ وگل کے دیکھنے کے لئے  
چشمِ نرگس ہوئی تماشا ئی

بزمِ عالم ہے مے کدے کی نظیر      جھوم کر چھا گیا ہے ابرِ مطہر  
مست پھرتے ہیں سب صغیر و کبیر      ہے ہوا میں شراب کی تاثیر  
بادہ نوشی ہے بادِ پیمائی

شاد مرزا ہے ہر گھڑی غالب      کہ دعا کارگر ہوئی غالب  
عام ہے عیش و خرمی غالب      کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب  
شاہِ دیندار نے شفا پائی

نہ چلی سحرِ بیانی میری      ہیچ نکلی ہم سے دانی میری  
بھول کر بات نہ مانی میری      کب وہ سنتا ہے کہانی میری  
اور پھر وہ بھی زبانی میری

دردِ دل اے ستم انگیز نہ پوچھ      حالِ چشمِ غضب آمیز نہ پوچھ  
زخمِ نوکِ مژدہ تیز نہ پوچھ      غلشِ غمرہٴ خونریز نہ پوچھ  
دیکھ خوں نابرقتانی میری

مجھ کو اپنا ہی نہیں ہائے خیال      دوستوں تک تو کہاں جائے خیال  
کس طرح ان کا مجھ اے خیال      ہوں زِ خود رفتہ بمبیدائے خیال  
بھول جانا ہے نشانی میری

ہے حریف اپنا بھی کتنا بودا مجھ کو جس بزم میں پایا نہ جا  
میری ہر بات میں ضد ہے گویا مشتابل ہے مقابل میرا  
رک گیا دیکھ روانی میری

جبکہ نظروں میں سبک ٹھہرا ہوں کیوں ترسول پگراں اتنا ہوں  
کیا حقیقت ہے مری میں کیا ہوں قدرِ سنگ سرِ رہ رکھتا ہوں  
سخت اریاں ہے گرانی میری

کیوں نہ بے سارنتہ چکر کھاؤں گردشِ دہر سے ہے حالِ زبوں  
غیر ممکن ہے کہ ٹھہروں دم لوں رگِ دبا درہ بے تاب ہوں  
مصرِ شوق ہے بانی میری

موثر گافی کا مجھے دعویٰ تھا عقدہٴ موئے کمر ہی نہ کھلا  
تھا غلط زعمِ ہمہ دانی کا دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا  
کھل گئی پہنچِ مدانی میری

خط جو لکھتا ہوں تو خاص طور مار بات کرتا ہوں تو دیوانہ وار  
کیا مجھے یاد کریں گے غمِ خوار کیا بیاں کر کے مرا رویں گے یار  
مگر آشفتمہ بیانی میری

اے عبدالرزاق شاکر کے ایک خط میں تشریح کی ہے "تقابل و تضاد کو کون دہانے کا نور و ظلمت شادی و غم واحد  
رجح و وجود و عدم لفظ مقابل اس معنی میں مراد ہے جیسے حریف کہ معنی دوست بھی مستعمل ہے غم و شغور  
ہم اور دوست اور دشمن کے خلاف و عادت ضد ہرگز نہیں وہ میری طبع کی روانی کو دیکھ کر رک گیا۔"

مثل مرزا ہوئی طاقت غائب      قلب قابلوں نہ بس میں قالب  
 خاک ہوں زلیست کا اپنی طالب      کر دیا ضعف نے عاجز غالب  
 ننگ پیری ہے جوانی میری

رگ رگ ہے مری نشترِ فساد کی بھوکی      ہو جلد رواں تیغ یہ حسرت ہے گلو کی  
 راحت ہے جراحِ کوروانی کڑھو کی      جس زخم کی ہو سکتی ہو تند بیرِ فرو کی  
 لکھد بھو یارب اسے قسمت میں عدو کی  
 وہ دن گئے تھیں خون کربا پنی گیس پُر      اور آنکھ سے تھانوں کے اشکوں کا قطر  
 خونِ جگر و دل تو ہوا رزقِ نقشر      اچھا ہے ہر انگشتِ حسائی کا تصور  
 دل میں نظر آتی تو ہے اک بوندِ لہو کی  
 ناحق ہے قیامت کا تھیں خوف ابھی سے      کچھ ظلم بھی کرتے ہو تو سہمے ہوئے جی سے  
 کرنے دو اگر کرتے ہیں شکوہ یہ کسی سے      کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے  
 یاں تو کوئی سنتا نہیں فریادِ کسو کی  
 جب نہ کیا ہو ترے تیروں نے ادھر کو      کاٹا نہ ہو شمشیر نے سودا بھرے سر کو  
 کیا لطف ملے زلیست کا پھر ایسے بشر کو      دشمن نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو  
 خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی



مرزا غم دنیا سے رہا موت کا طالب      چاہا کہ کرے ترک کہیں جان یہ قالب  
حاصل ہوا مطلوب نہ برائے مطالب      صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب  
حسرت میں رہے ایک بتِ عربہ جو کی

(۱۰۸)

حسن ہی کا دل کو سودا چاہیے      اشتیاقِ روئے زیبا چاہیے  
رات دن شوقِ تمنا چاہیے      چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے  
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے  
نشم ہوتا ہے کب ان کو اس قدر      کچھ نہ ساقی کے سوا اے نظر  
لاکھ یہ پیتے رہیں آٹھوں پہر      صحبتِ زنداں سے واجبِ حذر  
جائے اپنے کو کیسینا چاہیے  
پاکے ٹرہ پاد کا دل ہے خجل      ہو گیا ہے درد و غم سے مضحل  
اب تو یہ سہ اور دردِ جاں گسل      چاہئے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل  
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے  
مجرموں نے پردہ ہے دیوانگی      یہ تنہا فراور یہ ہم خانگی  
ہم سے چھپنا ہے کوئی فرزانگی      دوستی کا پردہ ہے بے گانگی  
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

موت کا پاتا ہوں جو یا غیر کو      رشک نے میرے ڈبویا غیر کو  
رات دن کا غم ہے گویا غیر کو      دشمنی نے میسری کھویا غیر کو  
کس قدر دشمن ہو دیکھا چاہیے

پند میں نا صبح نے بھی کر لی ہے سعی      قید سے یاروں نے کیا کم کی ہے سعی  
بار بار ہم نے بھی کر دیکھی ہے سعی      اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی  
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

کب ہے مایوسوں کو امید نوید      گوش زد ہوان کے کیونکر یہ نشید  
کچھ نہ پوچھو حسرتوں کا اپنی بھید      منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید  
نا امید ی اس کی دیکھا چاہیے

پیرزن نادم نقی اپنے قصہ سے      منہ تنہا کیا اس کا کروہ یوسف کو لے

۱۔ غالب صاحب نے منشی بی بخش حقیر کو ۱۸ جنوری ۱۸۵۷ء کے خط میں لکھا: ”کیا کروں، مفت غمزہ اور  
ملول رہتا ہوں۔ مجھ کو اب اس شہر کی اقامت ناگوار ہے اور موانع و عوائق ایسے فراہم ہوئے ہیں کہ نکل نہیں سکتا  
خلاصہ میرے رخ و الم کا یہ ہے کہ میں صرف مرنے کی توقع پر جینا ہوں۔“

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید      نا امید ی اس کی دیکھا چاہیے  
یہ شعر مرزا یوسف کو بھی ایک خط میں لکھا ہے علاوہ انہیں چودھری عبدالغفور کے خط میں ضاع الم مارہروی  
کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے ”حضرت پرچ تو یوں ہے کٹم ہائے روز گار نے مجھ کو گھبرایا ہے مانس نہیں لے سکتا  
اٹانگ کر نیلے ہر باب سوطر سے خیال میں آئی پرل نے کسی طرح تسلی نہ پائی۔ اب باتیں سوچتا ہوں ایک تیر کہ  
تب تک جیتا ہوں یوں ہی رویا کروں گا دوسری یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مرنے لگا یہ صغریٰ و کبریٰ دل نشیں ہونے چو اسکا  
سکھیں ہے، یہ بہات۔“ منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید: نا امید ی اس کی دیکھا چاہیے۔“

آ رہی تھی یہ صدائے غیب اسے      غافل ان مرہ طلعوں کے واسطے  
 چاہنے والا بھی اچھا چاہیے  
 یہ ضعیفی اور تلاشِ خال و خد      جستجوئے نازنینِ سرو قد  
 اس جنوں کی بھی ہے مژا کوئی حد      چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد  
 آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

کس طرح طے ہو رہے عالمِ امکاں مجھ سے      میں تھکا ماندہ ہوں اور دوپے جاناں مجھ سے  
 ذرہ ذرہ دمِ وحشت ہر گریزاں مجھ سے      ہر قدمِ دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے  
 میری رفقا سے بھاگے ہے بہا بیل مجھ سے  
 جبکہ دیباچے سے کھلتے ہیں مضامین یکہ      پکار رہے وصیت ہے کسے بیٹھ کے دیکھے دفتر  
 اور ہی دھام میں الجھی ہوئی ہے اپنی نظر      درجِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر  
 ہے نگہِ رشتہ شہِ اندازہ شرکاں مجھ سے  
 کیا کہوں کیسے بسر ہوتی ہیں غم کی راتیں      میرے سادہ سادہ بیباں کی مجھے تکلیف نہ دیں  
 یکسی کامری اندازہ اسی سے کر لیں      وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں  
 دود کی طرح رہا سایہ گریزاں مجھ سے  
 میرے نام میں وہ جب ٹھہرے گریاں      پھر خود آرائی و زینت کا وہ سامان کہاں

مٹ گئی سرم کی تخیل کہ میرا شک وں غم عشاق نہ ہو سادگی آموز بتاں  
کس قدر فائدہ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

چونکہ ہے دشت مے پاؤں سے آغشتہ نچل ڈسے ڈسے کو یہ دعویٰ ہے کہ میں فکر ہوں  
کیوں چمکتے ہوئے چھالوں کو جو اہر نہ کہوں اثر ابلہ سے جادہ مصرائے جنوں  
صورتِ رشتہ نگہ ہر ہے چراغاں مجھ سے

کاش ہر اک شب غم میں یہی بے ہوشی ہو تاکچہ آرام سے یہ ہوشِ باگزسے تو  
اس نے تو خوب ہی پہنچائی ہے راحت دلکو بے خودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو  
پڑ ہے سایہ کی طرح میرا شبستان مجھ سے

منہرِ قفل پہ ہیں آنکھ کے ارماں سارے کٹے سرتیزِ نظر ہو تو کروں نظائے  
تبیغ گل گیر سے کم مجھ کو نہیں ہے پیارے شوقِ دیدار میں گرتو مجھے گزنِ مارے  
ہونگے مثلِ گلِ شمع پریشناں مجھ سے

کیا شبِ تانے ڈھائی ہے قیامت ہے چھوڑ دی سایہ نے بھی میری رفاقت ہو  
کتنی پر خوف ہے منزلِ گہرِ فرقت ہے بیکی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے  
سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

بادِ حسن سے بغیر و نہ تو یوں مست کرے تشنہ لب رہی دیدار کے جو طالب تھے  
خوب انصاف کیا ساقی مہوش تو نے گردشِ ساغرِ صدِ جلوہ رنگیں تجھ سے

آئینہ داری یک دیدہ حیراں مجھ سے  
 آگ وہ سید نہ فرمیں بھڑکتی ہے آسند  
 دیکھ کر برق جسے دور کرتی ہے آسند  
 دل میں بھی آتش جاں سوز دہکتی ہے آسند  
 ننگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے آسند  
 ہے چراغاں خس و فاشاکِ گلستاں مجھ سے

۱۱۰

دل میں وہ درد کو اکودکھائے نہ بنے  
 حال اپنا وہ زلوں جسکو چھپائے نہ بنے  
 بارغم میں وہ گرانی کا اٹھائے نہ بنے  
 نکتہ چیں ہے غمِ دل اسکو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

گو بظاہر نہیں کچھ اس کا بلانا مشکل  
 ڈر مگر یہ ہے کہ ہٹ میں ہے وہ اپنی کامل  
 کہیں ہونا نہ پڑے اسکے نہ آنے سے خجل  
 میں بلاتا تو ہوں اسکو مگر اسے جذبہ دل  
 اس پر بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

لذت تیر و جفا کو کہیں وہ شمع نہ پائے  
 ضد نہ چڑھ جائے کہیں ایسی کہ بھڑل نہ دکھائے  
 ہاتھ دانستہ کہیں ظلم سے ظالم نہ اٹھائے  
 کھیل سمجھا کر کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے

کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

خود تو رسوائے جہاں ہو یہ بد ذات مگر  
 نیک نامی کو کہیں تیری نہ پہنچائے ضرر  
 راز داری کسے کہتے ہیں اسے کیا خبر  
 غیر بھڑتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے نو چھپائے نہ بنے  
 « شاخ ہی تنگ ہے گل تر کا شکفتہ رہنا ہاتھ نکل چیں کا پڑا اور وہ پڑ مردہ ہوا  
 چشم بد دور وہ نازک ہیں کہیں گل سے سوا اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا  
 ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے  
 نور یہ ہر میں یہ مہ میں ضیا کیسی ہے کس کی بو ہر گلِ نو خاستہ میں مخفی ہے  
 ہر طرف طرف تماشا کے نظر بندی ہے کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے  
 پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے  
 غم سے گھل کر گلِ بڑول کے اشکوں میں ہے میں نے اب تک تو تم وعدہ خلا فی کے ہو  
 منظر کیوں ہوں تمہارا کوئی اب لاکھ کہے موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بنائے نہ ہے  
 تم کو چاہا ہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

۱۵۔ اس شعر کی تشریح غالب صاحب نے منشی نبی بخش حقیر کو اس طرح لکھی ہے "بھائی مجھ کو تم سے بڑا تعجب ہے کہ اس  
 بیت کے معنی میں تم کو تا مل رہا اس میں دو مستفہام آئے ہیں کہ وہ بطریق طعن و تعویض معشوق سے کہے گئے ہیں  
 موت کی راہ نہ دیکھوں۔ کیوں نہ دیکھوں؟ میں تو دیکھوں ہی گا کہ بنائے نہ ہے کیونکہ موت کی شاخ میں سے یہ  
 بات ہے ایک دن آئے ہی جی انتظار ضائع نہ جائے گا۔

تم کو چاہوں، کیا خوب کیوں چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے یعنی اگر تم آپ سے آئے تو آئے اور اگر نہ  
 آئے تو پھر کیا حال کہ کوئی تم کو بلا سکے گویا یہ عاجز معشوق سے کہتا ہے کہ اب میں تم کو چھوڑ کر اپنی موت کا عاشق  
 ہوا ہوں۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ بن بلائے بغیر آئے نہیں رہتی تم کو کیوں چاہوں کہ اگر نہ آؤ تو تم کو بلا نہ سکوں۔"  
 یہ غزل غالب صاحب نے منشی نبی بخش حقیر کو اس غزل کے ساتھ جس کا مطلع ہے  
 کہتے تو ہونم سب کہ بہت غالب تو آئے اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وہ آئے"

اور سال کی تھی۔

ہیں برے بیچ میں تقدیر سے ہم آگے ہوئے      بات بنتی نظر آتی نہیں تدبیروں سے  
کر دیا ہے ہمیں مجبور بہت قسمت سے      بوجہ وہ سر سے گرے کہ اٹھائے نہ اٹھے

کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے  
عشق کی خاک کرے کوئی ستائش غالب      الاماں قہر ہے اس برق کی تابش غالب  
بارہا کی ہے یہ منزلے گزارش غالب      عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب  
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

آیا مرزا کو جسے دیکھتے ہی غش غالب      تم نے دیکھا نہیں وہ شعلہ کرش غالب  
باب الفت میں عبت تم ہو مشوش غالب      عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب  
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے



شبِ فراق میں لحت وہ بے حساب دے      لگی ہر آگ جو سینہ میں اس کو آب تو دے  
نجات غم سے وہ پڑھ نہیں شتاب تو دے      وہ آگے خواب میں تسکین اضطراب تو دے

وے مجھے پیشِ دل مجالِ خواب تو دے

جوابِ غیظ و غضب سے ہر ایک کو دینا      ہر ایک کن میں دونوں جہاں سو کھود دینا  
وہ بھر کے سانس جگر میں چھری چھو دینا      کرے ہے قتل لگاؤٹ میں تیرا رو دینا

تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

۱۷ حاشیہ ص ۲ پر

نکلے منہ سے عطا کوئی جام کریم کو      امیدوار نہ یوں صبح و شام کریم کو  
جواب تلخ ہی سے شاد کام کریم کو      دکھا کے جنبش لب ہی تمام کریم کو  
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

خیال چھوٹ سے بچنے کا ہے نہ عادت ہے      نہ اجتناب کسی سے نہ کچھ عداوت ہے  
ہمیں سے اک تجھے پر ہیز اور کرہیت ہے      پلائے اوک سے ساقی جو ہم ک نفرت ہے  
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

شب اسکی بزم سے اغیار یوں ملول گئے      کہ پاؤں ٹھ گئے اور چو کڑی وہ بھول گئے  
قبول خدمت مزا ہوئی وہ غول گئے      اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے  
کہا جو اس نے مے ہاتھ پاؤں داب تو دے

حاشیہ ضمیمہ ۱۔ اس غزل کے بارے میں مرزا علاؤ الدین کو بڑے قلق کے ساتھ لکھا پچاس برس کی بات ہے کہ انہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ سبب الغزل یہ ہے پلائے نوک سے ۱۰  
سہ اسد خوشی ... ۱۰ اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے نکھ کر اس مطلع اور اس بیت الغزل کو شامل  
ان اشعار کے کر کے غزل بنالی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعری اتو کے ....  
جب شاعر کی زندگی میں گائے والے شاعر کے کلام کو مستخرج کر دیں تو کیا بعید ہے کہ دو شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں  
نے غلط کر دیا ہو۔

۲۔ مقطع سے متعلق ایک لطیفہ بھی ہو سکتا ہے غالب صاحب ایک مرتبہ پٹنگ پر پڑے ہوئے کو کہہ رہے تھے۔ مہر مہدی  
پاؤں دبا نے لگے غالب صاحب کہا بھئی تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گناہ گار کرتا ہے۔ انھوں نے مانا اور کہا ”آپ کو  
ایسا ہی خیال ہے تو پیر و ابے کی رحرت دیر تھکتے۔“ غالب صاحب نے کہا ”ہاں اس کا مضائقہ نہیں۔“ جب وہ پیر و اب  
چلے تو اجرت طلب کی۔ غالب نے کہا ”بھئی کیسی رحرت تم نے میرے پاؤں دبا لیے میں نے تمہارے پیسے دبا لیے۔“



اُدھر ناکھتہ بہ حال ہوں و خوارِ بستر ہے      اُدھر مجھے تن خود میسے حق میں خارِ بستر ہے  
دل بیتابِ مضطرب باعثِ آزارِ بستر ہے      تپشِ سگری و وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے  
مرامِ رنجِ بالش ہے مرا تن بارِ بستر ہے

حقیقتِ اشکِ اورل کی تم سہ کیا کہیں ہے      مگر ہاں مفسرِ نلو کو وہ کیا شے ہے یہ کیا شے  
ہمائے ناز پریدوں میں ہیں و نونِ راک ہے      سرکشِ سرِ صحرادادہ نورِ العینِ امن ہے  
دلِ بے دست پُراقتادہ بر خوارِ بستر ہے

نہے قسمتِ کرم یوں بے بلائے میسے گھر آؤ      مے بیتِ لُحْن کے جاگ اٹھے نہ نصیبِ امتو  
مرضِ کا اپنے بڑھ جانا مبارک ہو گیا مجھ کو      خوشا اقبالِ بخوری عیادت کو تم آئے تو  
فروغِ شمعِ بالیس طالعِ بیدارِ بستر ہے

ہوا اندھیر گھر میں کیا بلا وقت کی رات آئی      در و دیوار پہ ہے کس غضب کی تیرگی چھائی  
مگر ہاں گھر: بستر کی بدلت روشنی پائی      بہ طوفانِ گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی  
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

خدا کا شکر ہے تقدیر ہے جاگی ہوئی اپنی      پھر اسکے خواب میں آنی کی حسرتِ یوں بین ہوئی  
بتائیں کیا ابھی کل ہی تو وصلِ یار کی شب تھی      ابھی آتی ہو بالمش سے سکی زلفِ مشکیں کی  
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

ہوا ہے مبتلا مرزا عجب آزار میں غالب رہا کچھ بھی نہ باقی اسکی جان زار میں غالب  
 نہیں اٹھنے کی بھی طاقت آہن مجا میں غالب کہوں کیا دیکھی کیا حالت ہر بحر یار میں غالب  
 کہ بے تابی سے ہر اک تار بستر خار بستر ہے

۱۱۳

ہی ہر بات اہنگ تو کہیں ان بن نہ ہو جائے محبت کی جگہ نفرت تجھے پرفتن نہ ہو جائے  
 رہا غرہ تو میرفس ہی رہن نہ ہو جائے خطر ہے رشتہ الفت رگ گردن نہ ہو جائے  
 غرور دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے  
 کمالِ فصل گل کہتے ہیں سکو مرزا غالب کہ ہو ہر ہر شجر پہنے ہوئے گل کی قبا غالب  
 سرگلبن کھلیں دو چار گل تو کیا مرزا غالب سمجھ اس فصل میں کوتاہی نشوونما غالب  
 اگر گل سرو کے قامت پہ پیرا بن نہ ہو جائے

۱۱۴

کیا جانے اصول ہے نہیں ہے آہنگ بھی کوئی طے نہیں ہے  
 باقاعدہ کوئی شے نہیں ہے فریاد کی کوئی لے نہیں ہے  
 نالہ یا بند بے نہیں ہے  
 گلشن کو غرض نہیں جو سے کیا معنی ہیں پھر کہ فتنے کے

کشکول کا کام کیا نہ لیں گے      کیوں بوتے ہیں باغبان تو بنے  
گر باغ گدائے مے نہیں ہے

جود تیرا ہی چار سو ہے      ہر ایک کو تیری جستجو ہے  
تجھ سے ہی گلوں میں رنگ و بو ہے      ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے  
پر تجھ کی تو کوئی شے نہیں ہے

بے جا بے خودی و خود پرستی      ایک وہم و خیال ہے یہ بستی  
لاشے بے یہ اوج اور بستی      ہاں کھا میو مست فریب ہستی  
ہر چند کہیں کہے نہیں ہے

پیوستہ ہر ایک شے ہر ضد سے      ہوتی ہے نشاط بعد غم کے  
خواہاں بے اگر الم سے چھوٹے      شادی سے گزر کہ غم نہ ہوئے  
ار دی جو نہ ہر تو دے نہیں ہے

کچھ وہم مگر تجھے ہے زاہد      ازکار شراب سے ہے زاہد  
ملتی یہ شے کسے ہے زاہد      کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد  
مے ہے یہ نگس کی قے نہیں ہے

مرزا ترا ہم قدم ہے غالب      دھیان اس کو یہ دمدم ہر غالب  
دم کہتے ہیں جس کو دم ہے غالب      ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب  
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

کچھ رشک قیبوں ہی سے تنہا نہیں کرتے      اپنی بھی نظر سے انھیں دیکھا نہیں کرتے  
جان لے جو لب پر کھٹی تو پروا نہیں کرتے      ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے  
مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

وہ غیر جو کہتے ہیں یہ کہنا ہے زبانی      لیکن ہے رقیبوں سے رکاوٹ کی نشانی  
ہم سے کوئی آسان ہیویں بات بنانی      درپردہ انھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی  
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پروا نہیں کرتے  
قابو نہ کسی شخص کا تم پر ہے نہ بس ہے      مانو تو یہ مرزا کی نصیحت تمھیں بس ہے  
باز آؤ اگر مہر و وفا سے تمھیں مس ہے      یہ باعثِ نومیدی اربابِ ہوس ہے  
غائب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

مرے سبب یہ خستہ فلک رہ گیا کیسے      غریب کشتہ تیغِ نظر ہے کیا کیسے  
فریبِ حسن سے یہ بے خبر ہے کیا کیسے      دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کیسے  
ہو ارقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کیسے

اے غالب صاحبِ نشی بنی بخش حق کو گدھا کر بھائی یہاں بادشاہ نے قلم میں مشاعرہ مقرر کیا ہے ہر مہینے میں دو بار  
مشاعرہ ہوتا ہے پندرہویں کو اور انیسویں کو حضورِ فارسی کا ایک مصرع اور ریختے کا ایک مصرع (باقی ص ۱۱۶ پر)

بدن سے جان کی طرح جائے بن نہ رہے      فراق جسم کا صدمہ اٹھائے بن نہ رہے  
مگر ہیں تو یہ پھر بھی ستائے بن نہ رہے      یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے  
قضا سے شکوہ ہیں کس قدر ہے کیا کہیے

ضرور ہے کوئی موجودگی کا اسکی سبب      اسی کو گشت میں پایا وہاں گئے ہم جب  
کچھ اور نقل ہی اس کو نہیں ہے روز و شب      ہے ہریوں کو وہی گہرہ کہ کوئے دوست کو اب  
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے

ہم اے سر پر تھا جب تک شباب کا اسیدب      نہ راہ عشق کا سو جہا کہی فراز و نشیب  
اس اک گمان سے چل کر تھک کر کو صبر و کسب      نہ ہے کرشمہ کہ بوں نے رکھا ہے ہم کو فریب  
کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیے

ہم اے درد و الم کا ہوا کہ ان کو خیال      بلا کے گھر کبھی پوچھی نہ وہ رنج و ملال  
وہ بے بچہ نہیں یہ بچہ ہے ایک ان کی چال      سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ سپریش حال  
کہ یہ کہے کہ سر رہ گزر ہے کیا کہیے

تمھارے انس و محبت کا رعب و احوال      کہ بات بات میں ہر دو مستوں کی رنج و ملال  
تمھیں سے ہم بھی اگر ہوں تو ہونا ہا حال      تمھیں نہیں ہے سر رشته وفا کا خیال

بقیہ ص ۴۰۵ کا مطلق کرنے پر۔ اب تادی اتانی کی تیسویں کو جو مشاعرہ ہوا اس میں مصرع فارسی یہ تھا کہ  
زیں تماشا گاہ گرماں می رود۔ یہی مصرع یہ تھا کہ خار عشق ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے۔ مصرعے کیا کہیے خبر ہو گیا ہے۔  
میں نے ایک غزل لکھی اور ایہ ریختہ موافق طرح کے اور دو سہار بخیر اسی طرح میں سے ایک اور صورت  
ذکاں کر لیں وہ تینوں غزلیں تم کو کھنا ہوں یڑھ لینا اور میاں تفتہ کو بھی دکھا لینا۔

ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کیئے  
 کبھی کیا بھی جو کچھ عرض حال دل ہم نے  
 تو مسکرا کے کہا کیوں ہوئے ہو دیوانے  
 فضول ہو جائے ہر وقت دو بدوان سے  
 انہیں سوال پر زعم جنوں ہے کیوں لڑیئے  
 ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کیئے  
 کسی کو ہم سے اگر رشکِ فن ہے کیا کیئے  
 حسد کی آگ اگر شعلہ زن ہے کیا کیئے  
 جہان کی یہی رسم کہن ہے کیا کیئے  
 حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیئے  
 ستم بہالے متاعِ ہنر ہے کیا کیئے  
 کٹے جہان میں مرزا بہر مشکل اس کے دن  
 نہزار عیب لگاتے ہیں اس کو بد باطن  
 بُرا بُرا اسے کہتے ہیں سب جوان و مُسن  
 کہا ہے کس نے کہ غالب بُرا نہیں لیکن  
 سوائے اس کے کہ آشفۃ سر ہے کیا کیئے

جب تک آزاد تھا کب تھی پریشانی مجھے  
 تخی عدم میں ہر طرح حاصل تن آسانی مجھے  
 کچھ بچ کر زنداں میں لائی میری جولانی مجھے  
 دیکھ کر در پردہ گرم دامنِ انشانی مجھے  
 کر گئی وابستہ تن میری عربانی مجھے  
 یوں مرا سینہ دہائے وہ مری قسمت کہاں  
 اور کیا اسکے سوا ہے خوش نصیبی کا نشان  
 اور گلے پر اسکے ہاتھوں سے ہولیوں خجرواں  
 بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں

مرحبائیں۔ کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے

رات دن آتے آسکا تصور پہ بے پہلے مجھ کو عرضِ حال میں مانع نہیں بھر کوئی شے  
ہوں اسی دھن میں ہی مجھ کو لگی رہتی ہے کیوں رہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہے

جاننا ہے جو پرستہاے پہنانی مجھے

میری بربادی تو قدرت نے تقدیر کی ہی تھی اس پر طرہ یہ ہوا گھر کی بلا سر پڑ گئی  
یہ ہوئی اچھی عنایت کا تب تقدیر کی میرے غم خانے کی قسمت جب تم ہونے لگی

لکھ دیا منجملہ اسباب ویرانی مجھے

ملتی جلتی ہے فغاں اسکی مری فریاد سے شوق سے سنتا ہوں اپنا ہم نوا پا کر اسے  
ڈال رکھا ہے پریشانی میں اسکے وہم نے بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاشکے

اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

جینے کے ہاتھوں پاپا چین میں جینے جیا داؤں جب اس کا چال کچھ ظلم ہی مجھ پر کیا  
تنگ آکر زسیت سے جامِ اجل آخر پیا ولے واں بھی شورِ مٹرنے نہ دم لینے دیا

لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

پر رقیبِ روسیہ یوں ہی اگر دمسائے جھوٹ پر رغبت دلائیگا کر تو مبارک ہے  
منتظر رکھنا کسی کو یہ بھی کوئی ناز ہے وعدہ آئے کا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے

تم نے کیوں سوچی ہے میرے گھر کی دہانی مجھے

چاہئے بھائی سے یوں بھائی کو مرزا دوستی ہو جو اس کو خیر تھی تو خیر تھی ہو اس کو بھی

جس طرح غالبؔ کی اس شعر میں ظاہر خوشی دی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی  
میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسف ثانی مجھے

۱۱۸

خود فراموشی ہوئی وقتِ مسرت کب مجھے دل ہی جنالوں پہ پھر فرحت کیا مطلب مجھے  
لب پر اس کا نام تھا کچھ درد پہنچا جب مجھے یاد ہے شادی میں بھی ہنگامِ یارب مجھے  
بسوزِ زاہد ہوا ہے خندہ زیر لب مجھے

کہہ گیا دل رفعِ دل سے ہو گیا رنج و عن کر رہا ہے پرسشِ احوال ہر غمچہ میں  
باتِ نجائی پر ہوتا ہے جو کوئی حرفِ زن ہے کشادِ خاطر و البستہ در رہن سخن  
معا طلسمِ قفلِ ابجد خانہٴ مکتب مجھے

اک طرف چپکا پڑا تھا کیا نے زنداں میں تھے کیوں نہ آئیں یادِ رہ کر وہ نِ ارام کے  
مہلتِ ابم بھر نہیں آوارگیِ دشت سے یارب اس استغنیٰ کی داؤد کس سے چاہیے  
رشتِ اسالیب پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

راتِ ہی ہستی پر آنکھوں و لالک جوئے خوں حال دل بھی ہو گیا ہے کثرتِ غم سے زبوں  
عمر گزی پر کہیں اس ذوق کا شوکرہ ہوں طبع ہے مشتاقِ لذتِ ہائے حسرت کیا کروں  
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

جہ سے فرماتے تھے طنز کیوں تم ایسے ہو گئے کیا ہوا مژدہ تمہیں دیوانے کس کو ہو گئے



اب تو صرت کیلئے موزوں یقہ ہو گئے      دل لگا کر آپ بھی غالب مجھ سے ہو گئے  
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

کمالِ علم اہلِ انجمن کی آزمائش ہے      ہنر کا امتحاں ہے اہل فن کی آزمائش ہے  
ہراکِ نو مشق و مشتاق کہن کی آزمائش ہے      حضورِ شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے

چمن میں خوشنویاں چمن کی آزمائش ہے  
معن میں ہر گرفتارِ معن کی آزمائش ہے      گداز و سوز میں شمعِ لگن کی آزمائش ہے  
قفس کی قید میں رخِ چمن کی آزمائش ہے      قد و گیسو میں قیس و کوہن کی آزمائش ہے  
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کہیں ایسا نہ ہو محنت ہو اسکی رائیگاں آخر      نہ جوئے نول ہو جوئے شیر کے بلے رواں آخر  
غم شیریں ہے گا کس طرح وہ نیم جاں آخر      کریں گے کوہن کے حوصلے کا امتحاں آخر  
ہنر اس خستہ کے نیرے تن کی آزمائش ہے

سنا ہے اس نے کب یعقوب کی آہ بھر گاہی      سنگھا کر بوئے یوسف اسنے کب اسکی خوشی چاہی  
ہوئی چراہی مطلب کے کغال کی نظر اہی      نسیم مصر کو کیا پیر کغال کی ہوا خواہی  
اسے یوسف کی بوئے پیر بن کی آزمائش ہے

یہ کیا کہتے ہو تم ضبط و تحمل کے غلط دعوے      یقیں جاؤ کہ ہوش اڑ جائیگے جب سکود کھو گئے

جسے دعویٰ ہوا اہل بزم میں بے سبب و سبب سے  
وہا یا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کرا غافل تھے

شکیب و صبر اہل انجن کی آزمائش ہے

نشانے دو ہیں جسکو بھی ارادے اسکا تیرا کر  
تو پھر شک و گمان اندازی میں اسکی کیجئے کیونکر

کماں کو کھینچنا ہی اسکا اک احسان ہر دم پر  
ہے دل ہی میں تیرا چھانچ کر کے پار ہو بہتر

غرض شست بہت ناوک فلن کی آزمائش ہے

نظاہر تو یہ دونوں ایک ہی بت کے ہیں دانی  
مگر رسم پرستش مختلف دونوں ٹھہرائی

عبث گردن ہر اکے زشتہ الفت میں نہ ہوا  
نہیں کچھ سحر و زنا رکے پھندے میں گیرائی

وفاداری میں شیخ و برہن کی آزمائش ہے

نتیجہ نا شکیبائی کا آخر کیا ہے لے غافل  
تر پنے سے کہیں آسان ہو سکتی ہے مشکل

نہ ہو جائے کہیں تجھ پر کوئی تازہ بلانا زل  
بڑا رہ لے دل ابستہ بیتابی کو کیا حاصل

مگر پھر تاب زلف پر شکن کی آزمائش ہے

ہمارا قصد تھا پکھیں کسی نہ بھی اس کو  
مڑہ لینے نہ پائے خود بخود گھلنے لگے ہم تو

زباں کا ذکر کیا اسکا اثر آگے تو بڑھنے دو  
رگ و پے میں جبا تیرے رہم تب دیکھئے کیا ہو

ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

سنا تو ہے انھوں نے ارادہ کر لیا غالب  
کہ وہ مرزا سے باندھیں عہد ہیمان فاغاب

مگر اب دیکھئے یہ چرخ لائے رنگ کیا غالب  
وہ آئینے مے گمر، وعدہ کیسا، کھینا غالب

نئے فتنوں میں اب جہر خ کہن کی آزمائش ہے

اگر وہ روٹھنا ہو کب بنایا جائے ہر مجھ سے      سر رہ مل بھی جانتا ہے تو کنیا جائے ہر مجھ سے  
 غرض جتنا بنانا ہوں بگڑتا جائے ہر مجھ سے      کبھی نیکی بھی اسکے جی میں گر آجائے ہر مجھ سے  
 جھٹائیں کر کے اپنی یاد شرمنا جائے ہے مجھ سے

نظر آتا ہے خواب وصل تو تعبیر لٹی ہے      بگڑتا ہے بنگر کام کیا تقدیر لٹی ہے  
 مرے سب کام لٹے ہیں مری تدبیر لٹی ہے      خدا یا جذبہ دل کی مرے تاثیر لٹی ہے  
 کر جتنا کھینچتا ہوں ور کھینچتا جائے ہے مجھ سے

اسے کیونکر سناؤں حال دل پر سخت حیرانی      پریشانی کا مضمون وریاں ہیں پریشانی  
 کھلائے دیکھئے کیا گل میسے قاصد کی نلوانی      وہ بدخوا اور میری داستان عشق طولانی  
 عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

یہ میری سرگزشت ان کیلئے جھوٹی کہانی ہے      انھیں سننے کو نفرت پر یہاں طلی سانی ہے  
 مجھے دشوار اپنے دل کی کیفیت سنانی ہے      ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے  
 نہ پوچھا جائے ہر ان سے نہ بولا جائے ہر مجھ سے

ہماری زریست امید تصور کی بدولت ہے      قضا کا سامنا ہو کیا بلا ضعف و نقاہت ہے  
 خیالی زندگی پرور نہ کیا جینے کی صورت ہے      سنبھلتے در مجھے ناامیدی کیا قیامت ہے  
 کہ داماں خیالی یا رچھوٹا جائے ہے مجھ سے

گوارا دلو یکب پر کر دیکھیں سکو انس جن      تقاضا رشک کا یہ ہے وہ آنکھوں میں ہو سکن  
 وہ جب جلوہ نما ہو گا تو ہو گا حشر کا وہ دن      تکلف بر طرف نظارگی میں بھی رہی نہیں  
 وہ دیکھا جائے کب ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

بمچہ کھاتھیں نے عشق کو اک لنگی دل کی      کہاں کی لنگی یہ تو مصیبت پڑ گئی ابٹی  
 خبر کیا مجھ کو اس کی معرکہ آرائیوں کی متقی      بچے ہیں پاؤں ہی پہلے برد عشق میں زخمی  
 نہ بھاگا جائے ہر مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

مجھے آتا ہے یہ خواب پریشاں کیا نظر غالب      بنے گی دیکھئے کسی دل بیتاب غالب  
 نہ کیوں اس شکست ہونوں مرزا کا جگر غالب      قیامت پر کر ہوئے مدعی کا ہم سفر غالب  
 وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہر مجھ سے

گردش میں جو ہے گنبدِ خرامے آگے      فانوسِ خیالی کا ہے نقشِ خرامے آگے  
 ہے ارض کو اک گیند کا رتبہ آگے      بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے  
 ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک بلبہ ہے گنبدِ گرداں مرے نزدیک      دُکے سے بھی کمتر ہے بیاباں کے نزدیک  
 ہے شعبہِ نیرنگیِ دوراں مرے نزدیک      اک کھیل ہے اورنگِ سلجماں کے نزدیک  
 اک بات ہے اعجازِ مسحمارے آگے

اعراض ہیں اوہام تو اجسام ہیں مستور  
جز نام ہی نام انکا حقیقت کہ یہی سب دور  
ہر رنگ میں موجود ہے صرف ایک وہی نور  
جز وہم نہیں ہستی اشیاء مرے آگے

اڑتا ہے بیابان کا خاکا مرے ہوتے  
اٹھتا ہے بگولے پہ بگولا مرے ہوتے  
اشکوں سے ہر سیلاب کا نقشہ مے ہوتے  
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے  
رگھستابے جہیں خاک پہ دریا مرے آگے

دیکھ تو کوئی دل کا ٹرنا ترے پیچھے  
کیا کہیے گزر جاتی ہے کیا کیا ترے پیچھے  
جینا مجھے دشوار ہے گویا ترے پیچھے  
منت پوچھ کہ کیا حال ہر میرا ترے پیچھے  
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

حاشیہ ص ۲۱۳ کا :- اور بک سلیمان حضرت سلیمانؑ کا تخت حضرت سلیمانؑ ایک بیگز گزے ہیں۔ انکی بادشاہت  
بنی نوعاں سال برہی رہی مگر جبریزین اور حوین پر بھی انکی حکومت تھی اور حوین کی مدد سے انکا تخت ہوا میل اڑتا تھا  
اعجاز کیا۔ عیسیٰؑ کے مرنے کے بعد مسیحی بھی ایک بیگز گزے انکے مرنے اور کمالات بہت تھو ہیں۔ انکا ایک  
معجزہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنی بیعتوں سے مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے

سلیمانؑ کا تخت میرے نزدیک ایک کعبیل کی حیثیت رکھتا ہے اور حضرت عیسیٰؑ کا معجزہ میرے آگے ایک  
معمولی ہی باب ہے یعنی شاہانہ توکس اور بیگز نامہ معجزے میری نظر میں کچھ بھی نہیں ہیں۔

اس غزل کے متعلق منشی نثری محسوس تھیں کہ لکھتے ہیں در بامہ آگے، صحرائے آگے اس پر بھی ایک سال گزر چکا ہے  
قلعہ مبارک کے مشاعرے کی غزل ہے یہ دہلی اردو اخباریں اس تمہید کے ساتھ چھپی ہے۔

منگل کے دن صبح کو شعر اے قلعہ مبارک اور شہر کے دیوان خاص میں جمع ہوئے حضور اقدسؑ اعلیٰ برآمد اور  
جلوہ فرمائے تخت ہوئے۔ جناب حضرت ولی عہد بہادر زبیر افزائے کرمی اور مرزا مغل بہادر اور مرزا نصر سلطان  
بہادر اور مرزا حواں نخت بہادر اور شہزادگان والا تبار بعد بار بار بیانیہ حسب المکمل قصا و امثر فرشتے (باقی ص ۲۱۵)

ہوتا ہوں میں جس وقت سے ناب سرشار اٹھے ہیں تجابات عیاں ہوتے ہیں اہلرا  
 ہے نشہ سے وابستہ گہر ریزی افکار پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار  
 رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبامے آگے

رہتا تھا شب و روز اسی بات پہ جھگڑا ذکر اس کا کرے کوئی مجھے کب تھا گوارا  
 اب لاکھ کوئی ذکر کرے کچھ نہ کہوں گا نفرت کا گماں گزرتے ہیں رشک سے گزرا  
 کیوں کر کہوں لو نام نہ اس کا مرے آگے

اسلام ہو مانع جو مجھے دوڑ کے لے کفر ہر چیز عقیدت سے جگہ اکھولیں دے کفر  
 حاضر ہے خدمت کو کرماندہ ہوئے کفر ایمان مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر  
 کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسامرے آگے

میں وہ ہوں کہ جس کام کو چاہا نہ رکا کام اس شوخ کے آگے نہ چلا پر نہ چلا کام  
 حیرت ہو کہ کیوں اپنی تمنا میں ہوں نا کام عاشق ہوں پر معشوق فوجی ہوں مرا کام  
 مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

وقت میں گزرتے تھے جو سو طرح کے صدمے کرتا تھا دعاروح کہیں جسم سے نکلے  
 اب ان سے جو ملنا ہوا دی جان خوشی سے خوش ہوتے ہیں پر پول میں یوں نہیں جاتے  
 آئی شب ہجران کی تم مارے آگے

موجود ہے جو سوز دروں کا شب بھی ہو ہے جھڑپا ب جوش جنوں کا شب بھی ہو

بقیہ صفحہ ۲۱۶ کا ۱۸۔ حسب مراتب مقام معزز و مکرم ہوئے۔ بارہ پر ایک بے تک حفوظ اقدس جلوہ فرمایا ہے۔

اب تک ہے جو کچھ مال زبوں کاش ہی ہو      ہے معجزن اک قلزمِ خوں کاش ہی ہو

آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

نظارہ نے نزع میں بھی دافعِ غم ہے      اٹھواتے ہو کیوں پاس کی کیا یہ کوئی کم ہے

ٹھہرو کہ یہ برتاؤ دمِ مرگ ستم ہے      گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

والستہ ہے اس ذات سے جو نا ہے میرا      اس ام میں مرزا بھی ہم آواز ہے میرا

ہم کار ہے اور ہمد او دمساز ہے میرا      ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمارا ہے میرا

غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

۲۲۲

امید کیا ہے جو کچھ اپنا ماترا کیئے      ہماری بات کو کب آپ نے سنا کیئے

کروں جو شکوہ تو پھر کیا مری خطا کیئے      کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کیئے

تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کیئے

اگرچہ حسن کے جور و جفا ہی زلیور ہیں      حسین انھیں سے تو آراستہ سرا امر ہیں

خدا خواستہ کب یہ تمھارے جو ہر ہیں      نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستم گر ہیں

مجھے تو خوب ہے کہ جو کچھ کہو جب کیئے

جو آشنا ہو وہی آشنا کے گھر جائے      نہ بڑھ سکے کا قدم کوئی غیر اگر جائے

جسے جو جس سے تعلق وہ بے خطر جائے وہ بیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے

نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کیئے

ہزار سینے کو چھلنی بنائے زخمِ سناں کشادہ دل میں گرتیر کو بے دخل کہاں

کھلا ہوا ہو تراحت تو ہے وہ راسخاں نہیں ذریعہ راحت جراحیتِ پریکاں

وہ ازخیم تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کیئے

بشر کو چاہیے ہو صاف سید کیئے سے بُرا ہے ظلم و ستم گو ہو ظلم کے بدلے

مزا تو یہ ہے کہ بن جاؤ دوست دشمن کے جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیئے

جو ناسزا کہے اس کو نہ ناسزا کیئے

کبھی جو بیٹھ بھی جاتے ہیں ہم غزل لکھنے تو بار بار تقاضے یہ ہوتے ہیں دل کے

کہ آج خوب ہی جی بھر کے رویئے دکھڑے کہیں حقیقتِ جاں کا ہی مرض لکھئے

کہیں مصیبتِ ناسازی دوا کیئے

کبھی بیانِ ملالِ دلِ حزیں کیئے کبھی فغانِ جہاں سوز و آتشیں کیئے

کبھی روایتِ ہجرتِ حسین کیئے کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیئے

کبھی حکایتِ صبرِ گریزِ پا کیئے

نجاتِ غم سے جوئے اس کو اور کیا دیئے نثار کیئے دل کو یہی صلا دیئے

جو سراٹائے تو جلا د کو دعا دیئے رہے نہ جان تو قاتل کو نوں بہا دیئے

کئے زبان تو بخیر کو مرحبا کیئے



جو یار پاس نہیں ہے خیال یار تو ہے      تصور اس کاشپِ غم میں غلگسار تو ہے  
یہ اک ذریعہ تسکینِ جانِ زار تو ہے      نہیں نگار کو الفت نہ ہوزگار تو ہے  
روانی روش و مستی ادا کیے

جو فرش گل نہیں حاصل تو سبزہ زار تو ہے      چمن نہیں تو مرا سینہ داغدار تو ہے  
جو گل نصیب میں اپنے نہیں ہزار تو ہے      نہیں بہار کو ہمت نہ ہو بیار تو ہے  
طراوتِ چمن و خوبی ہوا کیے  
نہاتِ غم سے نہ ہو گی یقین تھا غالب      مقامِ شکر ہے سر سے ٹلی بلا غالب  
یہی ہر مسک مریزا بھی میرزا غالب      سفید جب کہ کنارے پر آگیا غالب  
خدا سے کیا تم و جوہرِ نا خدا کیے

۱۲۳

با آبرو تو خلق میں کیا خاک ہو گئے      تھے غرقِ بحرِ شرم کہ پیر اک ہو گئے  
مشہور اک زمانہ کے چالاک ہو گئے      رونے سے اور عشق میں بیاک ہو گئے  
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

نئی سے کشتی کی چاٹ جو بیٹھ بگی ہوئی      پینے میں ہم نے آٹھ پہر کچھ کمی نہ کی  
آخر کو رنگ لاکے رہی اپنی مفلسی      صرف بہائے ہوئے آلاتِ کشتی  
تھے یہی دو حساب سولیوں پاک ہو گئے

پلٹے نہیں ہو اب تو ذرا بھی کسی سے تم ہر اک سے پیش آنے لگے دل لگی سے تم  
جا جا کے اب تو ملنے ہو ہر آدمی سے تم رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم  
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

جن کو نہیں ہے عاشقی و عشق کی خبر ہوتے ہیں معترض وہی تاثیرِ آہ پر  
گلشن میں دیکھیے اثرِ آہ الحذر کہتا ہے کون نالہ بلبیل کو بے اثر  
پرے میں گلی کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

دل میں وہ آگ تھی کہ سراپا جلا دیا ہستی کو عاشقوں نے دیا خاک میں ملا  
پایا انھوں نے زندگی شمع کا مزا پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا  
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرتے تھے جی ہی جی میں دم رنج و غم گلہ تھا عالم خیال ہی میں دم بدم گلہ  
جرات جو پھر بڑھی تو ہوا ہم کو سم گلہ کرنے گئے تھے اس کے تغافل کا ہم گلہ  
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

مہرِ اجول تھا اس کے لئے بے بود و باش کرتے ہی قتل اس کو کیا پہلے پاش پاش  
ظالم نے خود ہی کر دیا پردہ ستم کا فاش اس رنگ سے اٹھائی کلی اسنے اسد کی لاش  
دشمن ملی جس کو دیکھ کے غم ناک ہو گئے

۲۲۲

مجھ کو غم سے رہا کرے کوئی      غم گساری ذرا کرے کوئی  
 لاکھ دعوے کیا کرے کوئی      ابن مریم ہوا کرے کوئی  
 میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

حلقہ زلف حلقہ زنجیر      دونوں ابرو ہیں خنجر و شمشیر  
 جلوہ حسن وہ کہ برق نظیر      چال جیسی کڑی کمان کا تیر  
 دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

میرا قاتل وہی نگار سہی      دو جہاں میں قصور وار سہی  
 خوں بہا اس کے سر ہزار سہی      شرع و آئین پر مدار سہی  
 ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

اس کی محفل تمام گونگی ہے      کچھ کہے کس کو تاب اتنی ہے  
 لب ہلائے مجال کس کی ہے      بات پرواں زبان کتنی ہے  
 وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

ذکر ہوتا ہے جا بجا کیا کچھ      غور کرتے ہیں آشنا کیا کچھ  
 کہہ گیا دل کا مدعا کیا کچھ      بگ رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ  
 کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

جو لڑے اس سے تم لڑو نہ کبھی رکھو آزاد زندگی اپنی  
کیا ضرورت جواب دینے کی نہ سناو گرا کر کہے کوئی  
نہ کہو گرا کر کہے کوئی

کوئی تم کو جو دے اذیت بھی درپے انتقام ہونہ کبھی  
رہنمائیِ خلق ہے اچھی روک لو گرا غلط چلے کوئی  
بخش دو گرا خطا کرے کوئی

جو بظاہر ہیں خرم و خورسند وہ ہیں ناشاد تم سے بھی دہ چند  
ہے درِ احتیاج کس پر بند کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند  
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیوں نہ شکوہ کریں مقدر سے کھینچ لایا ہے دشت میں گھر سے  
رکھتے امید خاک رہبر سے کیا کیا خضر نے سکندر سے  
اب کسے رہنما کرے کوئی

ان سے جب نکل میدہتی غالب شکوہ سخی کی خور ہی غالب  
حق ہے مرزا کی خامشی غالب جب توقع ہی اٹھ گئی غالب  
کیا کسی سے گلا کرے کوئی

---

اے خضر و سکندر راقعہ مشہور ہے خضر و سکندر بادشاہ کو آپ حیات کے چشمے پر لگئے۔ خود تو آپ حیات پتی لیا  
اور سکندر کو ان لوگوں کے سامنے لگئے جو آپ حیات پتی پر بوجہ طولِ امیری ضعیف و ناتواں ہو کر ڈھلے بغیر  
گئے تھے۔ سکندر نے عالم دیکھ کر آپ حیات پتی سے انکار کر دیا۔ یہی نتیجہ اس شعر میں ہے۔ (باقی ص ۳۲۳)

فلک کے جوسے غم کیا ہے اور ہم کیا ہے یہ میری تاک میں اور درپے ستم کیا ہے  
 جوئے کدہ ہے سلامت تو پھر الم کیا ہے بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے  
 غلام ساقی کو نثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

تمہارے قول ہیں کیا چیز اور قسم کیا ہے مال اس کا ستم ہے تو یہ کرم کیا ہے  
 ذلیل ہو گا کسی دن اسے بھرم کیا ہے تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے  
 رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

نجومیوں کے خیالات فام ہیں بے سود نہ سعد و حس نہ انکے شگون کا ہے وجود  
 کسی پر کھل نہیں سستی مشیت مہمود لکھا کرے کوئی احکام طالع مولود  
 کسے خبر ہے کہ واں جنبش قلم کیا ہے

کرب حلف سے بھی وہ بت جو ترکِ رُخفا مجھے یقین نہ آیا نہ آئے گا اصلاً  
 خدا سے مخوف اور منکر جزا و سزا نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا  
 خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

ہوئی ہے مہرِ سلیمان کی عدل سے محکم دکھائی دیتا تھا عالم یہ جام پر تھا بھرم  
 انھیں صفات سے دونوں کا ہے وجود عدم وہ داد و دید گرا نما یہ شرط ہے ہمد

بقیہ صفحہ ۲۲۱ کا ۱۔ فرماتے ہیں خضر نے سکندر سے کیا کیا؟ یعنی کچھ نہیں کیا۔ گویا خضر کی رہنمائی سے بھی سکندر کو کچھ حاصل نہیں ہوا کوئی اب کسے رہنا بنانا۔

وگر نہ ہر سلیمان وجام جم کیا ہے  
 بلا کسی نے کہا ہے کسی نے دام اسے      کسی نے دی اسے تشبیہ پیشِ عقرب سے  
 کھلے نہ جب تو مہما سے نہ کیوں کہیے      کئے تورات جو کالے تو سانپ کھلائے  
 کوئی بتائے کہ وہ زلفِ خمِ خم کیا ہے  
 جدید طرز کا اردو زبان میں بانی      وہ فارسی کہ جسے سن کے دنگ ایرانی  
 سخن وروں میں ہے مرزا وہ فردو لاثانی      سخن میں خاتمِ غالب کی آتش افشانی  
 یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

۱۲۶

کہوں کیونکر خوشی نکلی نہ دل کو کج و غم نکلیے      یہ سب نکلیے مگر افسوس کیونکر یہ الم نکلیے  
 نہ پوری حسرتیں نکلیں نہ ارمان یک قلم نکلیے      ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر الم نکلیے  
 بہت نکلیے مے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلیے  
 ہوا جلا دگو کیا وہم رو کا کس لئے خنجر      پہرے جب تکے خوں قاتل کے سر پر خون ہا کیونکر  
 نہیں اتنا لہو باقی کہ خنجر اب ہی کر لے تر      ڈٹے کیوں میں قاتل کیا رہ گیا اسکی گزرن پر  
 وہ خوں جو ختم تر سے عمر بھر یوں دم بدم نکلیے  
 کبھی ہم بھی تھے تیسے سائبہ دیوا میں ساکن      رسائی پر بیماری رشک کہتے تھے سائبہ و جن

لے اسی غزل کے زائد شعر غالب احمد سعید خان صاحب ہاتھ لکے نیز اردئے مغلے احمد اولیٰ بن خواجہ اول مولو محمد مرزا  
 علاء الدین احمد خان صاحب بہادر میں درج ہیں۔

ہمیں جب نے اٹھو یا عدو سے یاد ہو وہ نہ نکلنا اخلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ترے گیسوئے پیانے کے مقابل کتب قد تھا زمانہ نے مگر اک فتنہ محشر سے سمجھا

غنیمت ہے کہ اس بچی پر گئی ذکر کھ لیا ہوا بھرم کھل جائے ظالم یہ قلمت کی دازی کا

اگر اس طرف پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

عجب کیا ہے ہمارا خطا اگر اسکو پسند آئے پھر ک جائے عبارت دیکھ کر اور قدر فرمائے

نہ پہونچیں ہم تو کیا تحریر ہی اپنی پیچ جائے مگر لکھوئے کوئی اسکو خط تو ہم سے لکھوئے

ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی ہر رنگ میں جب پیر نہ خانہ کو ناکامی نہ دور جام سے حاصل ہوا کچھ غیر بدنامی

نظر جب آئی میکشون کے ظرف میں خامی ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بلاہ اشرا

پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے

کریں کیا خاکسترات حال مرد و غم سنانے کی کہاں نوبت کسی کو اپنے زخم دل دکھانے کی

کریں کیا شکوہ کچھ حالت ہی تجھے زمانے کی ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد جانے کی

وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغ الم نکلے

اگر ہم شمع سوزن ہیں تو وہ آتش کلہر کالا جلانا خاقہ اس کا ہماری زندگی جلانا

اسی کا پرتوہ ہے اپنا سامان بھاگوا محبت میں نہیں ہے فرق بیٹنے اور مرنے کا

اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کا فریہ دم نکلے

سرِ منبر کیا کرتا تو ہے مے کا بیاں واعظ      بیانِ حرمتِ موسیٰ پر مشہور جہاں واعظ  
 یہی حیرتِ ہمزرا کو بھی کیوں نہی اوہاں واعظ      کہاں مینا نہ کا دروازہ غالب رکھاں واعظ  
 ہر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

۱۲۷

ساقی سیاہ مست ہے تو لطفِ خاک ہے      قصہ ہی پھر تو پینے پلانے کا پاک ہے  
 ساقی کی آنکھ پر بڑھ صہبا کی تاک ہے      مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے  
 موجِ شراب یک مژدہ خوابناک ہے  
 رہتی ہے اس کو خنجر و پیریاں کی جستجو      آنکھوں پہرے ذوقِ براحت کی گفتگو  
 ہر دم سنان و تیر کا نقشہ ہے روبرو      جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو  
 جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے  
 وادیِ تنگ اب ہمیں بھاتا نہیں اسد      نظروں میں اپنی دشت سماتا نہیں اسد  
 مرزا بھی راہِ چارہ بتاتا نہیں اسد      جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد  
 صحرا ہجری آنکھ میں اک مشیتِ خاک ہے

۱۲۸

اس کی ہوا میں ہر گلی تر دلِ فگار ہے      رخ کا پسینہ روکشِ عطر ہمار ہے



بوئے بدن سے بادِ صبا مشکبا ہے جس ہانسیم شانہ کش زلفِ یار ہے

نافہ دماغ آہوئے مشکِ تیار ہے

دل جیتے جی اٹھائے گیا سر پہ بارِ شوق ہم خاک میں ملے تو ہوا انتشارِ شوق

کیونکر فضلے دشت نہ ہوا بے شمارِ شوق ہے ذرہ ذرہ تنگی جا سے غبارِ شوق

گردام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

آنکھوں سے کون پرندہ نشیں ہو چھپا ہوا کس کے خیالِ دید میں سکتے سا ہو گیا

کیوں اس طرح کیا ہے تہیہ تلاش کا کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو یا خدا

آئینہ فرشِ شش جہت انتظار ہے

ہے بس کہ شونخ چشم بڑا مدعا علیہ تسلیم کیوں کرے گا خطا مدعا علیہ

دے گا جواب دیکھئے کیا مدعا علیہ دلِ مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ

نظارہ کا مقدمہ پھر رو بکار ہے

تیارِ سفر میں ہے غنوں کو پیچ و تاب پا در رکاب ہیں یہ گلوں کو ہے اضطراب

پتے اتر کے شاخ سے کرتے ہیں باتراب چھڑکے ہے شبنم آئینہ برگ گل پر آب

اے عندلیب وقتِ وداغ بہار ہے

ہو کیوں نہ انتظار سے دل بستگی مجھے تسکین اس خیال ہی سے ہے بھری مجھے

ایفا کی گونہیں ہے کچھ امید بھی مجھے بیچ آ پڑی ہے وعدہ دلدار کی مجھے

وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

اب تک تو جہر کی بھی نہ تجھ پر پڑی فطرس      ذروں کی آنکھیں دیکھ کہیں ہوں پردہ در  
یہی نہ پھرنا چاہیئے بے باک اس قدر      بے پردہ سوئے وادی مجنوں گزر نہ کر

ہرزہ کے نقاب میں دل بے قرار ہے

بے کار ہے مرقع دل واہ کیا کہی      آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو ہو اس کراہی  
ہو پاس ایسا آئینہ اور پھر یہ مگر ہی      دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی

اے بیدار آئینہ تمثال دار ہے

اٹھنے کو ہے چمن سے عملداری خزاں      تنہا بھی پھر نہ آئے گا تجھ کو نظر یہاں  
غافل یہ کثرتِ خس و خاشاک پھر کہاں      اے عندلیب یک کفِ خس پہر آشیاں

طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

مرزا کی طرح کچھ بھی نہیں اس کو احتیاط      یہ غم کدہ اور اس میں یہ فرحت یہ انبساط  
یہ جوشِ حرص اور قویٰ میں یہ انحطاط      غفلتِ کفیلِ عمرو اسدِ فامن نشاط

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

تو وہ حسین ہے کہ خود آرا کہیں جسے      شاہانِ حسن تاجِ سرا پہنا کہیں جسے  
ہے اور کون حسن میں یکتا کہیں جسے      آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے  
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حیران ہے جو الفت حسن و جمال میں      اک انقلاب ہے دلِ خستہ کے حال میں  
 سکتہ ہوا تصورِ ذوق وصال میں      حسرت نے لار کھاتری بزمِ خیال میں  
 گلدستہ نگاہِ سویدا کہیں جسے  
 دل کو کیا ہے عشق نے کس غم میں مبتلا      کرتے ہیں اسکو بیم و رجاراتِ دنِ فنا  
 آنکھوں کو کس نے شوقِ نظر کا لگا دیا      پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں لٹھیرا  
 افسینِ انتظارِ تمنا کہیں جسے  
 کیونکر جنون و جوشِ حشمت کوٹائے      وحشی کو کس طرح دمِ عزت سنبھالے  
 دل کا غبار اور تو کیونکر نکالے      سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالے  
 وہ ایک مشتبہ خاک کہ صحرَا کہیں جسے  
 آنکھوں میں ہے سمایا ہوا بحرِ بیکراں      اس زور کا ہے مد و تلاطم کہ الاماں  
 دنیا کا حال کیا ہو اگر خشک ہوں واں      ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں  
 شوقِ عنالِ گیسختہ دریا کہیں جسے  
 پھیلی ہوئی ہو چاندنی یا تیز ابر ہو      دونوں ہیں بے طرح متقاضی کہے ہو  
 نہوتی نہیں بسرِ جوشِ غمِ شرابِ دو      درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو  
 صبح بہارِ پسندِ مینا کہیں جسے  
 جس کے برائی دل میں ہو اچھا وہ کیا ہو      کچھ بھی گلہ نہیں ہے اگر ناسزا کہے  
 مرزا سے صبرِ سیکھ کہ دنیا بھلا کہے      غالبِ بران مان جو واعظِ بُرا کہے  
 لے حاضرِ صبر

ایسا بھی کوئی ہے کسب اچھا کہیں جسے

۱۳۰

سامانِ مرگ پہلے جیا کرے کوئی      پھر تجھ سے گفتگو کی تمنا کیے کوئی  
بیٹھا خاموش یوں تجھے دیکھا کرے کوئی      جب تنگ و بانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی  
مشکل کرتجھ سے راہِ سخن واکرے کوئی

کیونکر ہو خاکِ عاشقِ جاننا زے مفر      اس کو ہوائے ہوس پہ پھرتی ہر دوش پر  
وادیِ نجد پر ہی نہیں صرف منحصر      عالمِ غبار و حشرِ مجنوں ہے سر بسر  
کب تک خیالِ طرہٴ لیلیٰ کرے کوئی

یہ مردہ دل میں تھی جو تمناۓ التفات      آنروہ آج کرتے ہوئے اے التفات  
لیکن یہ جان لیں جو ہے دعاۓ التفات      افسردگی نہیں طرب افزائے التفات  
ہاں دردِ دل کے دل میں مگر جا کرے کوئی

کتنے ہیں صبر و ضبط میں اٹھوں پہر مجھے      دل کھول کر بہانے دے ابا شکِ تر مجھے  
چھوڑاں نصیحتوں کو نہ گھونٹا سقد مجھے      رونے سے اے ندیمِ ملامت نہ کر مجھے

حاشیہ ص ۲۲۸ کا آغاز صاحبِ سیف الحق سیاح کو ایک خط میں اس طرح لکھتے ہیں محافلِ سیف الحق تمہارا خط پہنچا  
قاصی صاحبِ بزرودہ کو معاف کر دو اگر کوئی وجہ اپنے پرانے عتاب کی پاتا تو ان سے عذر کرتا اور اپنا گناہ معاف  
کر دیتا جب سببِ ملال کا ظہر نہیں تو میں کیا کروں تم بڑا دانا کس واسطے کہ اگر میں برا ہوں تو اس نے سچ کہا اور  
اگر میں اچھا ہوں اور اس نے برا کہا تو اس کو خدا کے حوالے کر دے

غالب بڑا دانا جو دشمن بُرا کہیں      ایسا بھی کوئی ہے کسب اچھا کہیں جسے

آخر کبھی تو عقدہ دل وا کرے کوئی

دل خستگی ہزار طرح رونما ہوئی      با ایں ہمہ انھیں نہ توجہ ذرا ہوئی  
میں نے قبا جو چاک نہ کی کیا خطا ہوئی      چاک جگر سے جب رہ پریش نہ وا ہوئی

کیا فائدہ کہ حیب کو رسوا کرے کوئی

وادی کے سامنے ہے چین کا چراغ گل      بادِ بہار کا نفسِ سر دسے ہے غل  
کیونکر نہ رشکِ گلشنِ جنت ہو بشت گل      لختِ جگر سے ہے رگِ بہار شاخِ گل

تا چند باغبانی صحرَا کرے کوئی

تیری شعاعِ حسن ہے اک تیر چشمِ دوز      مطلق نہیں ہے آنکھ کو تاپِ نظرِ ہنوز  
ہم دیکھیں کس طرح مجھے اے ہریم روز      ناکامی نگاہ ہے برقی نظارہ سوز

تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

وحشتِ زردوں کو کیا خبرِ فرق و پاؤ دست      اطفالِ گردِ سر ہیں وہ ہیں بچیِ دھن میں  
سر پہوٹنے کا مفت میں ہوتا ہے بندوبست      ہر رنگِ وحشت ہے صدفِ گوہرِ شکست

نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

ہم چاہتے ضرور کچھ اپنے خدا سے عمر      بڑھ جاتی شاید اور دعا و دوا سے عمر  
تنگ آگئی مگر ترے عہدِ وفا سے عمر      سربر ہوئی نہ وعدہ صبرِ آرماسے عمر

فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

آوارگیِ وحشت ہے وحشتِ زرد کا شغل      حسرتِ کشتی ہے ضعف کے مارے ہوئے کا شغل

دامان و حیب پھاڑنا بھی ہونے کا شغل      بیکاری جنوں کو ہے سر بیٹنے کا شغل  
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

بے کار ہے سخن سے طبیعت کا خیر و مینر      انشاؤ اختراع سے بے جا نہیں گریز  
بے سود ہے نتیجہ افکار طبع تیز      ہے وحشت طبیعت ایجاد یا س خیر  
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

روشن کلام دہرے کا فور ہے آس      گویا چراغ مردہ و بے نور ہے آس  
مرزا بھی اب یہ کہنے پہ مجبور ہے آس      حسن فروغ شمع سخن دور ہے آس  
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

۱۳۱

یہ داغ دکھا کر جو گلستاں میں ہنسا ہے      عشاقِ دل افکار کے نزدیک خطا ہے  
نام ہے کہ غرقِ عوقِ شرم ہوا ہے      شبنم بہ گل لار نہ خالی زاد ا ہے

داغِ دل پر دردِ نظر گاہِ حیا ہے      ہے بولے حنا سے یہ نہیں مستی بسیار  
مطلق نہیں حالِ دلِ غمگین سے خبر داز      فرصت ہی نہیں ہاتھوں کے نظار سے زہا  
دلِ خوشدہ کش مکشِ حسرت دیدار

آئینہ بدستِ بت بدستِ حنا ہے      کم آتش سوزاں سے نہیں حسرتِ دل بھی  
جلنا یہی اپنا ہے تو مٹ جائے گی ہستی

یسے میں تمنائے عجب آگ لگادی شعلے سے نہ ہوتی ہو سی شعلے جو کی

جی کس قدر افسردگی دل پر چلا ہے

تصویر کی کیا قدر کریں غیر ہیں بذوق ہم محو ہیں اس درجہ کہ رکھتا نہیں حد فوق  
جاسکتا نہیں آئینہ سے تاباں بد ذوق تماشا میں تیری ہے وہ شوخی کہ بھد ذوق

آئینہ باندا زنگل آغوش کشا ہے

قمری کی صداؤں سے ہے ہر ہر مٹی دنگ بلبیل کے اس انداز سے ہر غچ ہے دل تنگ  
دونوں میں ذرا سوزش پہاں کانہیں ہن گ قمری کف خاکسترو بلبیل نفس رنگ

اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

عادت نے تری پست کیا ہمت دل کو مجبور بدنا ہی پڑا حالت دل کو  
بڑھنے نہ دیا ولولہ و جرات دل کو خونے تری افسردہ کیا وحشت دل کو

معتشوقی و بے وصلگی طرفہ بلا ہے

وہ لاکھ جھائیں کرے دے لاکھ اذیت دشوار ہے آسان نہیں ترک محبت  
کچھ پاس زباں ہے ہمیں کچھ پاس مروت مجبوری و دعوائے گرفتاری الفت

دست تہہ سنگ آمدہ پیمان وفا ہے

ہے قابل عشاق پریشان گزشتہ باقی ہے ابھی اس میں وہی شان گزشتہ  
کرتی ہے عیاں قتل کے سامان گزشتہ معلوم ہوا حال شہیدان گزشتہ

تبیح ستم آئینہ تصویر نمسا ہے

نظروں میں شبِ تار سے بدتر ہے سحر بھی      شائقِ ترے انوار کا دل بھی ہے جگر بھی  
روشن ہیں ترے نور سے دیوار بھی در بھی      اے پر تو خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی

سایہ کی طرح، ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

تقدیر ہی قدرت نے ہمیں ہی ہر کچھ ایسی      ہم پر نہ پڑی ہے نہ پڑے تیری تجلی  
خروم، بحرِ میرے نہیں جلوے سے کوئی      اے پر تو خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی

سایہ کی طرح، ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

جاتا تو ہوں دنیا سے مگر بادلِ ناشاد      کیا کیجئے بے وقت پڑی موت کی اقتاد  
ارمان بھرے دل کی بھی ہر تجھ سے ہی فریاد      ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی طے ۱۲

یارِ ب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

تو اہلِ زمانہ پہ جو مایل نہ ہو غالب      یہ حسرت و حیراں کبھی حاصل نہ ہو غالب  
مرزا کے سوا غیر کا قاتل نہ ہو غالب      بے گانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالب

کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

غلمان کی یہ تشکل نہ صورت ہے حور کی      مجھے گا اسکو کیا کوئی ہے باتِ دور کی  
اک بہر امتحاں تھی ضیا کو وہ طور کی      منظور تھی یہ تشکلِ تجلی کو نور کی  
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی



بہرِ نظارہ اہلِ جہاں کے جساؤ ہیں      اندازِ ہوا ہے کرشمے ہیں چاؤ ہیں  
پھولوں کی بڑھیاں ہیں بدنِ چوڑے گھاؤ ہیں      اک خوشحال کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں

پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پر حور کی  
وہ ہے کہاں کی جس سے لذت اٹھا سکو      دیکھو نہ جس کو خود نہ کسی کو دکھا سکو  
خود جا سکو جناں میں نہ گھر بیٹھے پاسکو      واعظ نہ تم پیونہ کسی کو پلا سکو  
کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی

پھر ہو رہا ہے مجھ کو قیامت کا سامنا      ہے دغدر وہی جو کبھی زندگی میں تھا  
یہ جان کر کہ آج ہے دنِ عدل و داد کا      لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں ٹھا  
گویا ابھی سنی نہیں آوازِ صورت کی

پھرتی ہے بے باغ نہ غم ہے نہ کوئی رنج      گانے لگی ترائے نوبے رباب و صنج  
گویا ہے گا اس کو زنگل سے کوئی گنج      آمد بہار کی ہے جو بیل ہے نغمہ سنج  
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طہور کی

مانا کہ یہ نگاہ سے ڈالے ہوئے تو ہیں      عزت کو لیکن اپنی سنبھالے ہوئے تو ہیں  
آمِ القرد کی گود کے پالے ہوئے تو ہیں      گواں نہیں پر وال کے نکالے ہوئے تو ہیں  
کب سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

موسیقی تھے ملا ہے جنھیں یوں کھلا جوتا      دیکھیں تو دیتے ہیں ہمیں پرے سے کیا جواب  
خطرہ نہیں کسی کو اگر مل گیا جواب      کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب

آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی  
 مثلِ زبانِ شمعِ زباں میں ہے وہ اثر  
 پھونکا اسے کسی سے ہوئے ہم نمن مگر  
 پر کارِ آگ کا تمہیں کہتا ہے ہر بشر  
 گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر  
 کی جس سے بات اس نے شکایتِ ضرور کی  
 مرزا یہ شوقِ جگ کا ہے جس طرح اب ہمیں  
 اس وقت تمہیں بوہی دلِ غالبِ حسیں  
 آخر یہ بات کہہ گیا وہ اُکے جوش میں  
 غالب گراں سفر میں مجھے ساتھ لے اٹھیں  
 جگ کا ثواب نذر کروں کا حضور کی

(۱۳۳)

اس کو جو غمِ گردشِ ایام بہت ہے  
 اس واسطے جو یائے و جام بہت ہے  
 غمِ کھانے میں بودا دلِ نا کام بہت ہے  
 غمِ خوردنی میں یہ بدنام بہت ہے  
 یہ رنج کہ کم ہے مئےِ گلِ جام بہت ہے  
 مجھ زندِ بلا نوش کو چپکا ہے یہے کا  
 ہو بادہ سر جوش ہی اس کی نہیں پروا  
 میں شوق سے لے لوں گا تو تلچھٹ بھی دے گا  
 کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورثا  
 ہے بول کہ مجھے دُرِ دہرِ جام بہت ہے

لے یہ غزل اس زمانہ میں لکھی گئی تھی جبکہ ظفر نے چلے جانے کا ارادہ کیا تھا جس کی رپورٹ رزیڈنٹ دہلی نے بھیجی تھی  
 مرزا غالب نے براہِ جانے کی خواہش اس مقطع میں ظاہر کی ہے  
 غالب گراں سفر میں مجھے ساتھ لے اٹھیں : جگ کا ثواب نذر کروں کا حضور کی

پنہاں نہیں اب دام گلستاں کی زمیں میں      خطہ ہی نہیں کوئی دل گوشہ گزیں میں  
چھتے نہیں اب غارِ عالمِ قلبِ خریں میں      نے تیر کہاں میں ہے نہ صیاکس میں<sup>۱</sup>  
گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

لاپس سے جو تکلیفِ عبادت کی اٹھائی      اس عابدِ ناداں نے عبث عمر گنوائی  
کیا فائدہ اعمال میں جب ہو نہ صفائی      کیا زہد کو مانوں وہ نہ ہو گوچرِ بیائی  
پادائشِ عمل کی طبعِ خام بہت ہے

آزادہ روی شیوہ بتاتے ہیں جو انساں      معلوم نہیں سمجھے ہیں کیا جی میں نہ ناداں  
آزاد تو ہو ہی نہیں سکتے کسی عنوان      ہیں اہلِ فرد کس روشِ خاصِ پنازاں  
پابستگی رسمِ ورہ عام بہت ہے

پینے میں لگے بادہِ گلغام کے دھبے      ان سے ضلّ آجائے نہ ارکان میں حج کے  
فرصت ہیں ذرا سیٹھ کے دھولوں نصیب      زہم ہی پر چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرمت ہے

آلودہ برے جائے احرام بہت ہے  
تردید نہ کی اس کی کمی میں نے کہا جو      مجھ پر وہ عنایت کی نظر رکھتے ہیں اب تو  
خیرت ہے یہ برتاؤ ہو اور وصل نہ پھر ہو      ہے قہر گرا ب بھی نہ بنے بات کہ ان کو

انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے  
میں یہ نہیں کہتا مجھے مرنا نہیں لے مرگ      بچ جاؤں تو کچھ حرج بھی تیرا نہیں لے مرگ<sup>۲</sup>  
حاشا کہ مجھے جان کی پروا نہیں لے مرگ      خوں ہو کے ٹکراؤ مجھ سے نہ پروا نہیں لے مرگ

رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے  
 کیا دل کش و دلچسپ ہیں مہرا کے ترانے      بخشی ہے عجب طبع رسا اس کو خدا نے  
 مانا ہے اسے راہِ نما سب شعرا نے      ہو گا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے  
 شاعر تو وہ اچھا ہے پر بدنام بہت ہے

۱۳۴

کیا کہیے کہ دل ہے پریشاں کئے ہوئے      آئینہ دار ہے مجھے حیراں کئے ہوئے  
 ہے انتظار آمدِ جاناں کئے ہوئے      مدت ہوئی ہے یا کر کو جہاں کئے ہوئے  
 جوشِ قدرج سے بزمِ چراغاں کئے ہوئے

دل کو تو چشمِ تر نے دیا اشکِ خوں میں کھو      کیا خاک مجھ سے کوئی نیا انتظام ہو  
 کر دوں گا پسینِ کش و ہی حاضر ہو گھر میں جو      کرتا ہوں جمع پھر جگرِ سختِ لخت کو  
 عرصہ ہوا ہے دعوتِ مہرگاں کئے ہوئے

مدت کے بعد جوشِ جنوں نے کیا کرم      تابِ سکون و صبر گئی دل سے یک قلم  
 وحشت کی روک تھام نہ کی سکیں گے ہم      پھر وضعِ احتیاط سے رکے لگا ہے دم  
 برسوں ہوئے ہیں چاک گرِ بہاں کئے ہوئے

سینے میں پھر وہ آگ بھڑکنے لگی کہ بس      پھر جل کے خاک ہو گا تین زارِ مثلِ خس  
 پھر ضبطِ آہ پر نہ رہا دل کو دسترس      پھر گرم ناہائے شر رہا رہے نفس

مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

کیا پوچھتے ہو کیا ہے غصہ بگاڑ عشق سرے سے ملے گا نہ اب تک ملا ہے عشق

دل کیا کر اب تو دپے جاں بر ملا ہر عشق پھر پریش جراتِ دل کو چلا ہر عشق

سامانِ صدر ہزار نمکدراں کئے ہوئے

پھر دل میں شوق دید سے ہر درد جا نگسل پھر اشکِ نواں بہاؤں کا آنکھوں سے متصل

دکھلاؤں گا و درنگ کہ مانی ہو منفعل پھر بھر رہا ہوں فائزہ تر گاں بخون دل

سازِ چمن طرازیِ داماں کئے ہوئے

پیش آ رہا ہے عشق میں اک واقعہ عجیب بیٹھے بٹھائے بھنس گئے آفت میں و غریب

کیا دو لہجے کہ دونوں میں چہرے جلتے غم قریب باہم و گر ہوئے ہیں لُ دیدہ پھر قریب

نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

وحشت میں ٹھہر رہی ہو تو رسوائیوں کی لے ذلت کے مرحلے کو کیا چاہتا ہے طے

کھل کھیلنے کے اب تو تقاضے ہیں بچے پے پھر دل طوافِ کوئے ملامت کو جاتے ہے

پنڈار کا صنم کردہ ویراں کئے ہوئے

پنچر ہے مریض عشق کو تیمار کی طلب پھر اس دل غمیں کو بے غم خوار کی طلب

الفن کو بھرے گرنی بازار کی طلب پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب

عقلمندی متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

ہے زنبوئے قل کا جو پیشِ نظر خیال گلشن میں جا کے مست ہو پھر لہرِ بہر خیال

گل گشت میں جا ہوا ہے پھر ادھر خیال      دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال  
صد گلستاں نگاہ کا سماں کئے ہوئے

سزا مہ اس کے خط کا ہے اس درجہ دل ربا      جس کے ہر ایک حرف پہ ہیں جانِ دل فدا  
مضمونِ شوق دیکھئے لاتا ہے رنگ کیا      پھر چاہتا ہوں نامہٴ دلدار کھولنا  
جان نذرِ دل فریبی عنوان کئے ہوئے

نسکین سیر باغ سے کیا ہوگی تم نفس      بے یار ہیں نظر میں گل تر بھی خارِ خس  
بے چین ہو رہا ہوں کہ دل پر نہیں بس      ملنگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس  
زلفِ سیاہ رخ پر پریشاں کئے ہوئے

بے وجہ تو نہیں ہوں میں آوارہ کو بکو      پھر تا ہوں تیغِ زن کے تجس میں چار سو  
بنغِ نگاہ کی ہے ان آنکھوں کو جستجو      چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو  
سرمہ سے تیز دشنہٴ مژگاں کئے ہوئے

مخوابِ چشمِ شوق نہیں روئے ہر و ماہ      اس گل کی بزمِ عیش کی دل دھونڈھتا راہ  
کب سامنے ہو دیکھئے ساقی کی جلوہ گاہ      اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ  
چہرہ فروغ سے گلستاں کئے ہوئے

تا چند انتظار کا دکھ جھیلے رہیں      کب تک رہیں چارہٴ احباب کے رہیں  
تا چند یوں جہادِ دلدار سے رہیں      پھر جی میں ہے کہ در پر کسی کے پڑے رہیں  
سر زمر بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

طاقت نہ وہ خیال میں باقی دابہ سن      وہ دن گئے کہ چین نہ بڑھتا تھا یار بن!  
 رہتے تھے اس کی یاد میں اور مل تھا مطمئن      جی ڈھونڈتا ہر پھر وہی فرصت کے رات دن  
 بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کے ہوئے  
 کیا سہل بات تھی کہ یہ سیلاب رک سکے      رو کا یہ جوش جس نے وہ مرزا ہمیں تو تھے  
 اب بھی ہیل پی آنکھوں میں کیا بھبھ ہوئے      غالب ہمیں نہ چھپر کہ پھر جوشِ اشک سے  
 بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفاں کے ہوئے

۱۳۵

جفاے یار تسلی ہے اک جہاں کے لئے      خیر خوشی کی ہے آزادی و اماں کے لئے  
 ہوئی ہے وجہ تسلی دلِ تپاں کے لئے      نویدِ امن ہے بیدارِ دوستِ جاں کے لئے  
 رہے نہ طرزِ رسم کوئی آسماں کے لئے  
 غذائے غم نہ دلِ بے قرار و غمخواروں ہے      جگر کی تاک میں وہ دیدہ پر افسوں ہے  
 پڑی وہ لوٹ کہ حالتِ مری دگر گو ہے      بلا سے گرمزہ یا رتشنہ خوں ہے  
 رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونچکاں کے لئے  
 خطا معاف رہے اتنا اس خلق لے خضر      تمہیں نہیں ہو ذرا بھی تو پاس خلق لے خضر  
 چھپے ہو تم یہ تمہیں ہے ہر اس خلق لے خضر      وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں شناس خلق لے خضر  
 دم کم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

یہاں تلک مے ملیں ہوئی ہے کثرتِ رشک      کرات بات سے ظاہر ہے اب علامتِ رشک  
کسی کو غیر کی راحت پر ہوگی عادتِ رشک      رہا بلا میں بھی میں مبتلائے الفتِ رشک  
بلائے جاں ہے اوتیری اک جہاں کے لئے

وہ کشتی کہ جو قاتل سے رات دن ہو قریں      انھیں کو اس سے جدا کر کہو مجھے تسکیں  
کبھی تو دور سے ہو آرایشِ انکی کہیں      فلکِ دور کہ اس سے مجھے کہیں ہی نہیں  
دراز دستی و قاتل کے امتحاں کے لئے

پڑا ہوا تو ہوں زنداں میں بستہ زنجیر      قہر نہ یہ تھا کہ کرتا نجبات کی تدبیر  
مگر مجھے تو یہ دھن ہے کہ گھر کروں تعمیر      مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ میرا اسیر  
کرے قفس میں فراہم خسِ اشیاں کے لئے

پڑا ہوا تھا میں دھونی اٹلا ستاں پر رماے      اہی آرزو میں کہ دربان کو ترس آجائے  
اسے بھی کوئی خصوصیت نہ تھی کہ مجھ کو اٹھائے      گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت لئے  
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پامباں کے لئے

۱۔ اس شعر کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں: اردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو ہی جاراؤر لکھیں گے۔ مولانا آزاد جو  
قائبِ طرز کو نام رکھتے تھے وہ بھی اس شعر کے انداز بیان پر روانہ تھے۔ آغازِ مقدمہ میں ایسی ہی اشعار کچھ یہ مارک کیا کہ  
اس کی ایک اور خوبی کی طرف اشارہ کیا جا تا ہے جو واقعہ قائب نے اس شعر میں بیان کیا ہے اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی  
ضروری تھی۔ ایک یہ کہ پاسبان نے قاتل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ دوسرے یہ کہ قاتل پاسبان سے چاہتا کیا تھا سو یہ دونوں  
باتیں بصورتِ بیان نہیں کی گئیں صرف کنیزیں ادا کی گئی ہیں مگر راحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فورا بھیجیں جاتی  
ہیں پہلی بات پر لفظ شامت اور دوسری پر قہر یہ صاف صاف دلالت کرتا ہے۔ اسے سوارِ روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور  
ایک وسیع خیال کو دیکھ کر اس کی خوبی سے ادراکِ نثر میں بھی اس طرح ادراکِ نثر کا مشکل ہے یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔



سُخ میں چاہیے کوئی جدید طرز عمل      کہ طبع تیز کا کچھ حوصلہ تو جائے نکل  
 نہ کیوں ہو صد تغزل میں رہ کتی بے کل      بقدر شوق نہیں ظرف تنگ سائے غزل  
 کچھ اور چاہیے وسعت مے بیاں کے لئے

ملا ہے جو طرب و عیش اس کو قسمت سے      بھلا وہ اس کے سوا ہے نصیب اور کس  
 مٹا دیا حسد و رشک کو بھی قدرت نے      دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے  
 بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

یہ ذکر خیر مے لب پر آگیا کس کا      بھرا سرور سے دل اور جگر ہوا ٹھنڈا  
 مجھے بیان پر اپنے ہے وجہ کیوں اتنا      زباں پر بارِ خدا یا یہ کس کا نام آیا  
 کہ میرے نطق نے بوسہ مری زباں کے لئے

اسی کی شان کے شبایاں پر شانِ شوکتِ ملک      اسی کے واسطے مغزوں پر جواہرِ حُشمتِ ملک  
 ہے ہمیشہ یوں ہی برقرار ثروت و ملک      نصیرِ ملت و دیں اور معینِ ملت و ملک  
 بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستان کے لئے

ہر اک بشر کے لئے عیش کی ہے افزائش      خدا کے فضل سے آیا ہے دورِ آسائش  
 جس طرح سے ہر شے کی ہو گی زیبائش      زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آسائش  
 نہیں گئے اور ستارے اب آسمان کے لئے

اکی تو مدح کی تمہید و ابتدا ہی ہے      نہ مدح نکھی گئی ہے نہ میں نے نکھی ہے  
 یہی کہاں مری طبع رسا نے بس کی ہے      ورقِ تمام ہوا اور مدح باقی ہے

سفینہ چاہئے اس بحریہ کراں کے لئے  
 عجیب ڈھنگ نکالا ہے مدح گوئی کا  
 غزل سی نہیں دکھایا ہے اس نے رنگ نیا  
 طبیعت اس کی ہے حدت پسند لے مرزا  
 ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا  
 صلائے عام پر یارانِ نکتہ واں کے لئے

(۱۳۶)

کم بے غیروں سے اگر ہو وفا اور سہی  
 کوئی برتاؤ مروت کا نیا اور سہی  
 میری ایذا سے جو دل خوش نہ ہوا اور سہی  
 میں ہوں مشتاقِ بجا ٹھہرے بجا اور سہی  
 تم ہو بیدار سے خوش اس سے سوا اور سہی  
 رات دن گریہ اور آٹھ پہر نالہ و آہ  
 سوگِ تم نے تو کچھ اس درجہ منایا کہ بہا  
 مرہی جلتے دو اگر مرہی گیا ہے گمراہ  
 بغیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غیرت ماہ  
 ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی

کبر و نخوت کی زبانے میں دہائی کیوں ہے  
 دل میں ناحق ہوسِ حامِ پکا کیوں ہے  
 خود نما کیوں ہو خودی سر میں بھائی کیوں ہے  
 تم ہو بت پھر تمہیں ہندو خدا کیوں ہے  
 تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی  
 یہ تو مانا کہ حسینوں کی نہیں کوئی کمی  
 آن بان ایسی کسی ہیں کبھی دیکھی نہ سنی  
 منہ حسینانِ ارم آکے ملائیں تو سہی  
 جس میں آپ سے بڑھ کر نہیں ہونی کبھی

حور کا شیوہ انداز و ادا اور سہی  
 کیا قیام اور قعود اور ہے سجدہ کیسا      سرمراجھک نہیں سکتا ہے تیرے در کے سوا  
 تھا جو بے چین تو ہر پھر کے ادھر ہی پہونچا      تیرے کوپے کا ہے مائل دل مضطرب  
 کعبہ اک اور سہی قبلہ نما اور سہی  
 کیا انوکھا چین غلدریں ہے واعظ      باغ دیکھے ہی نہیں تو نے یقین ہے واعظ  
 تیری باتوں کا ٹھکانہ بھی کہیں ہے واعظ      کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ  
 غلہ بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی  
 یاں تو دل کھول کے ارمان نکالیں یارب      تنگی دہر کی کچھ داد تو پالیں یارب  
 سیر کا لطف تو جی بھر کے اٹھالیں یارب      کیوں نہ فردوس میں دوزخ بھی ملا لیں یارب  
 سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی  
 کر دیا ہے غم بھراں نے مرا حال زبول      بڑھتے بڑھتے خنقاں پہنچا ہے نوبت بربزوں  
 دیر مرنے میں لگے لگی جو کھلائی افیوں      مجھ کو وہ دو کب سے کھا کے نہ پانی مانگوں  
 زہر کچھ اور سہی آپ بخت اور سہی  
 طبع دیوان سے جو غالب نے فراغت پائی      یار و احباب نے مرزا نی آفت ڈھائی  
 کی غزل نظم تو یوں لب پر نکالتی آئی      مجھ سے غالب یہ علانی نے غزل لکھوائی  
 ایک سیراد گیر رنج فزا اور سہی

۱۔ غزل نمبر ۱۳۴۔ دیوان مطلوبہ میں نہیں ہے اردوئے معلیٰ حصہ اول رقعہ موسومہ نواب امین الدین احمد خان صاحب

شکوہ در دلی اک گونہ خطا ہے تو سہی      نالہ و آہ سے اظہارِ جفا ہے تو سہی  
صبرِ پی آف بھی منافیِ رضا ہے تو سہی      آپ نے مستحقِ الضو کہا ہے تو سہی

یہ بھی یا حضرت ایوب گلا ہے تو سہی  
ہم نشینوں کو ہے کیا میری مصیبت کی خبر      کرتے ہیں صبر کی نقلین مجھے آٹھ پہر  
دل ہی تو ہے مرے سینے میں نہ کوئی بہتھر      رنج طاقت سے سوا ہو تو نہ بیٹوں کیونکر  
ذہن میں خوبی تسلیم و رضا ہے تو سہی

اُس باقی ہے تو برسوں ہیں بہلائے گی عمر      سبز باغِ آٹھ پہر فکر میں دکھلائے گی عمر  
داد ملنے کے لئے گویا نہی تڑپائے گی عمر      ہے غنیمت کہ بے امید گزر جائے گی عمر  
نہ ملے داد مگر روزِ جزا ہے تو سہی

کس کا چارہ فقط الزام سے ہوتے ہیں بری      کون اٹھاتا ہے مریضوں کے لئے دردِ مری  
منہ نہ کھلواؤ کہ احباب کی ہے پرہ درمی      دوست ہی کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری

نہ سہی ایک تمنا ہے دوا ہے تو سہی  
ہم سے بڑنا ہے جو کچھ اسی قابلِ ہم تھے      کہتے بد عہد و جفا کار اسے کس منہ سے  
بے فروت ہے وہ کیونکر کوئی انصاف کرے      غیر سے دیکھئے کیا خوب نباہی اس نے  
نہ سہی ہم سے پر اس بت میں وفا ہے تو سہی

گو کہ واقف نہیں تقدیر کے احوال سے ہیں      خطِ قسمت نہیں پڑھ سکتا کسی حال سے ہیں  
یوں لگتا ہوں پتہ اپنے ہی افعال سے ہیں      نقل کرتا ہوں اسے نامہ اعمال سے ہیں  
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی  
جس طرح صبر سے مزار نے گزاری غالب      زندگی کا تو اسی طرح سے تم بھی غالب  
جان دیتے ہی کسی روز بنے گی غالب      کبھی چل جائے گی کیوں کرتے ہو جلدی غالب  
شہرہ تیزی شمشیرِ قضا ہے تو سہی

## قطعاتِ تاریخِ تکمیلِ اراقِ ہذا

کی شرحِ نظمِ غالبِ تضمین میں جو مزار      ظاہر ہوئے معافی حل ہو گئے مطالب  
جی میں خیال آیا تاریخ اس کی لکھے      بولا سروشِ غیبی روحِ کلامِ غالب

نوٹ: ۱۔ یہ غزل ۱۳۷۱ء نواب احمد سعید خاں صاحبِ طالب رئیسِ دہلی کا عطیہ ہے فرمانے تھے کہ میں ہر وقت  
پچھو جان (غالب) کی خدمت میں حاضر باش تھا نیا کلام اپنی یادداشت میں لکھتا تھا اور مجلسِ یہ غزل ہے۔

تمام شد

ضمیمہ

## تفہیم بر غزل فارسی مولانا جامیؒ

کیا شوق زیارت نے پریشان یارِ رسول اللہ      ہوا رسول در جد سے سخت حیراں یارِ رسول اللہ  
خدا کی واسطے کچھ کیجئے دعاں یارِ رسول اللہ      تنم فرسودہ جاں بآراں و بجاں یارِ رسول اللہ

و لم پردرد آوارہ ز عصیاں یارِ رسول اللہ  
نہ دلیں صبر کی طاقت نہ جانیں ہر شکیبائی      نہیں اب بارِ وقت کے اٹھانیکی توانائی  
دکھاؤ شکلِ نورانی بناؤ مجھ کو سودائی      شب و روز از شکیبائی ز حد گشتم تمنائی  
بخلوت سوئے من آئی خراماں یارِ رسول اللہ

ہوئے قدرت سے چاروں یارِ رسول آپ کے ہمد      محبت کے تھے چاروں حرف گویا متصل باہم  
خدا نے انکو اسرارِ نبوت کا کہا محرم      بصدقیت خریدارم عمرادوست میدارم  
بعثمان و علی آرم فدا جاں یارِ رسول اللہ

نہیں اس وقت بد میں کوئی میرا نموش ہمد      سہا ہے تمہاری ذات کا یا سرورِ عالم  
ندامت کے موردِ احتیادِ ناکارہ میں بہیم      ز کردہ خوش حیرانم سیر شد زورِ عصیانم  
پیشمانم پیشمانم پیشیاں یارِ رسول اللہ

غمِ وقت میں برسوں کی بے انکسوس گہری ساری      متاعِ مال و زر تھی جس قدر بربادی ساری  
 نہیں کچھ پاس قربیٰ کر نیکی پہ سخت لاپاری      چہ سوئے من گزرائی من مسکین زنداداری  
 نثار نقشِ نعینت کم جاں یار رسول اللہ

چلا سوئے عدم مرزا نہایت بے سرو سامان      نہیں ہر ساتھ تو شہِ آخرت کا کچھ بجز عصیان  
 ہے اتنی عرض یا مولامری جاں تمہی ہو قرباں      چوں بازوئے شفاعت را کشائی برگزیناں  
 مکن محروم جانی را دران آں یار رسول اللہ

## تضمین بر غزل مولانا منشی حسین صاحب سورتی

دکھاؤ بتورئے عالم آرا یا رسول اللہ      بنا لو اپنا دیوانہ خدا را یا رسول اللہ  
 عنایت کی نظر میں ہوں تمہارا یا رسول اللہ      ہمیں ہے ذات اقدس کا سہارا یا رسول اللہ  
 تمہارے بن نہیں کوئی ہمارا یا رسول اللہ

گہیں جلدی نقاب پر نچ پر نور سے الٹو      کسی خواب میں اگر ہی مجھ کو شرف بخشو  
 نہایت مضطرب شوقِ زیارت نے کیا مجھ کو      کہوں میں تم سے کیا تم مرم راز الہی ہو  
 تمہیں معلوم ہی احوال سارا یا رسول اللہ

قرب سایہ نکر دی ہے توحید خدا ثابت تمہاری شان کی ہوتی ہو شانِ کبریا ثابت  
اشاروں میں ہی دعائے نبوت کو کیا ثابت مجھے شوقِ اتم کے مجھ سے ہو گیا ثابت

بلندی پر تمہارا ہے ستارا یا رسول اللہ

تمہارا ذکر جاری بڑیا پیر میری صبح و شام یہ ہے وہ درجہ جس سے درجے میں غم و آلام  
تمہارے نام ہے دلوں کو راحت جاں کو آرام لیا کیجئے نہ کیونکر بیٹھتے اٹھتے تمہارا نام

تمہارا نام لگتا ہے پیارا یا رسول اللہ

بھروسہ ہے تمہارا خواجہ ہر دوسرا ہم کو قیامت میں گناہوں کا نہیں کٹکا ذرا ہم کو  
شفاعت کر کے بیشک آپ لینگے بخشوا ہم کو اگر یہ کیسے ہی عاصی ہیں بخشے گا خط ہم کو

ذرا بھی کیجئے گا گراشا یا رسول اللہ

زیارت نہ نہ روضہ کی مشرف ہو گا یہ جنت تک نہیں ممکن بنے ملنا اس خیف و زار کا جنت تک  
گزارے جس طرح گزری پریشانی سہاں ایتک دینے میں مجھے پاس اپنے اب بلوائے جنت تک

پھروں گا بند میں میں مارا مارا یا رسول اللہ

بھلائی پر نہ بھلو نفس نے ہونے دیا قادر بدی میں ہو گیا یکتا نکوئی میں رہا قاصر  
طلبِ گارِ حمایت اب ہوا سرکار میں حاضر کرو اسوقت بد میں دستگیری تم کریں آخر

جرا ہوں یا بھلا ہوں ہوں تمہارا یا رسول اللہ



ہے گستاخی سراسر شکوہ سوزِ نہاں کرنا      ادب کے برخلاف آہ و بکا شور و فغاں کرنا  
فصول ایک ہے اظہارِ بے تابی جانی کرنا      عیب ہے تم کو اب ہر وقت دردِ لبیاں کرنا

غم پہناں ہے تم پر آشکارا یا رسول اللہ  
بہمیشہ ذاتِ اقدس کا بارِ سر پر سے سایہ      قیصلی کی کبھی گریں بحوم غم سے گھبرایا  
جہاں نیم جاں پہنچا تمہیں موجود وہاں پایا      تصدق آپ کے الطاف کے لبیک فرمایا

کبھی گر روزِ غم میں نے پکارا یا رسول اللہ  
زیارت کی محال اگر جذبِ لب ہی کوئی راہ      کسی دن اگر ہوائے شوق اڑائے چل بھونکا گاہ  
میں اوریوں نثرِ عالم کے دسے و رہوں لے آہ      مجھے اور حکم بود و باش ملک ہند یا اللہ

میں اوریوں زیرِ فرمان نصارا یا رسول اللہ  
نہیں ہے آپ کے مہرا میں باقی طاقت جہاں      قرون پر دمدم اس پر نجومِ حسرت و اراں  
مدین میں بلا لویا نبی اتنا کرو احساں      دیارِ ہند ہے کیونکر گئے اسمیں دل سوزاں

مدینہ ہے نہ مکہ نہ بحار یا رسول اللہ

## تضمین بر سلام میر وحید صاحب مرقوم لکھنوی

نام ہو جس کا علی نام خدا ایسا تو ہو      ہو جسے معراج دوشِ مصطفیٰ ایسا تو ہو  
نام ہو جس کی نصیری ہیں خدا ایسا تو ہو      خلق کے بیڑے کا حامی نا خدا ایسا تو ہو

جس پہ دھوکا ہو خدا کا نا خدا ایسا تو ہو

عاشقِ نام خدا اہلِ سخا ایسا تو ہو      ہو گئے جس کے لپسِ حرق پر خدا ایسا تو ہو  
جو کرے یوں بندگی حق کی ادا ایسا تو ہو      گھر ٹٹا یا شاہ نے وعدہ وفا ایسا تو ہو

دے دیا سجدہ میں سر عشقِ خدا ایسا تو ہو

جسم بھی ہو ہرے تھاق نے بنایا آپ کا      سایہ کی جا پڑتی تھی جسمِ منور سے ضیا  
درحقیقت نور حق تھا سر سے لے کر تا پٹا      واہ رے یکتائی احمد کہ سایہ بھی نہ تھا

ہو نہ جس کا مثل محبوبِ خدا ایسا تو ہو

یوں تو دنیا میں ہوئے پیدا ہزاروں ابنیا      پر ہوا اب تک نہ پھر ہوگا نظیرِ مصطفیٰ  
نپ کو صانع نے بیشک ایک ہی پیدا کیا      واہ رے یکتائی احمد کہ سایہ بھی نہ تھا

ہو نہ جس کا مثل محبوبِ خدا ایسا تو ہو

دوستوں کی داد کیا اور دوستوں کی کیا پسند کیا کہا ہم نے اگر دوس پانچ کو آیا پسند  
 بات ہے وہ واقعی جسکو کرے دنیا پسند غل طرفار و کا مجلس میں ہیں ہر ناپسند  
 خود دشمن بھی ہو باتوں میں مزا ایسا تو ہو

میرے مولا ہیں علی مرتضیٰ شیر خدا جنگے در سے ہوتی ہر شاہوکی بھی حاجت روا  
 دو جہاں میں آپ ہیں ہر ایک کے مشکل کشا ہوں در حیدر کا سائل خربے مجھ کو بجا  
 شاہ جس کی آرزو رکھیں گدا ایسا تو ہو

اہل دولت سے کہوں کیا اپنے دل کا مدعا توبہ توبہ ان سے کیا ہوگی مری حاجت روا  
 دل غنی پر گرچہ میں ہوں ایک فقیر ہے نوا ہوں در حیدر کا سائل خربے مجھ کو بجا  
 شاہ جس کی آرزو رکھیں گدا ایسا تو ہو

بر صدا پر میری ہو کہوں کر نہ شور مچا جانتے ہو کون ہوں و کس کا ہوں محتبرا  
 لیں نہ کیونکر اہل دنیا جھکو آنکھوں پر بٹھا ہوں در حیدر کا سائل خربے مجھ کو بجا  
 شاہ جس کی آرزو رکھیں گدا ایسا تو ہو

نا حبسوی کہ ہمیشہ چاہیے انسان کو تنگ صبر وہ پیدا کرے جس سے ہوں خاص غامدنگ  
 آفت نکلے منہ سے گوہیں کو بھی ہو طے تنگ وہیں ڈالے گوزمانہ پر چھوڑے اپنا رنگ  
 بردباری میں بشر مثل حنا ایسا تو ہو

نہ اند شاہ کا صبر و تحمل وقت جنگ      شکر ہی نکلا زبان سے جب کیا اٹلے تنگ  
ناہ فرماتے قہرے صبری سے ہر انسان کو تنگ      پیس ڈالے گوزمانہ پر نہ چھوڑے اپنا رنگ

بردباری میں بشر مثلِ حنا یا تو ہو

رفی وہ ہے کہ جسکی شان میں یا ہل آئی      علم کا ہر جسکے دروازہ علیؑ باجھا  
بکے اشباع ہونکی شاہدِ حدیثِ آفتا      شیرِ حق دستِ خدا میرِ عربِ مشکِ کشتا

یہ لقب جسکے ہوں خویش مصطفیٰ ایسا تو ہو

پشمِ الفت سے جو ڈالی اک نظرِ شبیر نے      کر دیا اسرارِ حق سے باخبرِ شبیر نے  
پو بتا پکڑ نہ ہوتا ہاتھ اگر شبیر نے      جاچکا تھا خر سوئے دوزخ مگر شبیر نے

راہِ جنت کی بتا دی رہنما یا تو ہو

مشکلِ آسان جب کے نام سے ہو بالیقین      اسکو کیا مشکل رہے جسکے علیؑ ہوں خود معین  
و دشمنوں کی مشکلیں بھی آپ نے آسان کیں      پیشِ حیدرؑ کے رہ جائے گرہ ممکن نہیں

دستِ قاتل کھول دے مشکِ کشتا ایسا تو ہو

ٹھہرے مشکل جب علیؑ کا دین نظر ممکن نہیں      کھل نہ جائے عقدہ پیچیدہ یہ ممکن نہیں  
واں کریں مشکِ کشتا جس جگہ ممکن نہیں      پیشِ حیدرؑ کے رہ جائے گرہ ممکن نہیں

دستِ قاتل کھول دے مشکِ کشتا ایسا تو ہو

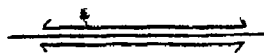
رن میں سرکھواتے تو جا بکے جب خوشی تبار کہتے تھے حضرت کہ تیرے شکر ہے پروردگار  
پاچکے جس دم شہادت خود امام باوقار بیڑیاں عابزے نہیں تاہو امت رسنگار

خلق میں پابندِ تسلیم و رضا ایسا تو ہو

دکھنے کو چرخ و تباب و حیدزار کو سب یہ اے مرزا گوارا ہے و حیدزار کو

اپنے مٹ جانیکا کیا غم ہے و حیدزار کو پس اے گردوں جو پیسا ہے و حیدزار کو

چشم بدین میں نہ کھٹکے سرمہ سا ایسا تو ہو



# ”روح کلام غالب“

اور دیگر ادبی، مذہبی، درسی غرض ہر قسم کی کتابیں  
مناسب قیمت پر

## طلب فرمائیں

تاجر حضرات کو معقول رعایت دی جائیگی

ملنے کا پتہ

## نشریات ادب ایکڈمی

بازار نخاسہ سہارنپور یوپی

بین الاقوامی ادب کا ترجمان

نذہبی ادبی اور معلوماتی جریدہ

ماہنامہ ”دیرو حرم“ سہا نیو

ہر ماہ اپنے قارئین کو نکھراستھا ادب مثلاً معیاری افسانے، مقالے  
فیچر اور بیہودہ نظریں پیش کرتا ہے اور پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا ہے

آپ بھی مطالعہ فرمائیں

قیمت سالانہ چھ روپے : ایک کلپی ساٹھ پیسے

نمونے کیلئے نشر پیسے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کرنے ضروری ہیں۔

ترسیل زر کا پتہ

منیجر ماہنامہ ”دیرو حرم“ بازار نخاسہ سہارنپور، یوپی

